AUGUST 2011

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

کہنی سُنی — مدیرہ — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 21

آپ سے کیا پردہ

رباعی سے رکابی تک — انشائیہ — 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 275

مجھ سے ملیے

عروسہ صدیقی — شاہین رشید — 27

انٹرویو

ناہید انصاری — شاہین رشید — 31

ناول

چراغ آخر شب — رفعت ناہید — 36
میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ — 240

مکمل ناول

مصحف — نمرہ احمد — 156
دریچہ تو کھولیے — نایاب جیلانی — 76

ناولٹ

سفال گر — بشریٰ سعید — 210

افسانے

بلا عنوان — نجمہ ثاقب — 60
سر پھرے — حیا بخاری — 66
بھرم — شاہدہ ملک — 153
دکھ کا جہنم — طور سینا — 150
یاد دہانی — مریم فردوس — 234

نظمیں غزلیں

غزل — ناصر زیدی — 270
غزل — شان الحق حقی — 270
نظم — احفاظ الرحمٰن — 271
غزل — ام ثمامہ — 271

زرنگار پھول

زرنگار سلسلہ — شگفتہ جاہ — 272
خبریں وبریں — غزل ثوبان — 280
روشن حرف — شفق چودھری — 278

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 276

پکوان

رمضان کے پکوان — خالدہ جیلانی — 282

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 287

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 289

اگست 2011
جلد 39 شمارہ 4
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

14 - اگست 1947ء اور ستائیس رمضان المبارک کی بابرکت رات - دُنیا کے نقشہ پر ایک ملک اُبھر۔ برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی نصیب ہوئی - انہوں نے انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے تعصب اور تنگ نظری سے نجات پائی۔

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک نعمت تھا۔ جسے پوری دُنیا کے سامنے مثال بننا تھا۔ ایک زرعی ملک جو معدنیات، تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال تھا لیکن ہم نے اس نعمت کی قدر نہیں کی اور آدھا حصہ گنوا بیٹھے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کے مرتکب ہوئے اور آج تمام تر وسائل کے ہوتے ہوئے بھی بدحالی کا شکار ہیں۔

ایک بار پھر اگست کا مہینہ ہے اور رمضان المبارک ہم پر سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر پاکستان کی سلامتی اور خوش حالی کے لیے دُعا کریں۔ یہ ہمارے لیے واحد گوشۂ عافیت اور جائے پناہ ہے۔

قارئین کو ہماری جانب سے جشنِ آزادی مبارک۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطنِ پاک کو رہتی دُنیا تک سلامت رکھے۔ آمین۔

خوش خبری،

فرحت اشتیاق ہمارے قارئین کی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ محبت کے جذبوں کو جس پاکیزگی اور خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں وہ فرحت کا ہی حصہ ہے۔ وہ اپنے حساس اور منفرد انداز تحریر سے قارئین کے دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ طویل غیر حاضری کے بعد آپ کے لیے وقت نکال کر فرحت اشتیاق نے ناول لکھا ہے۔ جو ستمبر کے شمارے عید نمبر میں شامل ہوگا۔

یہ ہماری طرف سے قارئین کے لیے عید کا تحفہ ہے۔

عید سروے،

ستمبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ عید نمبر میں عید سے متعلق تحریریں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہوں گے۔ قارئین کی شرکت کے لیے عید سروے بھی شامل ہوگا۔

سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1 - عید کے لوازم میں نئے کپڑے، جوتے، چوڑیاں، مہندی، گھر کی آرائش، عمدہ پکوان شامل ہیں۔ آپ عید کی تیاری اور شاپنگ میں سب سے زیادہ اہمیت کس چیز کو دیتی ہیں۔

2 - آپ کا عید کا دن کیسے گزرتا ہے؟ اگر اپنی مرضی سے گزارنے کا موقع دیا جائے تو کیسے گزاریں گی؟

3 - ہر گھر میں ایک خاص ڈش ہوتی ہے۔ اسے نہ صرف گھر والے فرمائش کرکے بنواتے ہیں بلکہ آنے والے مہمان بھی خوش ہو کر کھاتے ہیں۔ ایسی کوئی خاص ڈش آپ کے ہاں بنتی ہے تو اس کی ترکیب لکھیں۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 - اگست تک موصول ہو جائیں۔ ساتھ اپنی ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔ لیکن تصویر لازمی نہیں ہے۔

محمود خاور کی برسی،

کچھ لوگ دُنیا میں محبتیں بانٹنے اور سمیٹنے کے لیے آتے ہیں۔ محمود خاور ایسی ہی ہستی تھے۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول، سب سے محبت کرنے والے، سب کا احترام کرنے والے۔ ایسے لوگ دُنیا سے چلے بھی جائیں تو ان کی یادیں، ان کے کام انہیں زندہ رکھتے ہیں۔

20 - اگست کو محمود خاور کی برسی کے موقع پر آپ سب سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کا بیان

حضرت ابو سلمہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں سوال کیا تو اُم المومنینؓ نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تھے، حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب تو آپ روزے ہی رکھتے جائیں گے۔ اور روزے چھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب تو آپ نے روزے چھوڑ ہی دیے ہیں۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ آپ چند دن کے سوا ماہ شعبان کے (سارے) روزے رکھ لیتے تھے۔"

فوائد

1- نفلی روزے مسلسل رکھنا بھی جائز ہے، جبکہ ہر روزہ افطار کیا جائے، یعنی وصال نہ کیا جائے، کیونکہ وہ ہمارے لیے ممنوع ہے۔

2- نفلی روزے سال کے ہر مہینے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

3- مسلسل ایک مہینہ نفلی روزے رکھنا خلاف سنت ہے۔

4- ماہ شعبان میں نفلی روزوں کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔

5- حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلسل) روزے رکھتے تھے، حتیٰ کہ ہم کہتے، آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور افطار کرتے حتیٰ کہ ہم کہتے، آپ روزے نہیں رکھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے

مدینہ تشریف لائے، آپ نے رمضان کے سوا کبھی مسلسل ایک مہینہ روزے نہیں رکھے۔

6۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤد علیہ السلام والا روزہ ہے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑتے تھے اور اللہ کو سب سے زیادہ جو نماز پسند ہے وہ داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات تک سوتے اور تہائی رات میں نماز پڑھتے اور رات کا چھٹا حصہ سوئے رہتے۔"

فوائد

1۔ نفلی عبادات کی مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے۔ آدمی چاہے تو زیادہ نوافل ادا کرے، چاہے کم رکعتیں پڑھ لے۔ اس طرح چاہے زیادہ روزے رکھے، چاہے کم رکھے، البتہ ان امور سے اجتناب کرے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

2۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے انداز پر نفلی روزے رکھنا سب سے افضل ہے۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفلی روزے رکھنے سے ثواب کم ہو جائے گا۔

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام والے روزے اس لیے افضل ہیں کہ اس طریقے سے انسان کو جسم کا، اہل و عیال کا اور دوسرے لوگوں کا وہ حق ادا کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے، جو ہمیشہ روزے رکھنے کی صورت میں ادا نہیں کیا جاسکتا اور اللہ کی عبادت کرکے ثواب بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ دائمی عمل بھی بن جاتا ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے۔

4۔ نماز تہجد رات کے کسی بھی حصے میں ادا کی جاسکتی ہے، تاہم مذکورہ بالا صورت افضل ہے کیونکہ اس میں بھی جسم کے حق اور اللہ کے حق کا ایک خوب صورت توازن موجود ہے۔

5۔ داؤد علیہ السلام والی نماز کی صورت یہ ہے، مثلاً" ایک رات بارہ گھنٹے کی ہو تو اس میں چھ گھنٹے آرام کیا جائے، پھر اٹھ کر چار گھنٹے نماز تہجد اور عبادت میں گزارے جائیں، پھر دو گھنٹے تک آرام کر لیا جائے۔

شوال کے چھ روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے عیدالفطر کے بعد چھ روزے رکھے اس کے پورے سال کے روزے ہو گئے۔ جو شخص نیکی کرے اس کے لیے اس کا دس گنا ثواب ہے۔"

روزہ رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یوں تو بنی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے، سوائے روزے کے، کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ (گناہوں سے) سپر (ڈھال) ہے پھر جب کسی کا روزہ ہو تو اس دن گالیاں نہ بکے اور آواز بلند نہ کرے پھر اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کو آئے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔ اس قسم ہے اس پروردگار کی کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جان اس کے ہاتھ میں ہے کہ بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے آگے قیامت کے دن مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اپنے افطار سے خوش ہوتا ہے اور دوسرا وہ اس وقت خوش ہو گا جب وہ اپنے روزے کے سبب اپنے پروردگار سے ملے گا۔"

ماہِ رمضان کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھل

جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں کس (باندھ) دیے جاتے ہیں۔"

ماہ رمضان سے پہلے ایک دو روزے نہ رکھو

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"رمضان سے پیشگی ایک دو روزے مت رکھو، سوائے اس شخص کے جو ہمیشہ ایک مقررہ دن میں روزہ رکھتا ہو اور وہی دن آ جائے تو وہ اپنے مقررہ دن میں روزہ رکھ لے۔ (مثلاً" جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا تھا اور انتیس اور تیس تاریخ میں شعبان کے وہی دن آ گئے تو وہ روزہ رکھ لے)۔"

روزہ چاند دیکھنے پر ہے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چاند کا ذکر فرمایا اور فرمایا۔

"جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم اس کو دیکھو، تب ہی افطار کرو پھر اگر بادل آجائیں تو تیس روزے پورے رکھو (اس کے بعد عید کرو)۔"

بے شک اللہ نے اسے لمبا کر دیا ہے

"سیدنا ابو البختری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عمرہ کو نکلے اور جب (مقام) نخلہ کے درمیان میں پہنچے تو سب نے چاند دیکھنا شروع کر دیا اور بعضوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ تین رات کا چاند ہے (یعنی بڑا ہونے کی وجہ سے) اور بعضوں نے کہا کہ دو رات کا ہے پھر ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے اور ان سے ذکر کیا کہ ہم نے چاند کو دیکھا اور کسی نے کہا کہ تین رات کا ہے اور کسی نے کہا، دو رات کا ہے، تب انہوں نے پوچھا کہ تم نے کون سی رات میں دیکھا؟ تو ہم نے کہا کہ فلاں فلاں رات میں انہوں نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے کے لیے بڑھا دیا اور وہ اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا۔"

ہر شہر (ملک) کے لیے ان لوگوں کی رویت

کریب کہتے ہیں کہ سیدہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے انہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس (ملک) شام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ میں شام گیا اور ان کا کام کر دیا اور میں نے جمعہ (یعنی پنجشنبہ) کی شب کو رمضان کا چاند دیکھا پھر مہینے کے آخر میں مدینہ آیا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا اور چاند کا ذکر کیا کہ تم نے کب دیکھا؟ میں نے کہا کہ جمعہ کی شب کو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے خود دیکھا؟ میں نے کہا، ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا، سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور لوگوں نے بھی۔ تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہم نے تو ہفتہ کی شب کو دیکھا اور ہم پورے تیس روزے رکھیں گے یا چاند دیکھ لیں گے تو میں نے کہا کہ آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (چاند) دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسا ہی حکم کیا ہے اور یحییٰ بن یحییٰ کو شک ہے کہ حدیث میں "نکتفی" کا لفظ ہے یا "تکتفی" کا۔

عید کے مہینے (اجر و ثواب کے اعتبار سے)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "عیدوں کے دو ماہ ناقص نہیں ہوتے۔ ایک رمضان شریف اور دوسرا ذی الحجہ۔

روزہ کے لیے سحری کا بیان

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا۔
"سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔"

سحری میں تاخیر کا بیان

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ سحری کی پھر صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں (راوی) نے کہا کہ (سحری اور نماز) دونوں کے درمیان کتنی دیر ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ پچاس آیات کے موافق۔ (سحری سے فراغت اور نماز کی تکبیر کے درمیان تقریباً" دس منٹ کا فاصلہ تھا۔)

اللہ تعالیٰ کے اس قول حتی یتبین لکم...... کے بارے میں

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ:
"کھاؤ اور پیو' یہاں تک کہ سفید دھاگہ نمودار ہوجائے۔"
تو آدمی جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتا تو دو دھاگے اپنے پیر میں باندھ لیتا۔ ایک سفید اور دوسرا سیاہ اور کھاتا پیتا رہتا یہاں تک کہ اس کو دیکھنے میں کالے اور سفید کا فرق معلوم ہونے لگتا' تب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد "فجر سے" کا لفظ اتارا' تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے۔

بے شک بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رات کو اذان دیتے ہیں' پس تم کھاؤ اور پیو

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے دو مؤذن تھے۔ ایک سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ نابینا تھے تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا۔
"بلال رات کو اذان دیتے ہیں' پس تم کھاتے پیتے رہو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔"

سورج غروب ہوجائے تو روزہ افطار کرلو

سیدنا عبداللہ بن ابی ـــ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ رمضان کے مہینے میں سفر میں تھے پھر جب آفتاب غروب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا۔
"اے فلاں! اترو اور ہمارے لیے ستو گھول دو۔"
انہوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم! ابھی آپ پر دن ہے۔" (یعنی ان صحابی کو یہ خیال ہوا کہ جب غروب کے بعد جو سرخی ہے' وہ جاتی ہے جب رات آتی ہے' حالانکہ یہ غلط ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پھر فرمایا۔
"اترو (یعنی اونٹ پر سے) اور ہمارے لیے ستو گھولو۔"
پھر وہ اترے اور ستو گھول کر آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے پاس لائے اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے نوش فرمایا اور پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔
"جب سورج اس طرف غروب ہوجائے (یعنی مغرب میں) اور اس طرف (یعنی مشرق سے) رات آجائے تو پس روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔"

افطاری جلدی کرنے کا بیان

ابوعطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں اور مسروق "ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور مسروق نے ان سے کہا کہ۔
"اے مسلمانوں کی ماں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اصحاب میں سے دو شخص ایسے ہیں کہ ایک تو اول وقت افطار کرتے ہیں اور اول وقت ہی نماز پڑھتے ہیں اور دوسرے افطار اور نماز میں دیر کرتے ہیں۔"
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ "وہ کون ہیں جو اول افطار کرتے ہیں اور اول وقت نماز پڑھتے ہیں۔"
تو ہم نے کہا کہ "وہ عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ ہیں۔"
تو انہوں نے کہا۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔"

سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ رمضان کی سولہ تاریخ کو جہاد کیا تو کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی افطار کرنے (بے روزہ دار) تھا اور جو روزہ دار افطار کرنے والے پر عیب نہ کرتا تھا اور نہ افطار کرنے والا روزہ دار پر۔

اس افطار کرنے والے کے اجر کا بیان جو سفر میں کام کرے

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ سفر میں تھے پس کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی بے روزہ دار۔ اور سخت گرمی کے وقت ایک منزل میں اترے اور سب سے زیادہ سائے میں وہ تھا جس کے پاس چادر تھی اور کتنے تو ایسے تھے کہ ہاتھ ہی سے دھوپ روکے ہوئے تھے اور روزہ دار جتنے تھے' سب منزل پر جاکر پڑے رہے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے کھڑے ہوکر خیمے لگائے اور اونٹوں کو پانی پلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا۔ "افطار کرنے والے آج بہت سا ثواب لے گئے۔"

میت کے روزے کی قضا

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ و سلم نے فرمایا کہ جو شخص مرجائے اور اس پر روزے (کی قضا) ہو تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھے۔

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا میں نے ایک لونڈی خیرات میں اپنی ماں کو دی تھی اور میری ماں مرگئیں۔
آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا۔
"کہ تیرا ثواب ہوگیا اور پھر وہ لونڈی میراث کی وجہ سے تیرے پاس آگئی۔"
اس نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم میری ماں پر ایک ماہ کے روزے (قضا) تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟"
آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا "ہاں اس کی طرف سے روزے رکھو۔"
اس نے عرض کیا کہ "میری ماں نے حج نہیں کیا تھا۔"
تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا کہ "اس کی طرف سے حج بھی کرو۔"

نماز عید میں کیا پڑھیں

عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اضحیٰ اور فطر میں کیا پڑھتے تھے؟" انہوں نے کہا کہ "آپ صلی اللہ علیہ و سلم ان میں ق والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ وانشق القمر پڑھتے تھے۔" (مسلم)



رباعی سے رکابی تک

انشاجی

کیا مرد واقعی سست اور بے سلیقہ ہوتے ہیں؟ ہمارے اس سے اختلاف یا اتفاق رائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عمومی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے ایک کارٹون دیکھا۔ میاں نے لمبے ڈنڈے والے جھاڑو سے فرشوں کی صفائی کرنے کے بعد باورچی خانے میں بہت سی پلیٹیں دھولی ہیں۔ لیکن ابھی کچھ باقی بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں میاں نے کچھ زیادہ دیر لگادی ہے۔ کیونکہ بی بی پہلے اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو سنتی رہیں پھر ڈرائنگ روم میں رسالوں میں تصویریں دیکھتی رہیں۔ آخر اس سے بھی اکتا گئیں۔ کارٹون میں وہ میاں سے کہہ رہی ہیں۔

"ذرا جلدی کام کیا کرو جی! میرا بھی کچھ خیال ہے؟ کتنی دیر سے اکیلی بیٹھی بور ہورہی ہوں۔"

✡ ✡ ✡

یہ مسئلہ بہت سے گھروں کا ہے۔ مرد لوگ گھر کی صفائی، چائے بنانے، برتن دھونے وغیرہ میں اتنی دیر لگادیتے ہیں کہ بیویاں عاجز آجاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ بیوی بستر میں پڑی ہیں، میاں چائے دانی بھر کر ان کے بستر کے پاس کی میز پر رکھ تو گئے لیکن پھر جاکر فرش رگڑنے لگے یا ناشتہ بنانے لگے۔ اتنا خیال نہیں کہ چائے بنا کر بھی دینی ہے۔ ادھر بیوی ایک ہاتھ سے اخبار تھامے اسے پڑھ رہی ہیں۔ دوسرے سے سر کھجا رہی ہیں۔ ان کا کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو شاید خود بھی بنالیتیں۔ میاں صاحب ناشتہ بنا کر بچوں کو نہلانے اور کپڑے بدلنے میں جت جائیں گے اور پھر اپنے اور بیوی کے جوتے پالش کرنے کے بعد ان کو دفتر جانے کی جلدی پڑجائے گی۔ شام کو آتے ہی باورچی خانے میں جا گھسیں گے یا غسل خانے میں بیٹھ کر بچوں کے کپڑے دھوئیں گے۔ اس سے فارغ ہوئے تو کچھ سلائی کا کام لے بیٹھیں گے۔ قمیصوں کے بٹن ٹانک رہے ہیں۔ جرابیں رفو کررہے ہیں۔ گلدان سجا رہے ہیں۔ گویا ہر چیز کا خیال ہے۔ نہیں خیال تو بیوی کا جو اپنے کمرے میں پڑی برابر ریڈیو سن رہی ہیں یا معمے حل کررہی ہیں اور بور ہورہی ہیں۔ میاں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آکر ان کے پاؤں ہی داب دے۔

✡ ✡ ✡

ایک صاحبہ نے پچھلے دنوں ایک مضمون میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اور اشارۃً کہا تھا کہ مردوں کو خانہ داری کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ شوہر صاحب علی الصبح بیوی کو بستر ہی میں چائے کی ایک گرما گرم پیالی بنا کر دے دیا کریں۔ تو یہ معمولی سی بات باہمی محبت میں اضافے کا موجب ہوسکتی ہے۔ انہوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ بہت سے مردوں کو سوئٹر بننے نہیں آتے۔ حالانکہ یورپ میں چند صدی پیشتر یہ کام مرد ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے انہوں نے کئی فائدے بھی گنوائے تھے کہ سوئٹر بننے سے سگریٹ پینے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ وہ یوں کہ سگریٹ کا گل جھاڑنے کے لیے ہر بار سلائیاں ہاتھ سے رکھنی پڑتی ہیں اور یہ سلائیاں چلانا اتنا دلچسپ شغل ہے کہ چند دن کے بعد مرد سگریٹ پر لعنت بھیج دے گا کہ اس سے سوئٹر بننے کا مزا کرکرا ہوتا ہے۔

✡ ✡ ✡

ہماری رائے میں مردوں کے لیے شروع ہی میں اس قسم کی تربیت کا بندوبست ہو تو اچھا ہے۔ مثلاً ان کی تعلیم میں خانہ داری کا مضمون ضرور ہونا چاہیے اور اسکولوں میں انہیں آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، طرح طرح کے سالن تیار کرنا، بچوں کی نگہداشت گھر کی صفائی وغیرہ سکھانے کا عملی انتظام ضرور ہو تاکہ شادی کے بعد گھر سنبھال سکیں۔ اس خیال میں نہیں رہنا چاہیے کہ پڑھ لکھ کر گریجویٹ ہوگئے ہیں اور برسرِ روزگار ہیں تو لڑکیوں کے والدین ان کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کردیں گے۔ اب تو ضرورت رشتہ کے اشتہار میں بھی یہ قید لگادی جائے گی کہ لڑکا قبول صورت اور پابند صوم و صلوٰۃ ہونے کے علاوہ گھر داری کا سلیقہ رکھتا ہو۔ سینا پرونا جانتا ہو۔ آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ جہیز کی کوئی قید نہیں۔ جتنا زیادہ لاسکے، لے آئے۔ لڑکی کی والدہ جب لڑکے کو دیکھنے آئیں گی۔ تو لڑکے والے اس امر کا اہتمام کریں گے کہ اس وقت لڑکا حیا کی سرخی چہرے پر لیے باورچی خانے میں بیٹھا آلو گوشت پکا رہا ہو اور آٹا گوندھ کے ایک طرف رکھ چھوڑا ہو۔ لڑکے کی والدہ بہانے بہانے اپنی ہونے والی یا نہ ہونے والی سمدھن کو بتائے گی کہ یہ ساری چادریں اور غلاف میرے بیٹے نے کاڑھ رکھے ہیں۔ اپنے کالج میں سلائی کڑھائی میں ہمیشہ اول آتا رہا ہے۔ کھانا پکانے کی تربیت بھی ہم نے اچھی دلائی ہے۔ چھ مہینے تو اس نے شہر کے مشہور مسلم کالی ہوٹل میں خانساماں کا کام کیا ہے اور بیاہ شادیوں میں دیگیں پکانے بھی جاتا رہا ہے۔ ادھر سمدھن اپنی بچی کے گن گائے گی کہ بہت خلیق اور ہنس مکھ ہے۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس لیے [illegible] اشراقوں [illegible] ہیں۔ تصویریں بھی بناتی ہیں۔ آرٹ کونسل کی نمائش میں [illegible] انعام ان [illegible] کو ملا وہ یوں کہ انہوں نے طوطا بنایا تھا۔ کسی نے اسے گھوڑا بتایا۔ کسی نے درخت۔ کسی نے آٹا پیسنے کی چکی۔ صحیح کوئی نہ بتا سکا۔ قلم [illegible] چھوڑی اور مطالعے کا ایسا شوق ہے کہ پاکستان کا کوئی فلمی رسالہ نہیں جو نہ منگاتی ہوں۔ گاتی بھی ہیں۔ ٹکٹ جمع کرنے اور قلمی دوستی کا شوق ہے۔ ہم نے اس بات کی احتیاط رکھی ہے کہ کھانے پکانے اور صفائی دھلائی سے اس کے ان اشغال میں ہرج نہ واقع ہو۔ یوں بھی ان کے ابا پرانی وضع کے ہیں۔ ان امور میں عورتوں کا عمل دخل پسند نہیں کرتے۔ اب میں مطمئن ہوں کہ جیسا بر ہم چاہتی تھی۔ ویسا اللہ نے دے دیا۔

✡ ✡ ✡

بہت سے مرد جن کی شروع کی زندگی بے قاعدگی اور بدعملی میں گزرتی ہے، شادی کے بعد یکسر بدل جاتے ہیں۔ بشرطیکہ بیوی اچھی ملے اور میاں کی ذات میں جو کمی رہ گئی ہے اسے پوری کردے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر رفیق شیرازی کی مثال لیجیے۔ فلسفے سے ان کو شغف تھا۔ سو ایم اے میں بھی اول رہے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر یونیورسٹی میں پڑھانے بھی لگے۔ لیکن علوم مفیدہ سے یکسر بے بہرہ۔ شادی ہوئی تو ہمیں ان کی آئندہ کی زندگی کے متعلق طرح طرح کے اندیشے تھے۔ لیکن پچھلے دنوں گاندھی گارڈن کے سامنے مل گئے۔ ایک بچہ ان کے کاندھے پر تھا اور دوسرا بچہ گاڑی میں۔ جسے وہ (بوتل سے) دودھ پلا رہے تھے۔ معلوم ہوا، بیوی اندر پھولوں کی نمائش دیکھنے گئی ہیں۔

"ہم نے کہا کہو کیسی گزر رہی ہے؟"

"بولے یار اس عورت، نجمہ نے تو مجھے کندن بنا دیا ہے۔ تم جانتے ہو میں کیسا بیکار احدی آدمی تھا۔ سوائے کتابوں کے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ روٹی پکانی تو ایک طرف آٹا گوندھنا تک نہ جانتا تھا۔ کپڑے دھونے اور استری کے فن سے بھی آگاہی نہ تھی اور بچوں کو نہلانے، رات کو اٹھ کر پیشاب کرانے کا سلیقہ بھی کہاں آتا تھا۔ اب ان دو سال میں سب کچھ آگیا ہے۔ چائے بہت عمدہ بناتا ہوں بلکہ نجمہ کو میرے ہاتھ ہی کی پسند ہے۔ برتن بھی اللہ کے فضل سے اچھے دھوتا ہوں۔ پچھلے دنوں اس کام کے لیے نوکر رکھا تھا لیکن اس نے دو پلیٹیں توڑ دیں۔ آخر اسے ہٹا کر پھر مجھے رکھا۔ یعنی پھر یہ کام میرے سپرد کیا۔ پھر قدرداں ایسی ہیں کہ ہر آئے گئے سے تعریف کرتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو خانہ داری کا سلیقہ اتنا اچھا آتا ہے کہ ان کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ خیر یہ ان کی محبت ہے۔ من آنم کہ من دانم۔"

ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ شعر بھی تو کہتے تھے؟ اور غزل میں تو آپ کا اپنا رنگ تھا؟"

بولے "ہاں کہتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سب تضیع اوقات تھی۔ جتنی دیر میں ایک شعر ہوتا تھا اتنی دیر میں پورا باورچی خانہ دھو ڈالتا ہوں۔"

ہم نے کہا "خیر کوئی رباعی ہی سنائیے کہ وہ بھی آپ کی بہت مرغوب صنف ہے۔"

بولے "رکابی؟ اچھا یاد دلایا۔ آج بازار سے رکابیاں بھی خرید کے لے جانی ہیں۔ بیگم نے کچھ سہیلیوں کو حلیم کھچڑے کی دعوت دی ہے۔ بھلا بتائیے تو کیا کیا پڑتا ہے حلیم میں!! آج پہلی بار پکاؤں گا یہ ڈش۔"





نادرہ خاتون

نامے میرے نام

خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

آسیہ مقصود..... کراچی

سب سے پہلے تو میں آپ سب کو اور اپنے تمام ہم وطنوں کو ———— رمضان کی مبارک باد دیتی ہوں۔ خدا کرے اس ماہ مبارک کی رحمتوں اور برکتوں کے طفیل میرے وطن کی فضاؤں پر چھائے اداسی مایوسی اور بے بسی کے اندھیرے چھٹ جائیں۔ دلوں کی کدورتیں دھل جائیں۔ میرے چمن میں یہ جو ہر سو پژمردگی چھائی ہے اور یہ جو جا بجا خون کی ہولی کھیلتے ہوئے گدھ دندناتے پھرتے ہیں ان کے خوف سے ہر طرف ہو کا عالم ہے..... خدا کرے یہ سب کچھ کسی کتاب کے ورق کی طرح پلٹ جائے اور ایک نئی صبح کا آغاز سچائی، محبت اور خلوص کے اجالوں سے ہو۔

اب آتے ہیں خواتین کی طرف تو جناب افسانوں اور ناولوں پر مشتمل اس ہمہ رنگ گلدستے پر۔ میرے لیے تو یہ ایک شہر طلسمات ہے جہاں کھو کر میں کچھ دیر کے لیے ارد گرد بکھری تلخیوں کو بھول جاتی ہوں۔ ہر کہانی اور اس کے جیتے جاگتے کردار مجھے اپنے گرد گھومتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہنستی بولتی ہوں۔ ان کی خوشیوں میں خوش اور ان کے دکھ مجھے بھی دنوں تک غمگین رکھتے ہیں۔

میرے پسندیدہ ناولز تو دل چاہتا ہے کہ کبھی اختتام پذیر نہ ہوں جیسا کہ مصحف کو ہر بار پڑھنے سے پہلے دھڑکتے دل کے ساتھ آخری صفحہ پلٹ کر دیکھ لیتی ہوں کہ کہیں.....

ایک چھوٹی سی تجویز ہے کہ ایسی سدا بہار تحریروں سے نئے قارئین کو متعارف کروانے کے لیے کسی مستقل سلسلے کا آغاز جائے مثلاً "اشاعت مکرر" وغیرہ۔ اگر ہر ماہ یہ ممکن نہ ہو تو پھر دو تین ماہ میں ایک بار۔

اس ماہ کے شمارے میں "سفال گر" کو پڑھتے ہوئے پہلی بار دل میں ایک کسک سی محسوس ہوئی۔ آیا (پرنیاں) اگر مرگئی تو.....

حرمت "ایک اچھی سوچ" ایک پر اثر کہانی "ایسے آئینے معاشرے کو دتا" فوقتاً دکھاتے رہنا چاہیے واحد کی جو محسوس ہوئی وہ اس کا اختصار تھا۔ ابھی حساب باقی ہے میں آسیہ رزاقی نے تو بہت رلایا اور میں یہ سوچتی رہی کیا کوئی اتنا سنگدل بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے پوتے اور پوتی کو دیکھ کر بھی جس کا دل نہ پسیجے۔

ج آسیہ! ہمارے ارد گرد بہت سے لوگ اس سے بھی زیادہ سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہم دیکھ کر خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں یہ آسیہ رزاقی کے قلم کا کمال ہے جنہوں نے احساس دلایا اور آپ کو رلا دیا۔ آپ کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ پڑھ کر ہی رائے دی جا سکتی ہے۔

ام عبداللہ بخاری..... کوٹ سمابہ ضلع رحیم یار خان

اس دفعہ ہمارے ہاکر نے ہمیں خواتین ڈائجسٹ کے لیے بہت تڑپایا پھر بھائی جا کر دوسرے شہر سے ہمارے لیے خواتین ڈائجسٹ لے کر آئے ہماری محبت سے زیادہ مصحف کی وجہ سے۔ مصحف کے لیے جتنے بے چین تھے پڑھ کر الجھن کا شکار ہو گئے کہ یہ کیا؟ ہمارے خیال میں تو بس اس ناول کا اینڈ ہونا تھا اور یہ تو پوری اسٹوری ہی چینج ہو گئی ایسا لگتا ہے اسٹار پلس کی طرح بس کہانی کو ببل گم کی طرح کھینچا جا رہا ہے۔ بہرحال اس کا ٹاپک بہت ہی چینج ہے۔ "حساب باقی ہے" آسیہ رزاقی کا ناول تھا بے انتہا طویل اور اس میں ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی دادی اور پھپھو اتنی سنگ دل بھی ہو سکتی ہیں؟ "تلاش میں ہے سحر" فیضیہ عامر ایک نیا اضافہ، خوب صورت انداز اور خوب صورت کہانی، صائمہ اکرم نے خالی ہاتھ تحریر کے ساتھ دل خوش کر دیا افسانے تمام اچھے تھے۔ صدقہ سب میں سبقت لے گیا! سلویٰ علی بٹ ایک شاندار اضافہ ہمارے ڈائجسٹ میں "سفال گر" اگرچہ شروع میں سمجھ نہیں آیا مگر اب ایک تو دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اور دوسرے دھڑکا ہے کہ اب یہ بھی ہم سے رخصت ہو جائے گا ویل ڈن بشریٰ سعید۔

ج ام عبداللہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی بتائی ہوئی دعا نایاب تک پہنچا دیں گے۔

شازیہ ملک..... میر پور خاص

مجھے جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ تحریر آسیہ رزاقی کا "حساب ابھی باقی ہے" پہلے سب کی نوک جھونک نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی کہانی نے اصل گرفت تب پکڑی جب صبا کی آزمائش شروع ہوئی صبا سے غلطی ہوئی لیکن موسیٰ کو چاہیے تھا کہ جاتے ہوئے لیٹر لکھ کر صبا کے پاس رکھ جاتا تو اتنی بڑی غلط فہمی نہ ہوتی۔ بہت دلکش ناول تھا بلاشبہ یہ ڈائجسٹ کی جان تھا۔

افسانے بہت زبردست تھے طلب میرے دل کو چھو گیا۔ بشریٰ سعید بھی نہایت تیزی سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں اس ماہ رنگا رنگ پھول میں سب کچھ اچھا تھا لیکن مجھے زیادہ نمرہ، اقراء کا "انتخاب" "خوشنودی" اور لطیفہ "حقیقت پسند" اچھا لگا۔

"خاتون کی ڈائری" میں عائشہ بلوچ کا انتخاب احمد فراز کی غزل اچھی تھی اور دوسرے مستقل سلسلہ بھی اچھے تھے سلسلہ وار ناول "رفعت ناہید" "چراغ آخر شب" اچھی چل رہی ہے آپ کی کہانی میں تاریخ کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگ رہا ہے۔ صائمہ اکرم نے اچھے موضوع پر لکھا۔

افسانوں میں رمشا خالد اور عنیقہ محمد بیگ بازی لے گئیں کرن کرن روشنی میرا فیورٹ سلسلہ ہے فوائد و مسائل کے ساتھ زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

پیاری شازیہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

تہمینہ کوثر..... ضلع سرگودھا

چھٹی کلاس سے خواتین پڑھ رہی ہوں بی اے کے امتحان کے بعد اب فارغ ہوں۔ میں نے خواتین کے پرانے شمارے بھی ڈھونڈ کر پڑھ ڈالے ہیں مجھے نگہت سیما اور نمرہ احمد بہت پسند ہیں۔ مصحف تو رسالے کی جان ہے ہم لوگ قرآن کو طاقوں میں سجا کر بھول جاتے ہیں نمرہ احمد نے بہت خوب صورتی سے اس بات کا احساس دلایا ہے۔ افسانوں میں سدرہ سحر عمران کا افسانہ قسمت بہت اچھا تھا آسیہ رزاقی کا حساب باقی ہے بہت زبردست تھا شروع میں صبا اور عینی کی نوک جھونک نے کافی مزا دیا لیکن اینڈ میں ناول کافی دکھی ہو گیا۔ صبا کے ساتھ جو سلوک ہوا پڑھ کر رونا آ گیا۔ تلاش میں ہے سحر بھی اچھی کاوش تھی۔

صائمہ اکرم کا ناولٹ خالی ہاتھ بہت پسند آیا جو لوگ اپنی پہچان سے پیچھا چھڑاتے ہیں "خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔"

بشریٰ سعید کی سفال گر کی مجھے سمجھ نہیں آئی پڑھتی ہوں لیکن سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے پلیز صبا قمر کا انٹرویو شائع کریں۔

ج - پیاری تہمینہ! آپ بی اے کا امتحان دے چکی ہیں اور بشریٰ سعید کا آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ جان کر ہمیں شدید حیرت ہوئی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صبا افضل بٹ..... رینالہ خورد

ضد، غصہ اور انا یہ سب عوامل اکٹھے ہو جائیں تو سب کچھ تباہ کر دیتے ہیں آسیہ رزاقی کا مکمل ناول ایک ظلم و ستم کی داستان جو ہم سب کو رلا گئی۔ سگے رشتوں کی بے اعتنائی اور بے اعتباری حقیقت سے قریب تر تھی ایسی ہی ایک حقیقی داستان ہماری نظروں سے گزر چکی ہے۔ مصحف کی پہلی قسط بہت اچھی لگی تھی بہت ہی تجسس بھری کہانی جو آہستہ آہستہ محو سفر تھی کہ ایک دم سے ہی چھلانگ لگا کر سات سال آگے پہنچ گئی۔ اب کہانی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ فیضیہ عامر کا ناولٹ "تلاش میں ہے سحر" پسند نہیں آیا وہی عام سی سٹوری تھی۔

"خالی ہاتھ" ناولٹ اچھا تھا بہت بہتر تھا۔ مائرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا بہت ہی اچھا ہوا۔ ایسے لوگ جو اپنے اصل سے بھاگتے ہیں وہ ایسے ہی اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ سفال گر اچھا جارہا ہے کیا آپا بیگم واقعی مرگئی؟ عمر پر اس کی اصل حقیقت واضح ہونی چاہیے تھی اگر وہ مرگئی تو عمر کو کون بتائے گا اس کی ماں کی حقیقت۔

سلویٰ علی بٹ ایک نئی ابھرتی ہوئی مصنفہ بہت خوب صورت اور اچھا لکھتی ہیں۔ صدقہ بہت ہی خوب اور زبردست افسانہ تھا۔ عنیقہ محمد بیگ کا بھی اچھا تھا۔ سدرہ اور رمشا کے افسانے بھی ٹھیک ہی لگے۔ نعیمہ ناز کا افسانہ "حرمت" بہت زبردست تھا۔ کیوٹ سی سائرہ یوسف کا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا اور باقی ہمارے سلسلے بھی بہت شان دار ہیں۔

ج: پیاری صبا! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ماریہ سلیم...... لیہ

آپ کا شمارہ بہت اچھا جارہا ہے اور خاص طور پر مصحف کہانی بہت ہی زیادہ! آپی میں فرسٹ ٹائم آپ کو خط لکھ رہی ہوں میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں! لیکن اس کے باوجود میں خواتین کے لیے ٹائم نکال ہی لیتی ہوں! آپی میں ایک ناول لکھ رہی ہوں اور مکمل کرکے آپ کو بھجوانا چاہتی ہوں تو کیا بھجوا سکتی ہوں۔

ج: پیاری ماریہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' آپ کی شاعری متعلقہ شعبہ کے حوالے کردی گئی ہے' ناول ضرور بھجوائیں' پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شائع ہوگا یا نہیں پڑھ کر بتا سکتے ہیں۔

شمیم صدر دین رحمانی...... صفدر آباد

عنیقہ محمد بیگ ہمیشہ کمال کرتی ہیں' بڑی زبردست کہانی تھی۔

"مصحف" اچھی کہانی ہے سب سے پہلے "سفال گر" پڑھتی ہوں دل چاہتا ہے کہ جلدی جلدی پڑھ لوں۔ "قسمت" اور "تلاش میں ہے سحر" اور "صدقہ" بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ سائرہ یوسف سے ملاقات اور باتیں نیہا سے پڑھ کر مزا آیا' میں پہلے باقاعدگی سے شرکت کرتی تھی۔ شاہین رشید کے انٹرویو نہ دینے کی وجہ سے خط نہیں لکھتی۔

ج: کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد آپ کا خط ملا' ہمیں یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ شاہین رشید کے انٹرویو نہ دینے کی وجہ سے باقاعدگی سے خط نہیں لکھتی ہیں۔ اتنا تو سوچیں کسی کی اپنی کچھ مجبوریاں بھی ہوتی ہیں —— ہم شاہین تک آپ کے جذبات پہنچارہے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نورالعین...... پارٹیانوالی تحصیل پھالیہ

ٹائٹل صرف جیولری کی وجہ سے پسند آیا۔ سائرہ یوسف سے ملاقات اچھی لگی۔ خواتین اور شعاع کافی عرصے سے زیر مطالعہ ہیں۔ اس دفعہ کے خواتین میں سے فیضہ عامر کا ناولٹ سب سے زیادہ پسند آیا۔ نمرہ احمد کے مکمل ناول "مصحف" نے خط لکھنے پر مجبور کیا' نمرہ احمد نے قرآن کو جس انداز سے پیش کیا۔ وہ ہمارے لیے بالکل نیا ہے۔ ابتدائی اقساط میں قرآن اور نماز کے بارے میں جو بیان کیا۔ اس نے بے حد متاثر کیا۔ لیکن نمرہ جی آپ کو ناول ختم کرنے کی کچھ زیادہ ہی جلدی ہے۔

مجھے ملیحہ میں نیہا کی باتیں اچھی لگیں۔ شاہین جی پلیز سعدیہ امام یا صبا قمر سے بھی ہماری ملاقات کروائیں' اسی سلسلے کے ذریعے۔

ج: پیاری نورالعین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید' ردی کی ٹوکری کے ڈر سے آپ نے خط نہیں لکھا اور ہم آپ کی رائے جاننے سے محروم رہے۔ آپ کا خط شائع کر رہے ہیں' اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

لیلیٰ خالد...... ڈیرہ غازی خان

میرے خط لکھنے کی وجہ بشریٰ سعید کا ناول "سفال گر" ہے جو نہایت ہی خوب صورت انداز سے آگے بڑھ رہا ہے یہ بہت ہی اچھا ناول ہے۔

اور نمرہ احمد کا "مصحف" بلاشبہ ایک بیسٹ ناول ہے کہ یہ بہت منفرد تحریر ہے۔

ج: پیاری لیلیٰ اتنے طویل عرصے سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں اور خط پہلی بار لکھا ہے کیا پہلے کسی تحریر نے آپ کو متاثر نہیں کیا۔

بشریٰ سعید اور نمرہ احمد تک آپ کی تعریف ان سطور

کے ذریعے پہنچارہے ہیں۔ اتنے مختصر خط میں مزہ نہیں آیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

فاطمہ قیصر...... ڈسکہ

نہیں چاہیے محبت کو زبان بہت زبردست افسانہ تھا۔ آج کل ہر گھر میں یہ مسئلہ ہے۔ خدا سب کی بیٹیوں پر اپنا کرم بنائے رکھے۔ ہمیشہ کی طرح منفرد پلاٹ تھا۔ ویل ڈن عنیقہ محمد جی۔ فیضہ عامر کا ناولٹ سو سو تھا۔ آسیہ رزاقی نے کمال کا لکھا۔ سدرہ سحر عمران کا پرانا پلاٹ تھا۔ رمشہ خالد نے بہت اچھا لکھا۔ رمشہ خالد اور عنیقہ سے ناول' ناولٹ لکھوائیں۔ سلویٰ علی بٹ نے اس دفعہ مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ رخ چوہدری' نگہت عبداللہ' تنزیلہ ریاض سے بھی کہیے کہ ہمارا انتظار ختم کریں اور اپنی تحریریں بھیجیں۔

ج: فاطمہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کا تبصرہ اور فرمائشیں ان سطور کے ذریعے پہنچارہے ہیں۔

عذرا خان' نسیم خان...... کوٹ سادھورام

آج کے دور میں جب فحاشی' نفسانفسی اور بے حیائی' بے ایمانی عام ہیں اور ہم نے قرآن کو تقریباً" چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں مصحف جیسی تحریر کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اس تحریر کو پڑھ کر بہت سی بہنوں نے قرآن کو باقاعدگی سے پڑھنا شروع کردیا ہے۔ بشریٰ سعید بھی ٹاپ پہ ہیں۔ رفعت ناہید کو پڑھ کر اور ملک و قوم کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔

ثوبیہ جبیں میو! جنہوں نے جون کے شمارے میں خط لکھا' خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ بھی ہماری طرح میو قوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے خط میں لکھا کہ میو قوم میں ہندوانہ رسم و رواج ہیں اور عورت کو بہت نیچ سمجھا جاتا ہے۔ ثوبیہ بہن ہمیں آپ کی اس بات سے اختلاف ہے۔ اب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ شاید آپ نے "آئینہ صورت" نہیں پڑھی جن کے مصنف ابو شاکر عبدالرحمن خان میو ہیں۔

برصغیر میں میو قوم بہت بڑی تعداد میں آباد تھی۔ یہ قوم ہمیشہ سے بڑی خوددار' نڈر اور انا پرست رہی ہے۔ جب اکبر بادشاہ نے دیگر قوموں سے رشتے لینے شروع کیے تو سب قوموں نے رشتے دے دیے لیکن میو قوم نے صاف انکار کر دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں ہندوانہ رسم و رواج تھے لیکن پاکستان آنے کے بعد میو قوم یہ رسم و رواج انڈیا میں ہی چھوڑ آئے تھے۔

پاکستان آکر میو قوم نے بہت زیادہ محنت کی اور آج میو قوم ترقی کی بلندیوں پر ہے۔ تبلیغی مرکز رائے ونڈ میو کی مدد سے قائم ہوا اور یہ قوم دن رات دینی خدمات میں مصروف ہے۔ اس درس گاہ کے لیے جگہ میاں عبداللہ پاسٹ ہونے دی۔ میو قوم نے بہت سے مدارس قائم کیے جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ میں نے ایم اے ایجوکیشن' ایم اے ہسٹری کیا ہے اور ٹیچنگ کرتی ہوں۔ میری نند ڈاکٹر ہے جو قصور شہر میں جاب کرتی ہے۔ اس کے علاوہ میری تمام بہنیں' کزنز پڑھی لکھی ہیں۔ جو مختلف شہروں اور دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔ لیکن ہم نے ابھی تک اپنے خاندان اور اردگرد ایسے لوگ نہیں دیکھے جو عورت کو نیچ ذات سمجھتے ہوں۔

عمارہ نیازی...... بھکر

ناول بس ٹھیک تھا۔ سائرہ یوسف کا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سلویٰ بٹ کا صدقہ بہترین کاوش تھی۔ عنیقہ کا نہیں چاہیے محبت کو زباں بہت اچھے موضوع کی طرف اشارہ تھا۔ اس ماہ سب سے بہترین رمشہ کا افسانہ طلب تھا۔ ان کے الفاظ میں بہت سحر تھا۔ تحریر بہت جان دار اور خوب صورت تھی۔ خالی ہاتھ بس گزارا ہی تھا۔ نعیمہ جی کا حرمت کا موضوع پہلے کوئی اور تھا پھر اچانک بدل گیا۔ آسیہ رزاقی کے مکمل ناول کا موضوع بہت اچھا تھا۔ اب آتے ہیں نمرہ باجی کے ناول مصحف کی طرف۔ کہانی اتنی تیزی سے آگے بڑھی کہ میں تو حیران رہ گئی۔ ہمایوں صاحب پر تو مجھے رج کے غصہ آیا۔ بس نمرہ باجی! محمل کے ساتھ برا مت کرنا۔ ویسے نمرہ کا یہ ناول ہے بہت زبردست۔

آپ سے التماس ہے کہ پلیز اپنے ڈائجسٹ میں مشہور مصنف جاوید چودھری اور ماڈل و اداکارہ ایمان علی کا انٹرویو شائع کریں۔ پلیز!

ج: پیاری عمارہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ نمرہ اور دوسری مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے

ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

جاوید چودھری اور ایمان علی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

روبی...... حضرو

طویل عرصے بعد پھر قلم اٹھانے کی جسارت کررہی ہوں۔ رفعت ناہید سجاد کا "چراغ آخر شب" گھٹنے ٹیکنے کی وجہ بنا۔ اتنا خوب صورت ناول میں نے اس سے پہلے نہیں پڑھا تھا۔ پلاٹ پر رائٹر کی گرفت کہیں بھی نہ پھسلی حالانکہ ٹاپک بہت نازک تھا اور منظر نگاری ایسی باکمال کہ انہیں ایوارڈ ملنا چاہیے۔ عبیر اور سر عباس میرے فیورٹ کردار ہیں۔ ان جیسے مخلص' نڈر اور بے ریا لوگ کہاں ملتے ہیں؟ کیا کوئی اتنا محب وطن ہو سکتا ہے کہ وطن کے لیے ہر چیز داؤ پر لگادے؟ میں نے اچھے اچھے لوگوں کو ذرا سی اذیت پر پاکستان کے خلاف بولتے دیکھا ہے مگر یہ عظیم وطن سر عباس جیسے لوگوں کی وجہ سے قائم ہے۔ مصنفہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ اس دفعہ کسی بہن نے اس ناول پر تنقید کی تو بہت دکھ ہوا مجھے سمجھ نہیں آتا اس ناول میں مشکل اور سمجھ میں نہ آنے والی چیز کیا ہے؟ مگر ہر بندے کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے اس لیے کیا کہہ سکتے ہیں۔

دوسرا بہترین ناول بشریٰ سعید کا "سفال گر" ہے۔ پہلے ہی دن سے اپنے سحر میں جکڑ لینے والا بہترین ناول' ہر مکالمہ' ہر منظر اتنا بھرپور کہ صدیوں کی ریسرچ لگتا ہے۔ بشریٰ جی! اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ راحت جبیں اپنے رنگ میں نظر آئیں۔

ج - پیاری روبی! رفعت ناہید سجاد بلاشبہ بہترین تخلیق کار ہیں۔ ان کی تحریر کے سب سے بڑے مداح تو ہم ہیں۔ انہوں نے جو موضوع منتخب کیا ہے۔ اس پر لکھنا آسان نہیں تھا' بہت محتاط ہو کر لکھنا پڑتا ہے' یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں عام قارئین کو ابہام محسوس ہوتا ہے اور وہ سمجھ میں نہ آنے کی شکایت کرتی ہیں۔

سدرہ نرمل...... نروال شریف جہلم

خواتین سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ مجھ سے پہلے میری امی اور بڑی بہنیں پڑھتی تھیں اور اب بھی پڑھتی ہیں۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ اس کے بعد دوڑ لگائی نمرہ احمد کے پاس۔ نمرہ جی نے جو کہانی ایک سال آگے کی تھی وہاں تک تو ٹھیک تھی لیکن سات سال جب آگے کی تو بہت دکھ ہوا محمل کا۔ محمل نے میکے میں بھی اتنے دکھ دیکھے تھے اور اب شادی کے بعد بھی دکھ۔ پلیز محمل کو اتنے دکھ مت دیں۔ پلیز محمل اور ہمایوں کو جدا مت کیجیے گا۔ لیکن مجھے تیمور کی بے رخی سمجھ میں نہیں آئی۔

"مصحف" کے بعد جو ناول پڑھا وہ تھا "حساب ابھی باقی ہے" رائٹر آسیہ رزاقی۔ اوہ مائی گاڈ۔ اس رائٹر کی کمی جو شعاع میں محسوس کی تھی وہ خواتین نے پوری کردی۔ آسیہ رزاقی انومائی فیورٹ۔ وہ کوئی مختصر کہانی لکھیں یا لمبی مجھے وہ ہر حال میں پسند آئے گی۔ آسیہ رزاقی ہمارے لیے ایسی ہیں جیسے سورج کے لیے روشنی' پھول کے لیے خوشبو وغیرہ اللہ ان کو لمبی زندگی دے اور صحت و تندرستی دے۔ آمین

نعیمہ ناز سلطان' فاطمہ اکرم' رمشہ خالد خان' سدرہ سحر عمران' عنیقہ محمد بیگ اور سلویٰ علی بٹ ان سب کے افسانے مجھے بہت پسند آئے۔ "چراغ آخر شب" بھی اچھا جارہا ہے۔ "سفال گر" بھی ٹھیک ہے۔ نایاب جیلانی اس دفعہ بھی غائب ہیں؟ کیوں......

ج: پیاری سدرہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

☼



تانگے کی آئے کی بارات کا مرکزی کردار

باتیں عروسہ صدیقی سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"عروسہ صدیقی۔"

2 "پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

"موٹی یا پھر عرو۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر / ستارہ۔"

"13 مئی 1985ء / کراچی / جیمنائی۔"

4 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"

"میں اور مجھ سے دو چھوٹے بھائی / پہلے نمبر پر ہوں۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"

"گریجویٹ ہوں اور ناپا سے 3 سال کا ڈپلومہ کیا ہے اداکاری میں۔"

6 "شادی کب کرنی ہے؟"

"شاید ایک دو سال میں ان شاء اللہ۔"

7 "شوبز میں آمد؟"

"ناپا کے ذریعے آئی۔"

8 "پہلا پروگرام؟"

"تھیٹر میں پہلا ڈرامہ "سفید خون" تھا اور ٹی وی پر "بارش میں دیوار" میری پہلی ٹیلی فلم تھی۔"

9 "وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟"

"کھاریاں سے کھارادر" اس میں میں اور محب مرزا تھے۔"

10 "پہلی کمائی؟ / کیا کیا تھا؟"

"500 روپے جب میں آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی۔ میں ایک ہاؤس وائف کو انگریزی پڑھاتی تھی / اور گھر والوں پر خرچ کردیے تھے۔"

11 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"صبح اٹھ کر سب سے پہلے دانت برش کرتی ہوں پھر ٹھیک طرح سے آنکھ کھلتی ہے۔"

12 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"

"مجھے تو کچھ پسند نہیں سوائے گوشت کے کچھ نظر نہیں آتا۔ لوگ کہتے ہیں آنکھیں اچھی ہیں اور مسکراہٹ اچھی ہے۔"

13 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"ڈرائنگ روم میں' وہیں اپنا سارا کام کرتی ہوں۔"

14 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"بہت غصہ آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ دنیا کا لذیذ ترین کھانا کھاؤں۔"

15 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟"

"ماما اور پاپا سے اور اپنے بہترین دوستوں سے۔"

16 "کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟"

"واپس سو جاتی ہوں۔"

17 "پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟"

"آواز...... مسکراہٹ۔"

18 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"کہ مجھے بہت سارا وزن کم کرنا ہے۔"

19 "اگر اپنی مرضی کی زندگی گزارنی پڑے تو کیسے گزاریں گی؟"

"میں تو ابھی بھی اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہوں۔"

20 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟"

"جب میں کسی کو اپنی بات نہیں سمجھا پاتی اور جب کسی کی مدد کرنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہوتے۔"

21 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"

"وقت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں اور نہ نکالنا چاہیں تو نہیں نکال سکتے۔"

22 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"

"قہقہہ...... کوئی پاگل ہی ہوگا۔"

23 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتیں؟"

"یہ تو ایسا سوال ہے کہ اس کا کیا جواب دوں۔ اللہ سے تو ہم بہت کچھ مانگتے ہیں۔"

24 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی کو بدل دیا ہو؟"

"میرے ماں باپ۔"

25 "جب آپ نیا قلم استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"

"اپنا نام۔"

26 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی محسوس کرتی ہو؟"

"ہر کھانے کے بعد میں سمجھتی ہوں کہ میں نے غلطی کی ہے۔"

27 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"نہیں جی۔ کھانے پینے کے ساتھ میرا کوئی غصہ نہیں ہوتا۔"

28 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"مما کے ہاتھ کا اور گھر سے باہر کا کھانا مجھے زیادہ پسند ہے۔"

29 "پسندیدہ ناشتہ؟"

"انڈے اور کارن فلیکس۔"

30 "موڈ خراب ہوتا ہے؟"

"گرمی اور لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے خراب ہوتا ہے ورنہ تو نہیں ہوتا۔"

31 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی تبدیلی بہت ضروری ہے اور پلیز یہ ضرور لکھیے گا کہ سارے سیاست دانوں کو مر جانا چاہیے۔"

32 "الہ دین کا چراغ مل جائے تو کیا خواہش کریں گی؟"

"ایک اچھی خوشگوار زندگی کی اور اپنے والدین کی خدمت کی۔"

33 "پسندیدہ چینل؟"

"Sky world" ای ایس پی این (گیمز چینل)

34 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ لڑکیاں یا لڑکے؟"

"میرے خیال میں لڑکے، ہم لڑکیوں کے پیٹ ہلکے ہوتے ہیں۔"

35 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہو؟"

"طبیعت میں صبر نہیں ہے۔ صبر چاہتی ہوں۔ مجھے غصہ جلدی آجاتا ہے۔"

36 "قسمت پہ کتنا یقین ہے۔"

"سو فیصد اس حد تک کہ ایک پتا بھی اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔"

37 "ایک سوال جو تم اللہ سے روزانہ کرتی ہو؟"

"کہ آپ نے کیوں پیدا کیا اگر مارنا ہی ہے تو۔"

38 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"

"نہیں۔ بڑی گھٹیا ہے میری چھٹی حس، مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔"

39 "گھر آ کر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ فوراً نہاؤں۔"

40 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"اس حد تک کہ بس تکلیف دہ موت نہ ہو۔"

41 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتیں؟"

"شادی کی۔"

42 "شادی کی کون سی رسم بری لگتی ہے؟"

"نکاح اور ولیمہ ..... مہندی، مایوں میں جتنا نچانا ہے نچوالو۔"

43 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"تمام چیزیں۔ سب کچھ ہمارے آرام کے لیے بنائی گئی ہیں۔"

44 "تہوار جو شوق سے مناتی ہیں؟"

"عید کے لیکن یہاں تہوار منانا بہت مشکل ہے کیونکہ کام بہت ہوتے ہیں۔"

45 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"پہلے بولتی تھی۔ مگر اب نہیں میرے والدین نے مجھے بہت اعتماد دیا ہے۔"

46 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"

"مجھ سمیت سب لوگ Fake (مصنوعی) ہیں ایک ایک بندہ Fake ہے۔"

47 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

"پہلے نیند پوری کرتی ہوں پھر فیملی کے ساتھ کہیں چلی جاتی ہوں۔"

48 "موبائل فون رحمت یا زحمت؟"

"بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے بہت سے کام آسان ہو گئے ہیں۔"

49 "شہرت کے بارے میں آپ کے تاثرات؟"

"شہرت بہت اچھی چیز ہے بشرطیکہ آپ کا دماغ خراب نہ ہو۔"

50 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب میں کسی نہ کسی وجہ سے اپنی زندگی نہیں جی پاتی تب بری لگتی ہے۔ کبھی لائٹ نہیں ہے تو کبھی کچھ ٹینشن ہو تو۔"

51 "اس انٹرویو میں کوئی سوال جو برا لگا ہو؟"

"نہیں کوئی نہیں لگا۔"

52 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"ایسا ہوتا تو نہیں کیونکہ میرے برابر میں کوئی نہ کوئی خوب صورت لڑکی ضرور ہوتی ہے۔"

53 "سارا دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"

"جب میں سونے کے لیے بستر پر جاتی ہوں۔"

54 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"جب غصہ آتا ہے اور میں نہیں دکھا پاتی۔"

55 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"

"شاید جب اس فیلڈ میں آئی اور نایا جوائن کیا۔"

56 "زندگی میں کیا کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"ہے تو نہیں لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ زیادہ کی خواہش کرتا ہے۔"

57 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"کہ اتنی بڑی ہو گئی ہو اور شادی نہیں کرتیں۔ پتلی ہو جاؤ کہ شادی ہو جائے۔"

58 "ایک رشتہ جس نے دکھ دیا ہو؟"

"دوستی کے رشتے نے۔"

59 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہو؟"

"پانچ روپے۔"

60 "غصہ کب آتا ہے؟"

"بہت سی چیزوں پر آتا ہے۔ ہر وقت آتا ہے۔"

61 "کن باتوں پہ کنٹرول نہیں ہے؟"

"کھانے پر کنٹرول نہیں ہے۔"

62 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"پتا نہیں ابھی تو نہیں ہوئی جب ہو گی تو آپ کو ضرور بتاؤں گی۔"

63 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

"بہت بار مانگا مگر کبھی نہیں ملا۔"

64 "اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہیں؟"

"ہاں، نادم پڑ جاتی ہوں اس کے جس کے ساتھ برا کیا

ہو۔"

65 "کوئی انوکھی خواہش؟"
"کوئی خاص نہیں۔"

66 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"
"جب وہ بھائیوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور مجھ سے کم۔"

67 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی؟"
"میرا خیال ہے نادانی ہی ہوگی۔"

68 "کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہیں؟"
"میں اپنے آپ پر تو بالکل بھی خرچ نہیں کرتی۔ دوسروں پر اور گھر والوں پہ۔"

69 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟"
"میں کردار دیکھتی ہوں کہ اگر پرفارم کرنا پڑے تو کیسے کروں گی۔ جیسے فقیر کو، ٹھیلے والے کو وغیرہ وغیرہ۔"

70 "کس شخصیت سے خوف زدہ رہتی ہیں؟"
"میرا نہیں خیال کہ میں کسی سے خوف زدہ رہتی ہوں۔"

71 "کس کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"
"کھانے کے بغیر۔"

72 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"غصے پہ قابو نہیں ہے۔ یہ بری عادت ہے۔ باقی تو سب اچھی ہی ہیں۔"

73 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہیں۔"
"شام کے بعد۔"

74 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو۔"
"دوبارہ سو جاتی ہوں۔"

75 "کوئی شام جو آپ اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں۔"
"حناول یذیر اور نعمان اعجاز۔"

76 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"انڈیا۔"

77 "اچانک چوٹ لگنے پہ بے ساختہ جملہ؟"
"اوئی ماں۔"

78 "بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتی ہیں یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"بہت کروٹیں بدلتی ہوں۔"

79 "انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت۔"
"انسان اچھا ہونا چاہیے، مرد عورت سے کچھ نہیں ہوتا۔"

80 "کھانے کی بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی۔"
"ڈائننگ ٹیبل پہ آلتی پالتی مار کر کھانا۔"

81 "آپ کا ذریعہ معاش۔"
"شوبز، میرا پروڈکشن ہاؤس۔"

82 "کون سے الفاظ بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں۔"
"میرا کوئی تکیہ کلام نہیں ہے۔"

83 "مرد کب برے لگتے ہیں۔"
"جب وہ عورت کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

84 "پیسہ کس شکل میں محفوظ کرتی ہیں۔"
"ہاتھ میں سوراخ ہے۔ ختم ہو جاتے ہیں۔"

86 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"
"اسکریٹ، چشمہ، موبائل، وٹامن کی گولیاں اور پانی۔"

87 "تمہاری ایک عادت، جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"
"یہی کہ میں اپنا اور اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔"

88 "اپنی کمائی سے اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"شاید کیمرہ لیا تھا۔"

89 "دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتی ہیں؟"
"سعودی عرب تو میرا اپنا گھر جیسا ہے البتہ کراچی میرے لیے نیا ہے۔ تو وہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔"

90 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"میرا بیگ کافی بڑا ہے اور اس میں دنیا جہاں کی چیزیں ہوتی ہیں اور پانی کی بوتل بھی ہوتی ہے۔"

91 "آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟"
"بالکل بھی مختلف نہیں ہے۔ عام لوگوں کی طرح ہی ہے۔"

☆



ماہر پکوان آرائش خانہ

ناہید انصاری سے ملاقات

شاہین رشید

"کیسی ہیں ناہید انصاری صاحبہ اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

(ناہید صاحبہ کا تعارف ہم نے اس لیے نہیں کرایا کہ انہیں سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ کہ وہ ایک معروف ماہر پکوان اور آرائش خانہ ہیں)

"جی الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"آج کل ایک پرائیویٹ چینل سے دو لائیو پروگرام کر رہی ہیں، اس کے علاوہ ایک اسکول بھی کھولا ہوا ہے۔ جس میں کوکنگ اور دیگر کاموں کے ساتھ مذہب کے متعلق بھی بتایا جاتا ہے۔"

"آج کل کی نوجوان نسل خاص طور پر لڑکیاں اسلام سے دور ہوتی جا رہی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ نوجوان نسل اسلام سے بہت دور ہوتی جا رہی ہے مگر ہم نوجوان نسل کو اس کا الزام نہیں دے سکتے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہم بچوں کو جو ماحول دیں گے، وہ اسی میں ڈھل جائیں گے مگر ہم ان کو الزام دے دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ہم ٹھیک کہہ رہے ہوتے ہیں۔"

آج کل میں نے دیکھا ہے اور جو مجھے مائیں ملتی ہیں اور پروگرام کے دوران جو کالز آتی ہیں ان میں ہر ماں یہ شکایت کر رہی ہوتی ہے کہ بچے کہنا نہیں مانتے۔ تو میں کہتی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ہر چیز تو بچوں کو مہیا کردی ہے۔ جیسے کمپیوٹر' انٹرنیٹ' میڈیا وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کا درست استعمال تو بتایا ہی نہیں۔"

اگر بچوں میں کچھ غلط عادتیں ہیں تو اس کا سبب والدین ہیں' جب وہ خود کو نہیں سدھاریں گے تو بچوں کو کیسے منع کریں گے تاں کے پاوں کے نیچے جنت اس لیے رکھی گئی ہے کہ ماں قربانیاں دیتی ہے۔"

"تو کیا آج کی ماں میں قربانی کا جذبہ نہیں ہے؟"

"نہیں... بالکل نہیں ہے۔ میرے پاس مائیں آتی ہیں اپنی بچیوں کو لے کر کہ ناہید پلیز کچھ کریں' اس کو تو اٹھنا بیٹھنا نہیں آتا' کھانا نہیں آتا' نہ ہی اس میں بڑوں کا ادب ہے... تو میں کہتی ہوں... جب تک آپ اپنے گھر کا ماحول ٹھیک نہیں کریں گے کچھ نہیں ہوسکے گا۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے تھے تو سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرتے تھے' کوئی ریموٹ نہیں ہوتا تھا۔ اول تو اس زمانے میں کوئی ایسا سین آتا ہی نہیں تھا کہ دیکھ کر شرم آئے اور اگر ایسے کوئی الفاظ آجاتے جو مناسب نہیں ہوتے تھے تو ہم خود ہی اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ آج کل ماں' باپ اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور بچے اس سین کو بدلتے بھی نہیں۔ ریموٹ کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔

میرا مشن کہہ لیں یا میری کوشش کہ میں بچیوں کو 60ء کی دہائی میں لانا چاہ رہی ہوں' جب ہم بڑوں کا لحاظ کرتے تھے' ادب کرتے تھے' جب نانی' دادی ہمارے گھر آتی تھیں اور ہم انہیں اپنے پاس زبردستی روکتے تھے کہ آپ ہمارے پاس رہیں گی... مگر آج کوئی ہمارے گھر آتا ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ کیوں آگئے۔ اس وقت کیوں آئے ہیں' کھانے میں اگر بڑا یا کوئی اچھا کھانا بازار سے منگوایا ہے تو جلدی سے چھپا دیتے ہیں کہ یہ چلے جائیں گے تو پھر کھائیں گے... تو خود سوچیے کہ ہم نے اپنے بچوں کو کیا سکھایا ہے۔

گزرے زمانے میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ رشتے بتائے جاتے تھے کہ یہ ماموں ہیں' یہ چاچو ہیں' یہ پھوپھی ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ محبتیں تھیں' آج کل تو کوئی چچا' ماموں کا رشتہ نہیں ہے۔

شب معراج کے دن میں نے بچیوں سے پوچھا کہ آج کون سا دن ہے' کہنے لگیں "آج بدھ ہے۔" میں نے کہا' میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ کون سا بڑا دن ہے تو بتایا کہ شب معراج کا دن ہے۔

میں نے پوچھا اس شب کو کیا ہوا تھا' تو سوائے ایک بچی کے کسی کو اس کا جواب نہیں معلوم تھا اور یہ بچیاں پندرہ سال کی عمر کی تھیں۔"

"بالکل ٹھیک... مگر میڈیا کے ذریعے' پرنٹ میڈیا کے ذریعے اور کمپیوٹر' انٹرنیٹ کے ذریعے نوجوان نسل نے سیکھا بھی تو بہت کچھ ہے۔"

"ہر چیز کے فائدے اور نقصانات تو ہوتے ہی ہیں۔ کمپیوٹر پہ بیٹھے ہیں تو بیٹھے ہی رہ گئے' کب نماز کا ٹائم ہوا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ مجھے اپنے بیٹوں پہ فخر ہے' میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ سود یا لون کا کام نہیں کرنا چاہیے تو پہلے اس نے تھوڑا اختلاف کیا مگر پھر میری بات مان گیا' آج اپنے بیٹے کو دیکھ کر مجھے فخر ہوتا ہے' نہ وہ سود پہ کام کررہا ہے' نہ لون پہ... پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ دو بیٹوں کا باپ ہے' اور جب میں اس کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ میں نے زندگی میں یقیناً" کوئی نیکی کی ہوگی جو میرے کام آئی ہے۔ اگر آپ کی اولاد نیک نہیں ہے تو سمجھیں آپ میں خامی ہے۔"

"لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ ہماری نسل دوسری دنیا کے ساتھ چل رہی ہے۔"

"یہ غلط ہے... ہم تو دوسری دنیا سے بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ ہم تو گھروں سے نکل کر روڈ پر بیٹھے ہیں ہمارے ملک میں لائٹ نہیں ہے اور جب لائٹ نہیں ہوگی' آپ کا دماغ کیا کام کرے گا۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی سزائیں ہیں۔ ہم غلطیاں کر رہے ہیں' یہ تو کچھ نیک لوگوں کی وجہ سے پاکستان محفوظ ہے جب ہم مدینہ گئے تو دیکھا کہ وہاں افطار کے وقت نہ سموسے تھے' نہ پکوڑے تھے' نہ کچھ اور لوازمات' صرف کھجور' دہی' روٹی (جو دہی کے ساتھ کھائی ہوتی ہے۔) اور قہوہ۔ اتنا سکون کا روزہ تھا کہ کیا بتاؤں... تو میں یہ ہی کہتی ہوں کہ آپ "مدینے کا روزہ" رکھیں اور عبادت میں دل لگائیں۔

آج کل ماحول غصے والا ماحول ہوگیا ہے۔ آپ اگر ہلکا کھانا کھائیں تو آپ کا غصہ بھی ہلکا ہوجائے گا۔ گوشت کھا کھا کر غصہ تیز ہوجاتا ہے۔"

"ہماری نسل ہمیں ہی فالو کرتی ہے' ملک کے حالات دیکھ کر اور بنیادی سہولتیں نہ پا کر جب ہمیں غصہ آئے گا تو جو بڑھتی عمر کے بچے ہیں ہم نہیں بھی غصہ آئے گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہمارے یہاں تو یہ سکھایا جاتا ہے کہ جب کھانے کی ٹیبل پر بیٹھیں تو سیاست اور مذہب پر ڈسکس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ سب کو غصہ آتا ہے اور لڑائی ہوجاتی ہے۔ ہمیشہ سب ایک ساتھ مل کر کھائیں تو برکت ہوتی ہے۔

ایک بچی جو تقریباً" 24 سال کی ہے اور اس جیسی کئی بچیاں ہیں جو کہتی ہیں کہ ہمیں تو یاد ہی نہیں کہ ہم نے کبھی اپنے والدین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہو' والدہ بھی مصروف رہتی ہیں اور والد بھی۔ تو پھر ایسی لڑکیاں نہ اپنے ساس' سسر کی عزت کرپاتی ہیں اور نہ ہی اپنے شوہر کی۔"

"یہ مسائل تو ورکنگ کلاس کے لوگوں کے ہیں' جو غریب اور متوسط طبقے کے لوگ ہیں' ان میں ابھی بھی محبتیں پائی جاتی ہیں اور سب مل جل کر بھی رہتے ہیں۔"

"لیکن ان لوگوں پر بھی فرق پڑتا ہے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی تبدیلی آئی ہے۔ میری تو خیر بیٹی نہیں ہے' لیکن اگر میری بیٹی ہوتی تو نہ میں اس کو زیادہ پڑھاتی نہ جاب کرنے کی اجازت دیتی۔"

"ارے یہ تو آپ غلط کہہ رہی ہیں' لڑکیوں کو ضرور پڑھنا چاہیے اور جاب بھی کرنا چاہیے۔"

"نہیں' لڑکیاں ایک حد تک پڑھیں۔ جو لڑکیاں زیادہ پڑھ جاتی ہیں وہ شوہروں کی عزت نہیں کرتیں... ہمارے یہاں طلاقیں کیوں زیادہ ہورہی ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکیاں کما رہی ہیں اور لڑکوں سے زیادہ کما رہی ہیں تو اور یوں وہ اپنے شوہر کی عزت نہیں کرتیں۔"

"اس کی بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں اور آج کے دور میں اس قدر مہنگائی ہوگئی ہے کہ گھر کے ہر فرد کا کام کرنا ضروری ہوگیا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں... مگر کمائی میں برکت نہیں رہی' کیونکہ ہم نے اپنی خواہشات بڑھالی ہیں۔ ٹھیک ہے میں نے خود بہت کام کیا ہے' لیکن میں اب خود یہ کہتی ہوں کہ لڑکی کو نہیں کمانا چاہیے۔ عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس میں غصہ آجاتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو وقت نہیں دے سکتی' اپنے ماں باپ کو وہ محبت نہیں دے سکتی جو اس کا حق ہے' آپ کو پتا ہے کہ لڑکیاں کس کس غلط انداز میں کما رہی ہیں۔"

"آپ خود بھی ایک عرصے سے کما رہی ہیں' جو غلط انداز میں کما رہی ہیں' وہ غلط ہیں۔ لیکن سب لڑکیوں کے لیے کہنا کہ انہیں کمانا نہیں چاہیے۔ یہ آپ غلط کہہ رہی ہیں۔"

"میں نے اگر کمایا تو اپنی اقدار دیکھیں' مجھے پتا ہے کہ مجھے کہاں تک کھڑا ہونا ہے' میرے میاں کی پسند' ناپسند کیا ہے اور شرم و حیا کیا چیز ہے' ان سب کو دیکھ کر میں چلی ہوں۔ میں کمانے کے چکر میں پاگل نہیں ہوگئی۔ آج کل سب پیسہ کمانے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ اس پیسے میں برکت نہیں رہی ہے۔"

"میڈیا بھی تو قصوروار ہے اس میں۔"

"نہیں۔ میڈیا کا کوئی قصور نہیں' سارا قصور انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس زمانے میں' میں پروگرام "یوٹ لک" کیا کرتی تھی میں سر پر دوپٹہ نہیں

یتی تھی۔ پھر جب مجھ میں Change آیا تو میں نے اپنے سر کو ڈھانپنا شروع کر دیا تو پروگرام کے ڈائریکٹر نے کہا کہ مجھے یہ انداز نہیں چاہیے۔ مجھے سر پہ دوپٹہ نہیں چاہیے۔ مجھے گلیمرس لوگ چاہئیں۔ میں نے کہا کہ میں اسی طرح کروں گی پروگرام ورنہ نہیں کروں گی۔"

"آپ میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟"

"میرے گھر کا ماحول بہت ماڈرن تھا' بالکل آج کل کے دور کی طرح... اور جو آج میرا ماحول ہے' یہ ماحول ہمیشہ سے میری امی کا ہے' لیکن جب انسان کی اصلاح ہونا ہوتی ہے تو اللہ خود بہ خود وسیلہ پیدا کر دیتا ہے۔ ہوا یوں کہ میرے گھر میں زہرہ آپا نے درس دینا شروع کیا اور پھر جب میں نے ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے یہاں جانا شروع کیا اور جب سر پہ دوپٹہ کے بارے میں پڑھا اور سنا تو بس میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ مجھے سر پہ دوپٹہ اوڑھنا ہے اور جب میں نے اوڑھا اور ایک ماڈرن شادی میں سر پر دوپٹہ اوڑھ کر گئی تو میرے میاں نے بھی دبے دبے لفظوں میں اعتراض کیا... مگر میں نے سوچا کہ اللہ کو راضی کروں یا دنیا کو... خیر میں پہن کر چلی گئی اور جب میں شادی سے واپس آئی تو مجھے لگا کہ میں نے کچھ کیا ہے' مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے اپنے اللہ کو راضی کیا ہے۔ اس دن سے آج تک میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ میں نے اسٹرونگ بننا ہے اور اپنے اللہ کو راضی بھی رکھنا ہے۔"

"آپ بھی پہلے ماڈرن تھیں پھر آپ میں تبدیلی آئی تو آج کی نسل کو بھی اپنے بزرگوں سے یہ ہی اختلاف ہے کہ آپ نے اپنے دور میں تو سب کچھ کر لیا اور جب ہمارا وقت آیا تو آپ ہمیں منع کرتی ہیں کہ ایسا نہ کرو' ویسا نہ کرو۔"

"ہاں... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن اس وقت ہمیں اتنا شعور نہیں تھا۔ ہم نے وہ ہی کچھ کیا جو ہم نے اپنی ماں کو کرتے دیکھا۔ یہ نہیں کہا کہ یہ کرو' وہ کرو' سسرال جانا تو ایسا کرنا۔ تو ہم تو اپنے بچوں کو سمجھا رہے ہیں یہ کرو' یہ نہ کرو اور بولنے سے نہیں دیکھ کر تبدیلی زیادہ آتی ہے' ہم تو اپنی ماں کی نگاہ کو آج بھی پہچانتے ہیں کہ ان میں غصہ ہے یا محبت ہے۔ مگر آج کل کے بچے ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔

میں آپ کو بتاؤں کہ میرا ایک بیٹا "دبئی" میں ہوتا ہے اور ایک "ملائیشیا" میں اور ایک بیٹا "خسرو" یہاں رہتا ہے۔ وہ الگ رہتا ہے اپنی فیملی کے ساتھ۔ میری امی میرے گھر سے اگلی ہی گلی میں رہتی ہیں... اب دیکھیں کہ میں نے اپنی سوچ کو کیسے بدلا... خسرو روز آتا ہے اور فون پر سلام دعا بھی کرتا ہے' اگر دو دن نہیں آتا اور میں سوچوں کہ آج خسرو نہیں آیا' بیوی نہیں آئی اس کی تو مجھے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا میں روز اپنی امی کے گھر جاتی ہوں؟ تو جیسے ہی میں یہ سوچتی ہوں نگیٹو سوچ میرے دماغ سے نکل جاتی ہے اور ایسا سوچ کر میرے دل میں اپنی بہو کے لیے کوئی برائی جنم نہیں لیتی۔ اگر آپ نے اپنے اندر چینج لانا ہے تو سب سے پہلے اپنی برائیوں پر نظر ڈالنی ہوگی' تب ہی آپ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔

کچھ دن پہلے میں اپنی امی کے گھر گئی تو میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ تم آئے نہیں' میرے میاں کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا تو ہنس کے کہنے لگا میری ملاقات ہو گئی تھی۔ پھر جب گھر آئی تو نماز سے فارغ ہو کر میرے دل میں خیال آیا کہ وہ مجھے کیوں پوچھے' وہ کیوں آئے' میں بڑی ہوں تو مجھے ہی اسے پوچھنا چاہیے۔"

"یہ ہی فلسفہ ہونا چاہیے زندگی کا اگر ہم شکوہ شکایت کو اپنی زندگی سے نکال دیں تو زندگی نہایت آسان ہو جائے۔"

"جی بالکل۔ بس اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیکی کرنے کی توفیق دے۔ (آمین) اور اللہ ان ہی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے' جو ہدایت لینا چاہتے ہیں۔"

ناہید انصاری صاحبہ سے اور بھی بہت سی باتیں ہوئی' مگر جگہ کی کمی کی وجہ سے سب کچھ نہیں لکھ پائے' جو باتیں رہ گئی ہیں' وہ ان شاء اللہ شعاع کے سلسلے دستک میں لکھوں گی... عنقریب۔

☼

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کرپاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کرکے اتنا کمالیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہوجائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے۔ جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی

علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسرل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲۳
تیئسویں قسط

"تم خوش ہو ثریا؟" اس کی آواز قدرے تیز اور جھنجلائی ہوئی تھی۔

"نہیں" اس نے رسان سے کہا۔ "عجیب جگہ ہے یہ دنیا بھی، یہاں محض سمجھوتے ہیں، شادیاں نہیں ہوتیں۔"

"مجھے اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔" اس نے ناک سکیڑی۔

"مجھے تو آخر کار سمجھوتہ ہی کرنا تھا، سوچا چلو بابا کی قیمت پر کرلوں۔ تم ہمیں نہیں جانتیں۔ ہمیں بہت سی آزادیاں حاصل ہیں۔ پڑھنے کی، دوست بنانے کی۔ اپنی مرضی سے کہیں آنے جانے کی۔ لیکن شادی ایک بزنس ہے۔ مالی نقصان اس میں برداشت نہیں کیا جاتا۔ اسٹیٹس بھی داؤ پر نہیں لگایا جاتا۔ اس کے سوا آپ سب کچھ ہار سکتے ہیں۔"

"کچھ عرصہ پہلے یہی بات تقریباً" ان ہی لفظوں میں ابا نے بھی کہی تھی تمہارے بارے میں۔"

"ہاں وہ بہت دور تک دیکھ لیتے ہیں۔ ماضی میں بھی۔ مستقبل میں بھی، اتنا پڑھا اور اتنا پڑھایا۔ اتنا لکھا، اتنا درس دیا۔ لیکن فائدہ۔ تبدیلی تو وہ ہم میں سے کسی کی زندگی میں نہیں لاسکے۔"

لمحے بھر کو عبیر کو اذیت سی ہوئی۔ تو گویا ابا ثریا کے بھی مجرم تھے۔ وہ ہم سب کو یا کم از کم ان کو اپنا مجرم سمجھتی ضرور تھی۔ وہ کس کس کے مجرم تھے آخر؟

نعیم ملک کے، ثریا کے، قوم کے۔ سر عباس بنام اسٹیٹ۔

اپنے طور پر تو وہ سب سے الگ تھلگ اپنی خاموش زندگی بسر کررہے تھے۔

"صرف عورت مجبور ہے یا من حیث القوم ہم سب ہی مجبور ہیں۔ عورت کی مجبوری تو شکست کا بڑا گھسا پٹا

اعتراف ہے۔ ہماری جون آف آرک کے زمانے میں شاید عورت مجبور تھی۔ اب بہرکیف نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے، اب تم مجھے گھر چھوڑنے کی بات کرو۔ اماں کا میسج آیا ہے وہ تمہارے ساتھ میرے یوں اٹھ کر چلے آنے پر فکر مند ہو رہی ہیں۔"

اس نے بڑی رغبت سے کھاتے لمحے بھر کے لیے آنکھیں عبیو کی طرف اٹھائیں۔

"یوں اٹھ کر آنے پر فکر مند ہیں یا میرے ساتھ آنے پر۔؟"

"تم تنویر کی طرح وہمی ہوتی جارہی ہو ثریا! اس کو سمجھ داری اور عقل مندی کے اتنے ایوارڈ ملے کہ اسے یقین ہوگیا کہ وہ جو کچھ کرتی ہے، درست کرتی ہے۔ اس لیے اس کو گمان ہی نہیں تھا کہ کوئی غلط فیصلہ بھی اس سے ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی من مانی کی اور دکھ اٹھائے۔ تم نے ہتھیار ڈال دیے اور ویسا ہی دکھ اٹھایا۔ ہتھیار تم دونوں نے ڈالے تھے۔ ایک نے فیوڈل کی طرح، دوسرے نے مڈل کلاسیے کی مانند۔ یاد رکھو ثریا! یہ چھوٹے چھوٹے وہم کس وقت دیوانگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اندازہ بھی نہیں ہوپاتا۔ اب چلا جائے"

"ایک بات کہوں۔" اس نے بھاپ اٹھتی تندوری روٹی کا تھوڑا سا ٹکڑا توڑا۔

"کبھی خود کو اس دیوانگی میں ڈبو کر دیکھو جیسے میں یہ نوالہ شوربے میں تر کرتی ہوں۔ دانش کی زندگی تو گزار لی۔ میں نے اور تنویر نے تمہارے بقول، سچ یہ ہے کہ ہم سب سے غلط فیصلے ہوئے یا کروائے گئے لیکن تم ذرا دیر کو اس پاسبان عقل کو چھوڑ کر تو دیکھو۔ تم خود ہر وقت کیا غلط ہے اور کیا درست ہے کہ چکر میں گھن چکر بنی ہوئی ہو۔ اپنے پرے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹاؤ۔ شاید اندر سے کچھ اچھا نکل آئے۔"

"اندر سے کیا اچھا نکلے گا؟" اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

"فاروق احمد۔"

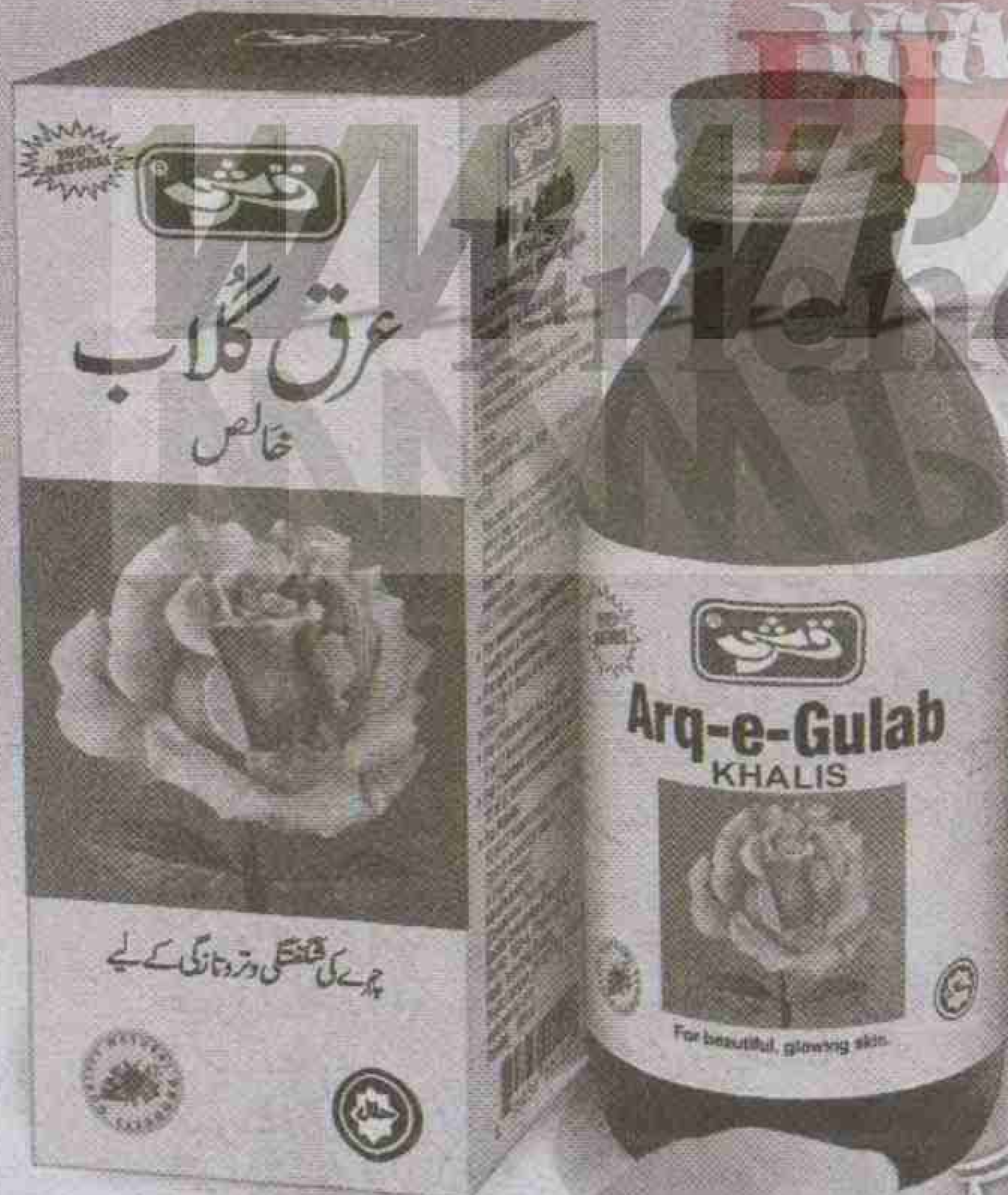
دیواروں پر آویزاں اسینگ، فرش پر بچھی کھال، کانچ کا جھولتا ہوا فانوس، زمین، آسمان، لمحے بھر کے لیے اسے لگا سب اس پر اوندھے منہ آگرے ہیں اور کرچی کرچی ہو کر اسے لہولہان کیے دے رہے ہیں۔ کتنی دیر وہ سناٹے میں رہی۔ لیکن وہ اس کو زخم دیے جانے سے بے نیاز اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

"اس دن آپائی کی برتھ ڈے پر جب رضا ایک اجنبی شخص کو اندر لے آیا تو تم کچن میں جمال بھائی کی چائے گرم کرنے گئی ہوئی تھیں وہ میری اس شخص سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ ہم یوں سر راہ اکثر لوگوں سے ملتے ہیں، وہ ہم پر اپنا نشان بھی نہیں چھوڑتے اور اصولاً "ہمیں انہیں بھول جانا چاہیے۔ لیکن میرے اندر کسی نے کہا۔ اس کا یہاں آنا محض ایک اتفاق نہیں اور کتنی عجیب بات ہے اس ایک کے بعد کتنی ہی مرتبہ اس کا ذکر میرے راستے میں آیا حالانکہ نہ وہ شاہ رخ تھا نہ شاہد آفریدی۔"

وہ کچھ دیر کو چپ رہی۔

"پھر جب اس نے میری ambi tions پوچھیں۔۔۔ ان دنوں میں خاصی بے وقوف ہوتی تھی۔ میری معراج ہی ایک آرٹ فلم تھی۔ اس نے پوچھا تھا۔ "بس! یا اس سے اوپر کچھ اور بھی ہے؟" تب میں نے پہلی دفعہ اس کو غور سے دیکھا۔ اسے کیسے اندازہ ہوا کہ یہ کسی خواہش کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ شاید خواہشوں کی انتہا ہوتی ہی نہیں۔

جب سوال جواب کی باری تمہاری آئی تو تم بے نیازی سے ٹرالی گھسیٹ کر کچن کی طرف جارہی تھیں۔ یہ دوسرا اتفاق تھا کہ وہ پھر میری نظروں کے فوکس میں تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو خشک مٹی کی طرح تڑخ تڑخ کر ٹوٹتے دیکھا۔ وہ گستاخ نہیں تھا کہ تمہارے چہرے کی طرف دیکھتا لیکن اس کی نظریں تمہارے اٹھتے اور لحظہ لحظہ دور ہوتے قدموں کے تعاقب میں ساتھ ساتھ زمین پر رینگ رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں مایوسی اور دکھ کی ایک



انتہا دکھائی دیتی تھی۔ کتنی شدت سے میرا جی چاہا۔ اس سے پوچھوں "بس یہی یا اس سے اوپر کچھ اور بھی ہے۔"

وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"تم بڑی خوش نصیب ہو عبیر۔ تمہارے دروازے سے اندر داخل ہونے والا ہر فرد تم سے محبت کرتا ہے۔ وہ دوست ہو یا عزیز' رشتے دار ہے یا تمہارا بھائی۔ اس دن مجھے تم سے بہت حسد ہوا۔ اور مجھے یقین آگیا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ یہ نہ اس سے آگے کچھ اور..... مجھے لگا یہ وحشی مرغابی کا تعاقب تھا۔ میں نے علیحدگی پر دستخط کیے Attestation کی مہر لگائی اور تم لوگوں کی زندگی سے نکل آئی۔ تمہیں اندازہ نہیں' یک طرفہ محبت کتنا آزار پہنچاتی ہے۔ اب میرے پاس ایسا کچھ نہیں۔ جب بڑھاپے میں میری بصارت ختم ہو رہی ہو۔ یاد آئے تو چراغاں کر دے۔

چلو ڈرائیور سے کہتی ہوں۔ تمہیں چھوڑ دے گا۔ آج میں کتنا بولی ہوں عبیر! لگتا ہے اب بول بول کر ہلکی پھلکی ہوگئی ہوں۔ اتنا عرصہ ہوا' کسی اپنے کی تو کیا میں اپنی آواز سننے کو بھی ترس گئی تھی۔ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میرے ہزبینڈ سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں کسی دن لاؤں گی اس کو تم سے ملوانے۔"

وہ گھر سے باہر نکلے۔ بستی ان کے قدموں میں بچھی ہوئی تھی یا شاید نشیب میں ہونے کی وجہ سے ایسا محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ کھیت' درخت' پودے سب اپنی جگہ جیسے دم بخود تھے۔ کہیں دور کھیتوں میں چری کی فصل کے اوپر جگنو ایک جھرمٹ میں ٹمٹما رہے تھے۔ کبھی جلتے تھے کبھی بجھ جاتے۔ بچپن میں لارنس گارڈن میں جگنوؤں کا ایسا ہی میلہ لگتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ جگنو بھی ڈائنوسارز کی طرح معدوم ہو گئے یا شاید نقل مکانی کر کے اس بستی میں آ آباد ہوئے۔ دور کنوئیں کی منڈیر پر دھوئیں سے بھری ہوئی چمنی والی لالٹین میں چرخی اور ڈول کھینچتی اس عورت کا طویل سایہ بڑی بھیانک شکل بنا رہا تھا۔ کھیتوں میں دیے جانے والے پانی کی خاموش سرسراہٹ اور نزدیک بستی کسی کی قلقل۔ کنوئیں اور کھیتوں سے پرے بستی پر رات اتر رہی تھی۔

رات۔ جس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

دیہات کے دن اور رات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ دن سورج کی روشنی میں دمکتا اور دھوپ کی حدت سے جھلستا ہوا۔ لیکن رات گھور اندھیری نہ لمبے لمبے لیمپ پوسٹ' نہ بجلی کے کھمبے' نہ کمپنیوں کے چمکتے اشتہار۔ دور سے نظر آتی جی ٹی روڈ پر رواں ٹریفک کی بھاگتی بتیوں کو دیکھ کر لگتا تھا' دنیا ابھی آباد ہے۔ یہ زمانہ قبل از مسیح نہیں۔

چھوٹے چھوٹے کمروں اور بڑے بڑے صحنوں والے گھروں کی چھتوں پر اندھیرے میں چارپائیوں پر بیٹھے یا لیٹے لوگ ہاتھ کی پنکھیاں جھل رہے تھے۔ منظر کہیں بھی واضح نہیں تھے۔ سب کچھ سایوں کی طرح ڈول رہا تھا۔ یہ مختصر سے کمروں کی چھت تھی۔ اس سے کہیں مختصر جتنا ثریا کا کمرہ تھا اور ثریا کا اپنا کمرہ اس سے کم تر جسامت کا جتنا آپا کا تھا۔ گھروں کے بھی پروٹوکول ہیں بڑے افسروں کی بڑی میز۔ بڑی بیگم کا بڑا کمرہ۔ بڑے لوگ' بڑی باتیں۔ بستی کے تقریباً" سب ہی گھروں کا حلیہ ایک جیسا تھا۔ ایک ایک دو دو کمرے جن کے دروازے براہ راست صحن میں کھلتے تھے۔ دیواروں کے اوپر ایک زرد رنگ کا۔ وولٹیج کا بلب' فضا میں چھائے سناٹوں میں جیسے اضافہ کر رہا تھا۔ ایک ایک مدھم بلب کے سوا ہر طرف تاریکی تھی۔

راتیں جن میں چاند بھی غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی گھر سے آتی محدود روشنی کی بچی کھچی کرن بوڑھے برگد پر پڑتی۔ اب تو جیسے اسے بھی درختوں کی آخری پھننگ پر گھوڑے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ بھلے وقت بستی سے گزر آئے۔ اگر اب پیدل چلتی جاتی تو ضرور اس جوہڑ میں غرق ہو جاتی جواب ایک تاریک تر رقبے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ راستے مکان' جھاڑیاں اور بستی کی واحد دوکان جہاں پیر مکوڑے والا مٹی کا باوا'

بے رنگ جلیبیاں تل رہا تھا، آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ ایک سیاہ مٹیالے شائبہ کے سوا کسی چیز کا الگ الگ سرا نہیں ملتا تھا۔ کہاں کوئی حد ختم ہوتی ہے۔ جہاں سے دوسری شروع ہو۔ کوئی ابتدا ہے نہ آخر۔

ثریا اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ اسے رنج ہوا اس نے بے وجہ اسے دکھی کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب اس کے کسی نہ کسی دکھ کا سبب ضرور تھے۔ فضا مینڈک، جھینگروں اور ٹڈوں کے شور سے وحشت زدہ تھی۔ عجیب غیر مرئی آوازیں۔ جن سے کان مانوس نہیں تھے۔

"تمہیں سارا حق یاد ہیں؟ وہ میرے شوہر کی بہت عزیز دوست ہیں۔ ہر وقت کا آنا جانا۔ خاصی بے تکلف خاتون ہیں اور بد مزاج بھی۔ مجھے کوئی خاص خاطر میں نہیں لاتیں کیونکہ اپنے معیار کا نہیں سمجھتیں۔ وہ ایسی ہاؤس وائف کے سخت خلاف ہیں جو اپنا گھر آباد کیے بیٹھی ہو۔"

کار کی طرف جاتے جاتے عبیو کی نظر پڑی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ وہی دن والا بوڑھا ذرا دور ہاتھ میں پوٹلی لیے گھر کے کسی ملازم کے آگے گھگھیا رہا تھا۔ ان کو گھر سے نکلتا دیکھ کر جیسے ملازم کی قید سے آزاد، وہ خوشی سے ان کی طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک بیگ میں دیسی انڈے اور دوسرے ہاتھ میں چاٹی کے مکھن کا تازہ پیڑا تھا جس میں سے لسی کا پانی رس رس کے ٹپک رہا تھا۔

مالکان کے در پر اپنا حق مانگنے کے لیے بھی ڈالیاں لے کر آنا۔ ایک روایت رہی ہے۔ انگریزوں نوابوں مغلوں اور اس سے پیچھے تک کا ہندوستان ہمیشہ آقاؤں کے در پر جھکا ہی رہا ہے۔

"چاچا! دوڑ جا۔ مارا جائے گا مفت میں۔" واچ مین بڑبڑایا۔

"نئی بہو کی مہمان کے لیے سوغات لایا ہوں۔ دیہاتیوں کا تحفہ ہے۔ کچھ مانگنے تو نہیں دینے آیا ہوں۔"

"دے کر بھی تو مانگے گا ہی نا چاچا۔"

دروازے سے اندر بکھرتی بہلکتی توجہ کی بھیک مانگتی نئی بہو کا طنطنہ باہر نکلتے ہی ابل آیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے جو اس کا "اندر" باہر نکلا تھا۔ نخوت کے پردے میں پھر ڈوب گیا۔

"انڈے ہیں۔ مکھن ہے اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ انڈے مکھن آپ رکھ لو۔ گڑ میری بیٹی کو پہنچا دینا۔" وہ لجاجت سے ابھی تک ہاتھ مسل رہا تھا۔

"ہمیں کیا پتہ تمہاری بیٹی کہاں ہے؟" ان ہی میں سے کسی نے چمک کر کہا۔

ایک بے کس آدمی کے آگے اس بے مہری سے ان سب کے جھنجلانے کی وجہ عبیو کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"چل نا چاچا، بولا بھی تجھے۔"

دربان، مالکوں کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے اسے بازو سے گھسیٹنے لگا۔ وہ آسانی سے گھسیٹا نہیں جا تا تھا۔ بار بار وحشت سے بازو چھڑاتے کچھ بے معنی سے جملے بولتے، وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

"معاف کریں بی بی! جب کوئی شہر سے آتا ہے یہ اسی طرح کرتا ہے۔ اس کو اپنا پتہ نہیں ہوتا۔ سائیں ہے نا بی بی۔"

"تم تو سائیں نہیں ہونا۔" نئی بہو نے تلخی سے کہا۔ "خیال کیا کرو۔"

عبیو کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تھیلیاں پکڑ لیں۔

"ٹھیک ہے چاچا۔ میں پہنچا دوں گی۔ تمہاری بیٹی کو گڑ پسند ہے کیا؟"

عبیو نے ذرا ہچکچاتے، پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ باہر نکال لیا۔

"نہ جی!" چاچا بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹا "میں بڑے گھروں سے پیسے نہیں لیتا۔"

"لے لے چاچا!" کسی ملازم نے عبیو کے ہاتھ سے نوٹ پکڑا۔ "بیٹی نے بھیجے ہیں شہر سے۔"

جانے کیسا لطیفہ تھا یا ان کی آنکھوں میں پاگل کے لیے محض تمسخر ہی تھا۔ آس پاس کھڑے سب کے سب قہقہے لگانے لگے۔

نوٹ ملازم کے ہاتھ میں رہ گیا۔ چاچا الٹے قدموں پلٹ گیا۔

"کیا بد تمیزی ہے۔؟" ثریا کی جیسے برداشت جواب دے گئی۔ وہ زور سے دھاڑی۔

"کیوں مذاق بناتے ہو اس کا اور یہاں کیوں میلہ لگا کے کھڑے ہو۔ اپنے اپنے کوارٹروں میں جاؤ۔"

"میں اس کے گھر پہنچا دوں گا۔" ملازم نے ذرا سا سنجیدہ ہو کر نوٹ جیب میں اڑس لیا۔

ڈرائیور گاڑی سرکا کر قریب لے آیا۔ مجمع چھٹ گیا تھا۔

"چاچے کا کیا قصہ ہے ڈرائیور؟"

رات کی تاریکی میں ٹرکوں کے ساتھ بھاگتی گاڑی میں اس نے ٹھہراؤ سے پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں جی۔" اس نے اسی سکون سے کہا۔ "میں تو نیا آیا ہوں۔"

"پھر بھی سنا تو ہوگا۔"

"میں تو اپنی نوکری کرتا ہوں جی۔ نوکری سے ہی فرصت نہیں ملتی، کسی کی کیا سنوں گا۔"

عبیو نے کار کے اندھیرے میں اس کی شکل غور سے دیکھنی چاہی۔ گویا بولنے کا اذن نہیں ان کو۔ کیا نمک حلالی ہے واہ، اور نہیں جانتا کہ جھوٹ اس کے چہرے سے جگر جگر برس رہا تھا۔



رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا، جب غیر متوقع طور پر بیل بجی۔ فون پر سارا حق کا نام جھلملا رہا تھا۔ پتا نہیں کس وقت میں اس نے ان کا نمبر اس کالے ڈبے میں محفوظ کر لیا تھا، فوری طور پر فون اٹھانے کے بجائے وہ کچھ دیر کو بھونچکی سی رہ گئی تھی۔ اس کے ان سے ایسے مراسم تو نہیں تھے کہ وہ یوں اس کو بے وقت فون کر سکتیں۔

جس رات وہ لاش چارپائی پر چھوڑ کر آئی تھی، اس نے ان کا صفحہ ہمیشہ کے لیے پھاڑ کر پھینک دیا تھا، وہ بھی شاید اس کو بہت پسند نہیں کرتی تھیں لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے اس کا تعاقب کبھی نہیں چھوڑا تھا، وہ جلوس نکالنا ہو یا قیصر کی تیمارداری حتیٰ کہ ایک بھاری بھر کم پیکج کے ساتھ ایک نوکری بھی اس کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔

"تم جلدی سو جاتی ہو کیا؟ میں ابھی ابھی ٹرپ سے واپس آئی۔ انڈیا بھی گئی تھی۔ سوچا جو تمہارے لیے لیا ہے تم تک پہنچا دوں۔ کل میری طرف آنا۔"

"میں شاید نہ آسکوں۔ آپ کا شکریہ، آپ نے مجھے یاد کیا لیکن اب میں جاب کر رہی ہوں۔"

"جاب مل گئی؟" ان کی آواز میں ایسی بے یقینی تھی اس کو پھر سے اپنے سفارشی ہونے کا ملال ہونے لگا۔

"کسی اسکول وسکول میں پڑھا رہی ہو کیا؟" وہ اس کو اس کی اوقات جتانا بھی نہیں بھولی تھیں۔

"نہیں۔ کوئی فرم ہے۔"

"کون سی فرم؟"

عبیو کو بڑا عجیب لگا۔ وہ ضرورت کی بات چھوڑ کر غیر متعلقہ پر زیادہ اصرار کر رہی تھیں۔ یوں ہی بے سوچے سمجھے بے زار سے لہجے میں اس نے فرم کا نام بھی بتا دیا۔ سارا حق جیسے دوسرے اینڈ پر یک لخت غائب ہو گئیں۔

ابھی چند دن پہلے ہی وہ پھر خبروں کا محور بنی تھیں۔ نریندر مودی اور بال ٹھاکرے سے ان کے تعلقات یہاں کچھ خاص پسند نہیں کیے گئے تھے۔ انہیں خود کو سیل کرنے کے ڈھنگ بھی آتے تھے۔ جب بھی کچھ عرصے کے لیے وہ منظر سے غائب ہوتیں، خود اپنی ذات سے ایک اسکینڈل منسوب کر لیتیں اور وہ ہر وقت ہی میڈیا فوکس میں ہوتیں

کہ روز روز اور ہر خبر میں آپ کو دیکھتے رہتے لوگ اکتا جاتے ہیں۔ لیکن وہ خود کو بھولنے بھی نہیں دیتیں۔ ان کو بہتیرے ڈھنگ آتے تھے۔ کبھی گھنٹہ بھر کے لیے جیل جا کر غازی ہو گئیں اور کبھی انگلی کٹوا کر شہید، کبھی کسی نازک واقعہ پر اختلافی بیان داغ دیا، جلوس کو لے کر دائیں طرف نکلیں، لوگ ان کے پیچھے دائیں طرف آئے تو فوراً" بائیں طرف مڑ گئیں۔ وہ بھی تنہا۔

پتا نہیں یہ اتنے نمایاں فراڈ کرنے والے لوگوں کو نظر کیوں نہیں آتے۔ عجب ہے کہ اس قسم کے سب فراڈ اب ہیرو ہو گئے ہیں۔

"وہ! کتنی دیر کی طویل خاموشی کے بعد ان کے منہ سے ایک بے معنی سی آواز پھسلی تھی۔

"اصل میں مجھے تم سے کام بھی تھا۔ سوچا تم سے ملاقات کرلوں۔ تو کام ہی بتادوں۔ اگر میری چیز نہیں بھی لینا چاہتیں تو۔ سنڈے آف ہوتا ہے؟"

وہ ان کے کس کام آسکتی ہے۔ اس نے بے زاری سے بستر پر کروٹ بدلی۔

"ضرور سارا۔ لیکن مجھے یہی افسوس ہے کہ آف نہیں ہوتا، شام میں واپسی بھی لیٹ ہوتی ہے۔" اس نے جیسے ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔

"میں تمہیں واپسی پر پک کرلوں گی۔"

انہوں نے قطعیت کے لہجے میں کہا، یہ سارا حق تھیں۔ وہ بند دروازوں پہ دستک نہیں دیتیں تالے توڑ کے نقب لگا لیتی ہیں۔

"اور آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لوں گی اور یہ اچھا پیکیج ہے، تمہیں پسند آئے گا، دیکھ لو۔ میں نے تو اس لیے رات گئے تمہیں فون کیا کہ ٹائم لمٹ لیس ہے، ایمرجنسی ہے، چلو کل ملتے ہیں۔"

اس یقین سے انہوں نے فون رکھا۔ جیسے دونوں طرف کے معاملات کا فیصلہ ان ہی کا حق تھا۔ اور کوئی اختلاف بھی نہیں تھا، وہ یوں ہی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ واقعی اس کی گنتی بھی اچھی نہیں تھی۔ اور اسے بالکل یاد نہیں آیا، زندگی میں کل کتنی دفعہ ان سے ملی تھی۔ تین یا چار۔۔۔ اور کیا وہ ایسا کوئی استحقاق بھی رکھتی تھیں، اور اس کو کوئی خاص پسند بھی نہیں کرتی تھیں۔ اتفاق ہی تھا کہ اس کے سب دوست ان کے بھی دوست تھے، حالانکہ انہوں نے یاری بھی نہیں نبھائی کسی سے۔۔۔ اور یاد کیا تو کسے۔ جس نے انہیں کبھی اوتار کا درجہ نہیں دیا تھا۔



جب آفس سے چھٹی کے وقت وہ اپنی ایک کولیگ کے ہمراہ شٹل سروس اسٹیشن کی طرف مڑنے لگی اور قطعی بھول چکی تھی کہ اس کی طرف سے کوئی وعدہ خود بخود لے لیا گیا تھا تو اس کے راستے میں ایک عظیم الشان گاڑی حائل ہو گئی۔ وہ سرے سے بھول ہی گئی تھی کہ سارا حق واقعی اس کے راستے کا روڑا ثابت ہوں گی۔ غیر متوقع طور پر گاڑی بھی وہ خود چلا رہی تھیں۔ اس سے پہلے اس کی کولیگ کی نظر ان پر پڑی۔

"ارے یہ تو وہی ہیں۔ مشہور خاتون، میں ان کا بہت احترام کرتی ہوں۔ پاکستان ایسے ہی دو چار لوگوں کے دم سے قائم ہے۔"

وہ مرعوبیت کی قائل تھی۔ جو چھوٹی اسکرین پر آجائے وہ ہی ہیرو۔ وہ دروازہ کھول کر مسکراتی نکلیں، اس اطمینان کے ساتھ کہ اب اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

"مجھے ہمیشہ سے خیال تھا۔ دفتر کی ان سیڑھیوں پر ایک دن تم مجھے ضرور ملو گی، وہ کیا شعر ہے خاک اور خمیر والا۔ مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔" وہ الہڑ لڑکیوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسیں۔ اطمینان سے اپنی سیٹ پر واپس بیٹھتے انہوں

نے اس کی کولیگ کے مؤدبانہ سلام کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ جواب دینا تو در کنار وہ اس کے وجود سے ہی بے خبر تھیں۔

"رات ایسا لگا جیسے تم مجھے avoid کر رہی ہو۔ کیا یہ میری Feelings (محسوسات) صحیح ہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

وہ خجل سی ہو گئی۔ کبھی کبھی واقعی اس کے ری ایکشنز ماتھے پر خوش خط لکھے نظر آتے ہیں۔ تھوڑی سی لگی لپٹی بھی معلوم نہیں کیوں اس سے رکھی نہیں جاتی۔

"دراصل میں جاب کے بعد سے میں نے باقی سب مصروفیات تقریباً" چھوڑ ہی دی ہیں۔ نائن ٹو فائیو کام ہے۔"

"یہ تو تم نے مخصوص خود غرض فرد کی سی بات کی۔ ذات کو قوم پر ترجیح تو نہیں دی جا سکتی۔ اگر تمہارے مسئلے حل ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب، ساری قوم کے مسئلے حل ہو گئے۔"

وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہو گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ انڈیا میں بیٹھ کر اسی قوم کے لیے انہوں نے کیا بیان دیا تھا۔ گریبان میں مائیک اٹکا کر اپنے ملک کے بارے میں کیسی کیسی شرمناک باتیں دنیا کو نہیں پہنچائی تھیں۔ اب کس چابک دستی سے الزام کا بوجھ اس پر ڈال دیا تھا۔ وہ بھی خود کو اس وزن تلے دبتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس اکھاڑے کی پرانی پہلوان تھیں۔ مخاطب کو چت دینے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

"سوری۔" اس نے خفت سے کہا۔ "میں کچھ گھریلو مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ آپ بتایئے۔"

"یاد رکھو، ہمیں اپنے ذاتی مسائل سے نکل کر ہی حل نکالنا ہوتا ہے۔ خود کو الجھنوں سے آزاد کرو۔"

انہوں نے نہر پر بھاگتے سروس روڈ کا ٹرن لے کر گاڑی ایک درخت کی چھاؤں تلے روک لی تھی۔

"یہ ایک پبلی کیشن ہے میرے پاس، اس میں کچھ گڑ بڑ ہے۔" انہوں نے پچھلی سیٹ سے اپنا بریف کیس کھولتے ٹائپ کاغذوں کا ایک تھیلا باہر نکالا۔ کار سیاہ سلاخوں والے دیو ہیکل گیٹ سے ذرا آگے رکی کھڑی تھی۔ وہ کاغذوں کے پلندے میں گم تھی۔

"نہر یہاں ہمیشہ سے بہتی آ رہی ہے، کسی زمانے میں یہاں کچی راہداری ہوتی ہو گی۔ یہاں جو عظیم الشان کالونی کا دیو ہیکل آہنی گیٹ ہے کبھی گیہوں کے کھیت ہوتے ہوں گے۔ عین اس جگہ جہاں وہ پیلا مکان ہے، کسی کے کھیتوں کی حد شروع ہوتی ہو گی۔" ساتھ چلتے... سارا حق کی آواز پر ایک اور آواز حاوی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ جیسے خالی کمرے میں آوازیں ٹکراتی اور گونجتی ہیں جن کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے۔

ریسرچ پیپر رنگ برنگی ہائی لائٹس سے روشن تھا۔

"... اپنی ذات سے عشق کوئی اچھی بات نہیں۔"

"الیکشن کا یہ مطلب نہیں کہ انقلاب آ گیا۔ انقلاب تو ابھی آنا ہے۔"

"تمہارے سب ساتھی میدان چھوڑ کر کہاں بھاگ گئے؟" سارا حق جھنجلا گئیں۔ انہیں لگا وہ موجود ہو کر بھی غائب ہے۔

"حمیرا تو ایم فل کر رہی ہے، باقی سب کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"مخصوص موقع پرستی، عارضی طور پر انجمنیں بنائیں۔ محض وقت گزاری، کوئی سنجیدہ سوچ نہیں موجودہ لوگوں میں۔"

انہوں نے بڑبڑا کر کہا "برا وقت آیا اور بھاگ لیے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" وہ جیسے خفا ہو گئی تھیں۔

"میری اپنی بھی کچھ مصروفیات ہیں، آج رات فاروق کے ساتھ میرا ڈنر ہے۔" ہمواری سے دھڑکتے دل نے

بلاوجہ ایک بیٹ غائب کر دی تھی۔

کیا وہ اس قدر کھلی تختی تھی کہ اس کے دماغ کی گونج وہاں تک پہنچ گئی تھی جہاں پردے داری کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

"جانتی ہو نا تم فاروق کو؟ ویسے تمہارا نہ جاننا بہتر تھا۔ میں نے اس کو بھی یہ ہی سمجھایا تھا۔ کیا نام تھا بھلا اس کا۔ تمہاری کزن تھی یا پتہ نہیں دوست؟"

"حمیرا۔ اب بھی اس کا یہی نام ہے۔" اس نے بڑی بشاشت سے جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں... جو... بھی... تو فاروق جب آتا ہے۔ مجھ سے ملے بغیر کبھی نہیں جاتا۔ ایسے ہی کچھ لوگوں نے مجھے اوتار کا درجہ دے رکھا ہے۔ ان میں سے ایک وہ بھی ہے حالانکہ ایسی کیا بات ہے مجھ میں۔"

اس نے اچٹتی سی نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔ انہوں نے خود کو خود بھی اوتار کا درجہ دے رکھا تھا۔ جو انکساری انہوں نے جتائی۔ ان کے ایکسپریشن کے ساتھ چلی نہیں۔

"بات یہ ہے کہ فاروق تھوڑا سا کمینہ ہے لیکن بہرکیف پرانا دوست ہے۔ مجھے پسند ہے۔ پسند مجھے تم بھی ہو چونکہ تم لڑکی ذات ہو، میں تمہارا نقصان نہیں چاہتی۔" انکساری کے بعد دریا دلی۔

"جب وہ لڑکا زخمی ہوا تھا۔ کیا نام تھا بھلا اس کا؟" دریا دلی کے باوجود بجن بے پرواہ۔

"تو مجھے لگا وہ تمہارے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کر رہا۔ فیکٹری کے مالک کا بیٹا خود کچھ بھی نہ کرتا ہو تو بھی شہزادہ ہوتا ہے بلکہ سب خوش حال لوگ عموماً" ایسے ہی ہوتے ہیں۔ "بی کلاس" وہ خود کو اس طبقے میں بریکٹ نہیں کر رہی تھیں۔ جہاں ان کی جڑیں اندر تک گہری اتری ہوئی تھیں۔

"آج کے زمانے میں لڑکیاں اتنی احمق نہیں رہیں کہ وحید مراد تلاش کرتی پھریں، عہدہ، اقتدار، اسٹیٹس سب اہم ہیں۔ وہ خود اپر کلاس سے ہے۔ بڑے عہدے پر فائز ہے، اسی لیے تو لڑکیاں اس پر مرتی ہیں۔ وہ خود بھی اسٹیٹس کانشس ہے اس لیے مڈل کلاس لڑکیاں اس کو خاص پسند نہیں۔ وقت تو گزار لیتا ہے لیکن سنجیدہ کبھی نہیں ہوتا۔ تم نے شاید کبھی غور کیا ہو۔ وہ ہمیشہ مذاق کے موڈ میں رہتا ہے میں بھی اگر اس کی بیک گراؤنڈ کی نہ ہوتی تو کبھی اس کی دوست نہ ہوتی۔ اصل میں وہ ایک مشہور محاورہ ہے۔ "کبوتر کبوتر کے ساتھ اڑتا ہے اور باز باز کے ساتھ۔"

یہ قانون فطرت بھی ہے۔ کبوتر چھلانگ مار کر بھی باز کا ہم سفر ہو گا تو شکار ہو جائے گا۔"

انہوں نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا، اس تک پہنچ بھی رہا تھا یا راہ میں کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔

"لیکن سارا حق! آپ نے یہاں مجھے کسی اور کام سے بلوایا تھا۔ کسی ایمرجنسی کا ذکر بھی کیا تھا۔ مجھے کسی کی ذاتی زندگی سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔؟"

اسے خود بھی لگا، جتنی لاپروائی اس نے دکھانے کی کوشش کی تھی، اس میں اس کی آنکھیں اس کا ساتھ دیتی نظر نہیں آ رہی تھیں اور سارا حق کے چہرے پر کامیابی کی ایک لہر گزری۔

"اوہ ہاں!" وہ یوں چونکیں جیسے اتفاق سے ہی موضوع سے ہٹ گئی ہوں۔ "تمہیں دوبارہ تحریک کا ساتھ دینا چاہیے۔ ملک کو پھر ایک بار تمہاری ضرورت ہے۔ الیکشن، جمہوری حکومت، عدلیہ بحالی سب کا سب پولیٹیکل اسٹنٹ اور ہمیں اس فراڈ سے نجات حاصل کرنا ہے۔"

پہلے وہ اس حکومت کا ساتھ دے کر اسے اقتدار میں لائیں۔ صلے میں ان ڈالروں میں تنخواہ پائی جو لوگوں کو رویوں میں نصیب نہیں ہوتی اور کار میں بند شیشوں میں بیٹھ کر اسی حکومت کو الٹنے کے لیے پھر اس کا استعمال



چاہتی ہیں اور فراڈ سے نجات... کون جانے کہاں کہاں اور کون کون فراڈ نہیں۔

"فی الحال تو میرے لیے نوکری بہت اہم ہے۔ اور میری یہ جاب آزادیٔ نسواں کا کوئی رد سٹرم نہیں۔ گھر کا بجٹ چلانے کے لیے ہم سب کو اپنا اپنا حصہ ڈالنا پڑتا ہے۔"

ان کو اس کی صاف گوئی ہضم نہیں ہوئی۔

"یہی تو کیا اس حکومت نے لوگوں کو روٹی کمانے کے۔ جھنجٹوں میں ڈال کر ہر طرف سے بے فکر کر دیا ہمارا پیٹ بھرتا ہے تو بھلا خیال حکومت ہٹانے کا ہی آتا ہے نہ یہ پیٹ بھرے گا' نہ کوئی ان پر ہاتھ ڈالے گا۔ گھر کا بجٹ ہی چلانا ہو تو جیسا کہ تم نے خود کہا تو ہمارے فرنٹ پر زیادہ آسودگی والی پے ہے۔ اب بھی کہتی ہوں' میرے ساتھ کام کرو۔"

اس نے جواب دینے کے بجائے کھڑکی سے باہر نہر کے دونوں طرف بھاگتی ٹریفک پر نظریں جما دیں۔ آہنی گیٹ تھوڑی دیر کو کھلا اور کسی کار کے اندر جانے کے بعد پھر بند ہو گیا۔ اس نے اپنی توجہ سارا حق سے ہٹانے کی اختیاری کوشش کی۔

"جی ضرور۔" "اگر کبھی ضرورت ہوئی تو ہمیشہ یاد رکھوں گی کہ آپ نے مجھے آفر دی تھی۔"

"ایک بات اور۔" انہوں نے لفظ چبا کر ڈرامائی سا وقفہ دیا۔ "تمہارے آفس میں ایک آدمی اکبر نام کا بھی ہے۔ ذرا اس سے محتاط رہنا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ لیکن میں نے اس پہ بھروسا کبھی نہیں کیا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ مجھے اسے نکالنا پڑا۔ میں تمہیں یہ بھی نہ بتاتی اگر مجھے اندازہ نہ ہوتا کہ تم لوگوں پر بڑی جلدی اعتبار کر لیتی ہو۔ میں تمہارا نقصان نہیں چاہتی۔"

کتنی دیر گاڑی میں سکتہ رہا۔ اور اس سکتے کو توڑنے میں پہل بھی سارا حق نے ہی کی۔

"دیکھو' کسی دن تمہاری اپنے کسی کزن وزن سے شادی ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ ہماری لڑکیوں کی پرواز بھی نہیں۔ میں نے فاروق سے کہا تھا تمہیں بدنام نہ کرے۔ اسپتال کے سامنے ایک نیم اندھیرے بینچ پر بیٹھے تم دونوں کو سب ہی نے دیکھا تھا۔"

عبیر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی اس موضوع سے وہ اس کو آسانی سے فرار ہونے نہیں دیں گی۔

"مگر میں نے سوچا' یہ عارضی فیز ہے۔ ختم ہو جائے گا۔ اور جب اس نے مجھے بتایا کہ اپنے فادر کی فرم میں اس نے تمہیں جاب دلوا دی ہے تو مجھے پریشانی سی ہوئی۔ حالانکہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے' میرا کیا حق بنتا ہے میں اس میں دخل دوں۔"

وہ سن سی ہو گئی۔ ابھی تک اس نے ان کی کہی کسی بات کو مطلق سنجیدگی سے لیا تھا نہ دل پہ۔ جاب دلوانا تو کوئی ایسی بات بھی نہیں لیکن سارا حق کہاں کی کھری تھیں کہ ان کو اس راز میں شامل کیا جانا لازم تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے اپنے آپ کو ان کے سامنے بہت چھوٹا محسوس کیا۔

"چلیے" "آپ فکر مند مت ہوئیے۔" کھولتے ہوئے وجود پر اس نے سکون کے چھینٹے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے گھر سے بھاگنا پڑا تو آپ ہی کے دارالامان میں آؤں گی۔"

انہوں نے اچانک پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں برا لگا؟" اسے ان کا لہجہ بھی سمجھ نہیں آیا۔ وہ خدشوں کا اظہار کر رہی تھیں یا خواہش کا۔

وہ باوجود خواہش کے اس سے کچھ نہیں اگلوا سکی تھیں۔ ان کے بڑبڑاتے ہونٹوں سے عبیر کو بالکل ٹھیک اندازہ ہوا تھا۔ "چالاک لڑکی۔"

"میں تمہیں گھر تک ڈراپ کر دوں یا رکشہ کر لو گی۔" بیزاری سے تیوری چڑھائے وہ اس سے قطعی لاتعلق ہو

چکی تھیں۔

"وہ ہسپتال کے سامنے بہت سے رکشہ کھڑے تو ہیں۔" اس نے ایک نظر ان کی طرف پلٹ کر دیکھا "میں رکشہ لے لوں گی کوئی ضروری نہیں کہ واپسی کا سفر اس سڑک سے ہمیشہ ہی دشوار ہوتا ہو اور شاید آپ کو کوئی کام بھی نہیں تھا لیکن آپ نے جو کچھ کہا میں نے سب گرہ سے باندھ لیا ہے شاید یہ کام تو تھا آپ کو۔"



کیو میں اپنی اپنی ٹرے تھامے چیونٹیوں کی طرح قطار بنائے لوگوں میں وہ بھی شامل تھا۔ لنچ آور کی روز کی اس ڈرل میں اس کو مزا بھی آتا تھا وہ شیشوں میں بند رنگ برنگے کھانوں کے پاس سے گزرتی ان کے نام پڑھتی جاتی "پالک پنیر، فرائی دال، چکن مسالا، ایگ فرائیڈ رائس... لو جی یہ بھی کوئی کامبی نیشن ہوا۔"

اس نے کوفت سے سوچا حالانکہ کوفت کی وجہ شاید یہ نہیں کوئی اور کامبی نیشن تھا۔ ڈائننگ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دیوار پر ٹنگا ٹی وی بھی صرف اسی وقفے میں چلایا جاتا تھا۔ بہت سے ورکر اسکرین والی دیوار کو نیم دائرے کی شکل میں گھیرے، تشویش میں مبتلا تھے، کسی اور جگہ بم بلاسٹ ہوا تھا۔ اب تک کتنے دھماکے ہوئے اور کتنا بے گناہ خون زمین میں جذب ہوا۔ حساب کتاب دھندلا جاتا ہے۔

فسادی چینل تیز تیز آواز میں زوم ان، زوم آوٹ کا ڈرامہ کھیل رہا تھا۔ اینکر دھماکے کی اطلاع چڑھتے ہوئے سانس اور بے ربط لفظوں سے دے رہا تھا جیسے بڑی دور سے بھاگتا آیا تھا۔

حکومت کی تبدیلی کے بعد لوگوں میں آس بندھی تھی شاید یہ حملے بند ہو جائیں گے، دھماکے ختم ہو جائیں گے۔ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے اور لوگ ہنسی خوشی رہا کریں گے۔ لیکن قصہ جاری تھا اور آخری لائن کہیں دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ دکھی چہرے ان حالات پر ناراضی کا اظہار کرتے، کڑھتے جلتے چہرے، مایوسی سے پاکستان کے دن گنتے چہرے، اس کے ارد گرد ان گنت چہرے تھے۔

بے شمار روپ تھے یا شاید ایک ہی چہرہ تھا۔ جو بار بار روپ بدل کر آتا تھا۔ اس کی ٹرے میں کھانے کی پلیٹیں رکھی گئی تھیں۔

اس نے ایک ـــ چھلتی نظر مجمع پر کسی خالی جگہ کی تلاش میں دوڑائی۔ اکبر اعظم دور ایک کونے میں اپنے مخصوص انداز میں، کھانا سامنے رکھے مگر کھانے سے بے نیاز خلاؤں میں نابود تھے۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر مسکرائے، ایسی موہوم سی مسکراہٹ جس پر مسکراہٹ کا بس شبہ ہی ہوتا تھا اور یوں ہی کہیں دور غائب رہے۔

"آپ کھانا نہیں کھا رہے؟" اس نے ان کی پلیٹ میں جھانکا۔ "اچھا نہیں ہے کیا؟"

"میں تو بنیادی طور پر پینڈو آدمی ہوں۔ ذائقہ اتنا اہم نہیں۔ کھانا ہو اور پلیٹ بھر کر ہو۔ اصل میں ابھی ایک چہرے نے میری بھوک غائب کر دی۔"

"تو آپ بھی چہروں سے چھپ کر بیٹھے ہیں؟"

"کوئی چہرہ دھماکے میں دکھایا گیا ہے؟ یہ عجیب لوگ ہیں ان کو منع بھی کیا گیا ہے کہ ڈیڈ باڈیز مت دکھایا کرو۔"

"آپ کی سارا حق سے ملاقات رہتی ہے؟"

یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک اور دھماکا تھا جو اکبر اعظم کی میز پہ ہوا۔ عبیرہ نے لمحے بھر کا وقفہ دیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی نے چمک ماری تھی۔

"نہیں..." پھر وہ اطمینان سے کرسی کھینچ کر ان کے مقابل آبیٹھی۔ "کیوں بھلا...؟"

"ابھی اس دھماکے سے پہلے جب آپ پالک پنیر کے شیشے کے سامنے لوں یا نہ لوں کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔

سارا حق بڑے کروفر سے اپنے کارنامے بیان کر رہی تھیں کہ وہ کن کن مظلوم عورتوں کی زندگی میں روشنیاں بکھیر چکیں اور وہ نہ ہوتیں تو پاکستان کی آدھی عورتیں ظلم کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اتر چکی ہوتیں اور یہ بھی کہ وہ ہیں تو پاکستان ہے۔ اس خودکش بمبار نے ایسا ناوقت چنا، ان کا آدھا جملہ ابھی منہ میں تھا کہ اس نے ان کی ساری بنی کرکری کر دی۔ چینل انہیں بھول کر اس بمبار کے پیچھے لگ گیا۔ پتہ نہیں اب ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں آپ کا تخیل ان کی ذات کے بارے میں مسمار بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن کبھی کبھی جب میں ان کا چہرہ غور سے دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی شکل ویمپائر جیسی لگتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے ابھی انسانی خون کا ایک تازہ گھونٹ بھرا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ بھی میرا پینڈو پن ہو اور وہ تازہ گھونٹ دراصل ان کی شوخ رنگ کی سرخ لپ اسٹک ہو۔"

"اوہ!" اس نے چمچ بھر کر جو چاول اٹھائے تھے ویسے ہی پلیٹ میں واپس ڈال دیے۔ "مجھے بھی زندگی میں ایک دفعہ ہو بہو یوں ہی محسوس ہوا تھا اور میں نے بھی شک کا فائدہ ان کے لاوڈ میک اپ کو ہی دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ان کے بارے میں ہمارے نظریات میں کوئی بنیادی فرق نہیں اور میں اپنی بات آسانی سے کہہ سکتا ہوں۔ آپ کو ایسا نہیں لگتا، وہ بھی ایک اچھی بھلی خودکش بمبار ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ بڑی چالاک بمبار ہیں۔ وہ اس دھماکے میں لوگوں کا خون کر دیتی ہیں۔ لیکن خود صاف بچ نکلتی ہیں۔"

اس نے اسکرین پر نظریں جمائے کہا "بہت زیادہ پرانی بات نہیں جب ہم ایک مشترکہ تحریک کا حصہ تھے۔ لیکن دو مختلف انداز میں۔ میں اس لیے کہ میں محروم طبقے کا نمائندہ تھا وہ اس لیے کہ وہ محروم طبقوں کی لیڈر تھیں۔ انہیں نام کمانا تھا۔ ہم نے حالات بدلنے تھے۔ توقع کے بالکل برخلاف تھوڑے سے وقت میں ہم نے بڑی کامیابی حاصل کی اور اس سے بھی مختصر وقت میں لوگوں کے اصلی چہرے سامنے آ گئے۔ مشرف ہٹاؤ تحریک میں شامل ان لوگوں کی طرف بڑی آس سے دیکھ رہے تھے۔ پل کی پل میں وہ خود مشرف بن گئے۔ کتنا تکلیف دہ تصور ہے جب ایک محروم طبقہ تحریک چلاتا ہے ایلیٹ آپ کے ساتھ خود بخود شامل ہو جاتی ہے بلکہ اپنا پیدائشی حق سمجھ کر اگلی قطاروں میں آ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر وہ لیڈ کرتی آپ کو جہاں جہاں لیے جاتی ہے آپ اس کے پیچھے چلتے جاتے ہیں۔ پھر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو ان کی ذاتی جنگ تھی۔ آپ صرف مہرے تھے۔ حکومت ہٹاتے ہی وہ آپ کو بھی راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ ان کو کرسی ملی، آپ کو کیا ملا؟ حق نہ انصاف۔

میرے گاؤں سے ایک لڑکی اغوا ہو گئی۔ اغوا کی کہانی اردو اخبارات کے قارئین کے لیے ایک کالمی یا کسی آئٹم کے سوا کچھ نہیں لیکن وہ جہاں سے غائب ہوتی ہے۔ وہ گھر ہی نہیں گاؤں کا گاؤں اجڑ جاتا ہے۔ میں ان دنوں نہایت قلیل تنخواہ پر ان کے ساتھ سولہ سولہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اس لیے کہ تنخواہ اہم نہیں تھی۔ ان کے ساتھ کام کرنا بڑا اعزاز تھا۔ میں خود کو بے حیثیت، بے مرتبہ بہت نیچے سے ان کو ایک بڑی پر فخر بلندی پر سر اٹھا کر دیکھتا تھا۔

کورٹ کچہریوں سے مایوس ہو کر میں بڑے مان سے یہ کیس ان کے پاس لے کر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری خاطر وہ ساری دنیا تہہ و بالا کر دیں گی اور مجھے معلوم ہے اس کی برآمدگی ان کے لیے کچھ مشکل نہیں تھی۔ جب کہ یہ بھی پتا ہو کہ وہ کون لوگ تھے جو اسے اٹھا کر لے گئے۔ بے شک، وہ بڑے اثر و رسوخ والے لوگ تھے۔ ہم گاؤں والے بڑی حسرت سے اپنی بستی کے پار اس محل نما گھر کو دیکھتے کہ اس نے ہماری ایک بچی کو ہڑپ کر لیا تھا۔ لیکن ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ الٹا پلٹ پلٹ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی کوستے رہے اور سارا حق کو کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ صرف شور مچانا تھا۔ آواز بلند کرنی تھی۔

میڈیا کا زمانہ ہے۔ بعض اوقات حق مناسب جگہ سے نہ ملے تو میڈیا ہی لے دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی کسی مصلحت کے تحت اس واقعہ کو غیر معمولی طول دیا یہاں تک کہ وہ مناسب وقت آ گیا جس کا ان کو انتظار تھا۔ وہ

ایک لاش اٹھا کر گرجتی برستی رہیں۔ مظلوم گھر کو اس سے کچھ فائدہ پہنچایا نہیں لیکن وہ پار لگ گئیں۔ ایک آدھ شہید تو ہر ایک کو چاہیے ہوتا ہے۔

یہ مارکیٹنگ کا زمانہ ہے۔ کون سا وقت مناسب ہے۔ کس حادثے کے پیش آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ سو کسی کی شہادت سارا حق کا مقدر بدل گئی۔ مرنے والی اور اس کے خاندان کے ساتھ کیا گزری' وہ محض کیڑے مکوڑے ہیں یا وہ سرہیڈ جن کے میناروں پر پاؤں دھرتی وہ اوپر تک جا پہنچی تھیں۔"

اکبر اعظم جیسے اس کرب سے پھر گزر رہے تھے۔ شاید بار بار گزرتے تھے۔ آبلہ پا' راہ کو پر خار دیکھ کر خوش ہوتے۔

"اس قصے کا آخری باب سب سے تکلیف دہ تھا۔ کہ جب الیکشن ہوا۔ وہ لوگ ووٹ کا حکم دینے ہمارے گاؤں آگئے۔ وہ کہیں سے بھی شرمندہ نہیں لگتے تھے۔ اور پورے کا پورا گاؤں بیل گاڑیوں میں لد کر بڑی شادمانی سے ان کو ووٹ دینے چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ لڑکی جو اغوا ہوئی تھی۔ اس کا باپ بھی نہ صرف ووٹ دے کر آیا بلکہ نذرانے کے طور پر اپنا پیٹ کاٹ کر مکھن' دودھ' دہی اور پتہ نہیں کیا کیا ساتھ لیتا گیا جو کمال شفقت فرماتے قبول بھی کر لیا گیا۔ ظلم کی کہانی اتنی قدیم ہے اور ہم اس سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ اب اس میں تبدیلی سے بھی ہم گھبرا جاتے ہیں۔ میں نے منع کیا' ان کے طعنے سہے کہ تم شہری بابو بن گئے ہو۔ گاؤں کے رسم و رواج سے ٹکراتے ہو۔ وہ ظالم آج بھی وہاں دندناتا پھرتا ہے اور میں اپنے ہی گاؤں سے نکال دیا گیا ہوں اور یہ تو کتنی دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ لڑکی جس کے گھر میں قید تھی وہ اور سارا حق ایک دوسرے کے بے حد قریبی دوست تھے۔ جب وہ ہم سے اس کو جلدی ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کرتی تھیں تو اس مظلوم لڑکی کو روز وہاں دیکھتی بھی تھیں اور اس پر ہونے والے ظلم کی واحد چشم دید گواہ بھی۔"

اس کا کھانا سامنے رکھا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بہت دیر تک صرف عبید ہی سے نظریں چرا کر اس نے ہال میں ہر طرف دیکھتے جیسے یہ قصہ بیان کیا تھا۔ پھر جیسے اس کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"میں نہیں جانتا۔ آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا مگر میں نے خود آپ کو ان کی کار میں بیٹھ کر آفس سے جاتے دیکھا تھا۔"

کسی وجہ کے بغیر وہ مجرموں کی صف میں آ کھڑی ہوئی۔ کیا جواب دے۔ گڑبڑا سی گئی کسی باقاعدہ منصوبے کے تحت اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یوں ہی بات مختصر کرنے کے لیے نادانستگی میں غلط بیانی ضرور کی تھی۔

"ہاں' وہ کل آئی تھیں ایک مدت بعد۔ میں خود بھی نہیں سمجھ پائی۔ دراصل وہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔"

"وہ کوئی کام بے سبب نہیں کرتیں۔ اگر وہ آپ سے ملنے آئیں اور کوئی وجہ بھی نہیں تھی تو میں فکر مند ہو گیا ہوں کہ وجہ ہو گی۔ جب تک علم میں آئے گی' وقت ہمارے ہاتھ سے پھسل چکا ہو گا۔ وہ ایسی ہی ماہر نشانہ باز ہیں۔"

"میرا خیال ہے' وہ مجھے دو تین لوگوں سے بدظن کرنے آئی تھیں۔ ان دو تین میں ایک آپ بھی تھے۔ شاید کہیں کوئی تیر ٹھیک بیٹھا بھی۔"

وہ خواہ مخواہ دل گرفتہ سی ہوئی۔

"چھوڑو مغل اعظم! مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہیں وہ۔"

"نہ نہ۔ ان کی ایک بھی ملاقات کسی کو نقصان پہنچائے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور جب وہ تواتر سے کہتی ہیں میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں دیکھنا چاہتی تو گنتی رہو' اتنی ہی مرتبہ وہ تمہیں نقصان پہنچا کر دم لیں گی۔ تمہارا تجربہ نہیں لیکن دنیا میں ایسے اتنے لوگ ہیں کہ آپ چاہو بھی تو ان کی گنتی نہیں کر سکتے۔"

"کوئی بات نہیں مغل اعظم! اس ملاقات کا انجام کوئی بہت برا دکھ نہیں۔ ایک ہلکی سی ٹیس ہے۔ فکر نہیں کرو، وقت کے ساتھ ساتھ جاتی رہے گی۔؟"

"ٹیس جاتی رہے گی یا بدگمانی جاتی رہے گی؟"

عبیر کے چہرے پر ایک طویل مسکراہٹ بکھری لیکن شاید اس کے پاس ابھی اس کا جواب موجود نہیں تھا۔

"دیکھو لڑکی! میرا حق تو نہیں بنتا کہ تمہیں نصیحت کروں لیکن جن جن لوگوں سے انہوں نے تمہیں بدگمان کیا ذرا اس لسٹ پر ایک نظر ضرور ڈالنا۔ اس پر بھی غور کرنا اس لسٹ میں صرف یہی نام کس نیت سے شامل کیے گئے ہیں۔"

وہ بغیر جواب لیے اٹھا، لمحے بھر کو رکا۔

"حالانکہ نام تو انہیں یاد ہی نہیں رہتا۔"

اور پلٹ کر دیکھے بنا نصف دائرہ بنائے ٹی وی کے سامنے کھڑے ناظرین میں جا شامل ہوا۔



"معلوم ہوتا ہے، آپ بہت دنوں سے ایم ڈی کی طرف نہیں گئیں۔" پروین وسایا رکھائی سے تار کھینچ کر بلائنڈز کا رخ موڑتی، کمرہ روشن کرتی بولی۔

"وہ پچھلے کچھ دنوں سے آفس نہیں آئے تھے۔ شاید اسی لیے آپ کو پتہ نہیں چلا کہ وہ بیمار رہے ہیں۔" سورج کی روشنی سیدھی سیدھی لکیروں کی شکل میں فرش پر پڑی چمک رہی تھی۔ عبیر نے فرش سے نظریں اٹھا کر سر بلند کیا تھا اس سر میں، جس کا بوجھ اس سے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔

"کیا ہوا تھا انہیں؟" وہ بیٹھے بیٹھے رک سی گئی۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم میں کون سا حکیم ہوں۔"

"اب؟ اب تو ٹھیک ہیں نا وہ؟"

"آپ خود جا کر کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟"

"پتہ نہیں۔ وہ مصروف ہوں شاید... تمہارا تو جانا بنتا ہے۔ تم ڈیوٹی پر ہو۔ میں جاؤں تو ہو سکتا ہے۔ وہ ڈسٹرب ہوں۔"

"مت جائیے۔" اس نے رکھائی سے کہا "چائے دس بجے لیں گی یا گیارہ۔"

"تم پلیز ان کی طرف جاؤ گی تو ان سے پوچھ آو۔ اگر انہیں فرصت ہو تو میں ان سے مل لوں۔"

واقعی وہ کچھ دن سے ہر طرف سے لاپروا رہی تھی۔ کتنی دفعہ اس کا جی چاہا تھا وہ یہاں سے چلی جائے، غائب ہو جائے کہیں چھپ جائے وہ جب آنکھیں بند کرتی سارا حق چھم سے اس کی آنکھوں میں اتر آتیں۔ سونے کی کوشش کرتی تو ان کے جملے ہتھوڑے کی طرح ٹھک ٹھک کرتے اس کے کانوں سے ٹکرا کر سماعت کو زخمی کیے دیتے تھے۔ فرار کی کوئی راہ بھی ہے۔

"اس وقت وہ کوئی کام نہیں کر رہے۔"

وہ روٹھ کر چلی گئی لیکن شاید زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکی۔ عادتاً ہی مشینی لہجے میں پیغام دے کر وہ پلٹ ہی رہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ ایسا کیا تھا بھلا عبیر عباس کی پلکوں کے پیچھے آنکھوں کی پتلیوں پر تیرنے پانی کی نہیں تہ میں۔

وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔ "میں تو سمجھی تھی آنسو صرف ہماری آنکھوں میں آتے ہیں اور ہم ہی کو حکم ہے کہ ان کو پی جائیں۔" وہ بے رحمی سے اس کے سامنے جم گئی۔ "کس بات پر روتے ہیں آپ لوگ؟"

کوئی غم کین فلم دیکھ کر یا ڈرامے میں کسی کی موت پر۔ دردناک کہانی پڑھ کر۔ یہ خود دکھاوے کے دکھ ہوتے ہیں ناں جی۔ اصلی زندگی میں بالکل بے حیثیت ہوتے ہیں۔"

اگر وہ اتنی ہی ظالم ہو گئی تھی تو کیا ضرورت تھی ان آنسوؤں کی پردہ داری کی۔ عبیر نے پروین وسایا کی سی بے رحمی سے سوچا' جو پتلیوں پہ تیر رہے تھے' اس نے ان کو پلکوں سے ٹپکنے بھی دیا۔

"اور بھی دکھ ہوتے ہیں پروین! ان قصے کہانیوں کے علاوہ۔۔۔ بے جرم سزا پانے کے دکھ۔ بھروسہ ٹوٹ جانے کے دکھ' کسی کو آپ طاق پر رکھ کر عقیدت سے پوجتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے وہ بت نیچے آگرتا ہے اور یہ اتنی سی عمر میں تم نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں۔"

"اتنی سی عمر۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"میری عمر تو حادثات کے حساب سے بدلتی رہتی ہے۔ ایک مرتبہ عدالت میں سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا کہ میں بالغ ہوں اور اپنی من مانی سے فیصلے کرتی ہوں۔ دوسری مرتبہ ثابت کیا گیا کہ کمپنی مجھے ملازم رکھ کے قانون کے خلاف نابالغ بچوں سے مشقت لے رہی ہے' وہ کیا کہتے ہیں۔ چائلڈ لیبر۔ اور سیکھنے کا کیا ہے کچھ بڑے بڑے حادثوں سے سیکھا' کچھ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ رہ کر' ہماری طرف ویسے بھی لوگ پیدا ہی بڑے ہوتے ہیں۔ گاؤں میں بچپن کوئی چیز نہیں ہوتا۔"

پروین کے محنت کش' دھوپ میں جھلسے سانولے چہرے پر ایک رنگ آکر گزرا۔

"ایم ڈی صاحب آپ کو یاد فرما رہے تھے۔" چہرے پر پانی کا چھینٹا ڈال لیں بہت سمجھدار آدمی ہیں۔

عبیر کو اس کے لہجے پر رشک آیا۔ کیسی بے ریا محبت تھی اس کی۔ اصول' خلوص' بلا کی ذہانت وہ ان کو ذرا سا رنجیدہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"میں ابھی ہو کر آتی ہوں۔ تم میرے لیے اچھی سی چائے بناؤ۔ مجھے کسی نے بہت سا لوا دیا تھا۔ دیکھ نہیں کس کو تھا مگر میں تمہارے لیے لے آئی۔ آج ہم دونوں مل کر گڑ والی چائے پئیں گے۔"

ایک پرانے اخبار میں لپٹے گڑ کے بڑے بڑے ڈلے پروین وسایا کے حوالے کرتے جیسے اس کے کاندھوں سے بوجھ اتر گیا۔

"امانت بہ امانتدار رسید۔ کسی کی بھی محروم بیٹی کی طرف پہنچا تو سہی۔"

"کیا باقی سب لوگ ان سے مل آئے ہیں؟"

"انہوں نے سب کو نہیں' آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

"کوئی فائل لے کر جانی ہے؟"

"فائل کا تو کوئی ذکر نہیں تھا۔ اب تو بلائے بھی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

آفس کا منقش دروازہ بند تھا۔ جگمگاتی ناب گھما کر وہ بے دھڑک اندر داخل ہو جانے کی جرات کو اس نے بمشکل روکا۔ اخلاقیات بہر کیف اسے پروین وسایا سے ہی سیکھنی پڑیں گی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آتی قہقہے کی آواز میں اس کی تھپ تھپ ڈوب کر رہ گئی تھی۔ اس کا جی چاہا پلٹ جائے۔ فارغ وہ نہیں تھے بہر کیف۔ اکیلے بیٹھے کر کوئی قہقہے نہیں لگاتا' وہ پلٹ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔

توقع کے بالکل برعکس وہ اس کے مقابل تھا۔ وہ جس نے سفارش کی اور دشمنوں میں ڈھنڈورا پیٹتا پھرا۔ اب جو اس کا انگ انگ مسرت سے جگمگا اٹھا تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچتا ہو گا' وہ شاید اس کی آنکھوں سے اس کا سراغ پا نہیں سکتی۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

پسپا ہو کر یا شکست کھا کر۔ یا یوں ہی ان آنکھوں کا سامنا عبیر کے لیے کبھی آسان کام نہیں رہا تھا۔



"کیا ہوا؟" اس نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتے پوچھا۔

سب کچھ تو صاف لفظوں میں لکھا تھا۔ توتے اور فال کو کیا کمال دکھانا باقی تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے بہادری سے مسکراتے کہا۔

"کسی ورکر نے بتایا، ایم ڈی صاحب کی طبیعت خراب تھی اور انہوں نے شاید بلایا تھا مجھے۔" کسی وجہ کے بغیر اس کا لہجہ غیر ضروری مودبانہ تھا۔

"میں نے سوچا خیریت دریافت کرلوں۔"

"اس انداز گفتگو میں آپ ذرا اپنے ایم ڈی سے بات کر کے دیکھئے، میری گردن تو ویسے بھی کٹ رہی ہے۔"

"کون ہے فاروق؟" انہوں نے اندر سے ذرا بلند آواز سے استفسار کیا تھا۔

"آپ کی کوئی کولیگ ہیں۔ اپنے ایم ڈی کی خیریت دریافت کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے کمرے کی طرف گردن گھماتے معمولی کی لگی لپٹی بھی نہیں رکھی تھی۔

"عبیر ہے کیا۔ اندر آجاؤ بیٹا!" اس نے راستے سے ہٹ کر خاموشی سے اس کے اندر آنے کی جگہ ڈال دی تھی۔

عبیر کمرے کے وسط میں کھڑی ہراساں سی دکھائی دیتی تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

اس سے قبل کہ وار خود اس پر ہوتا اس نے جلد از جلد معاملہ نمٹانے کی ٹھانی تھی۔

"بیٹھو تو سہی۔ ایسا لگتا ہے میں نے کہہ دیا۔ ٹھیک ہے تو الٹے قدموں پلٹ جاؤ گی۔ تم دونوں کے مراسم کچھ خراب لگ رہے ہیں۔" وہ جملے کے نصف آخر سے اپنے بیٹے سے مخاطب ہو گئے تھے۔

"ہم دونوں کے مراسم تو روز اول سے خراب تھے۔ آج تو ان کے مراسم آپ سے بھی اچھے نہیں لگ رہے۔"

"تم ہم دونوں کے بیچ بی جمالو مت بنو۔" انہوں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی مسلط کرلی۔ جس میں زبردستی طاری کیے گئے مصنوعی پن کی چھاپ صاف جھلک رہی تھی۔

"ایسی بات نہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر سکون سے بولی۔ "یقیناً" ابا تسخیر ہونا کوئی کارنامہ نہ ہوگا۔

"دراصل میں اپنے فادر کی طرف سے پریشان تھی۔"

"کیا ہوا ان کو؟" ایم ڈی کے ہاتھ میں تھامی کافی کی پیالی لرزی تھی، داغ سفید براق کاغذوں پر چھلک کر پھیل گئے تھے۔ ان کی رنگت خوف سے زرد تھی۔ تمام تر سنجیدگی لپیٹ کر ایک طرف رکھتے اس کے جواب وصول کیے بغیر اسی بے چینی سے انہوں نے اپنی گردن دوسری سمت موڑلی تھی۔

"کیا ہوا ان کو؟" یہ سوال کرتے ان کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔ جیسے جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ان ہی کے بیٹے پر عائد ہوتی تھی۔

عبیر کو اس گورکھ دھندے نے الجھا سا دیا تھا۔ معاملہ اس کے باپ کا تھا اور جواب دہی وہ اپنے بیٹے سے چاہتے تھے۔

"کیا ہوا ان کو؟" کوئی جواب وصول کیے بغیر ان کی آواز گلے میں رندھ گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نجمہ ثاقب

بلا عنوان

وہ کمرے کی کھڑکی کے ساتھ کسی بُت کی طرح ایستادہ تھی۔

سامنے چند فرلانگ کے فاصلے پہ ریلوے اسٹیشن کی پیلی عمارت روشنیوں میں نہارہی تھی۔ رات نو بجے کی ٹرام کو گزرے ابھی چند منٹ ہوئے تھے۔ پلیٹ فارم پہ مسافروں کی دھکم پیل، قلیوں کی بھاگ دوڑ اور خوانچہ فروشوں کی حرکت میں برکت معمول کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اگر اس نے کھڑکی کا شیشہ سختی سے بند نہ کر رکھا ہوتا تو یقیناً "ایک کان پھاڑ دینے والا شور کمرے کے اندر در آتا۔

معلوم نہیں یہ اسٹیشن پہلے بنا تھا یا ہسپتال۔

دونوں کے محل وقوع میں باہم کوئی مناسبت نہ ہونے کے باوجود عجیب قسم کی مانوسیت تھی۔ دونوں عمارتیں بے حد پرانی اور خستہ حال تھیں۔ گہری پیلی دیواریں۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑنے کے باعث عریاں تھیں۔ اپنی کہنہ سالی کا مشترکہ تاثر لیے خود کو 'غالباً' انگریز بہادر کے زمانے کی نشانی بتاتی تھیں۔

خاص طور پر ہسپتال کی حالت زیادہ ہی پتلی تھی، جس کی تیسری منزل پہ بنے پرائیویٹ روم کی کھڑکی میں امرت کور ایستادہ تھی۔

اس کے دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پہ جامد تھے اور وہ یوں ساکت تھی گویا پتھر کی ہو۔

اس کا سب سے چھوٹا راج دلارا بھائی دلبر سنگھ چند لمحے پہلے کمرے سے گیا تھا اور ان چند لمحوں نے ان دونوں کے درمیان صدیوں کے فاصلے پیدا کر دیے تھے۔

آنے والی گھڑیاں ان فاصلوں پہ مُہرِ تصدیق ثبت کرنے والی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان کا سامنا کرنا تھا کہ یہی ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ اسے اس لمحے کا انتظار تھا، جب بسترِ مرگ پہ لیٹی اس کی ماں اپنی زندگی کا آخری سانس لے گی اور اسے اس خاموش وچن سے آزاد کر دے گی جو ان دونوں کے درمیان تھا، جس کا اقرار اپنی گھٹتی سانسوں کے درمیان کرتے ہوئے اس نے اپنی اولاد سے زندگی کی پہلی اور آخری فرمائش کی تھی اور جسے سنتے ہی دلبر کمرے سے نکل گیا تھا، جیسے اس کا اس عورت سے جسے وہ اپنی ماں بتاتے تھے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کے اس طرح منہ پھیر کے نکلنے نے امرت کور کو زندہ درگور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" دو روز قبل وہ بے بے کو اس اسپتال میں لائے تھے۔ وہ بہت تندرست تو کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ امرت نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس کے وجود کو ایک بیمار سا تاثر پیش کرتے دیکھا تھا۔ پتا نہیں یہ کیسی بیماری تھی۔ جو ان کے اور بے بے کے درمیان کبھی حائل نہ ہوتی تھی۔

کبھی اس کے اور گھر کے بے انت دھندوں میں رکاوٹ نہ بنی۔ جن میں ساٹھ فی صد، سب سے بڑے کرور سنگھ کے بقول بے بے کے خود ساختہ تھے۔

"وہ کبھی فارغ نہ بیٹھی تھی۔ وہ عورتوں کی اس قبیل سے تعلق رکھتی تھی، جو فارغ رہ ہی نہیں سکتیں۔ فراغت انہیں ڈھونڈتی ہے۔ مگر ان تک رسائی نہیں پاتی۔

"بے بے!" منجھلا بیٹا محبت سنگھ کہتا۔ "واہ گرو نے تمہاری آتما میں کیا رکھ کر بھیجا تھا۔ اب بتاؤ بھلا اگر دنیا میں اتنے کام نہ ہوتے تو تم کیا کرتیں؟"

بے بے جواب میں صرف مسکرا دیتی۔ اس طرح کہ اس کی آنکھیں اس کا ساتھ نہ دیتیں۔ امرت کو ہمیشہ بے بے کی آنکھیں چہرے سے بچھڑی معلوم ہوتی تھیں۔

اس کی سہیلی شلپا کہا کرتی تھی۔

"امرتے! تیری بے بے پہ بھگوان کی کرپا ہے۔ ہر سمے گیان دھیان میں رہتی ہیں۔ میں نے کبھی انہیں عام عورتوں کی طرح گلے شکوے کرتے نہیں دیکھا۔ انہیں کسی مہامہنت کی اشیرباد تو نہیں۔"

"ارے نہیں۔" وہ تردید کرتی۔ "وہ تو بالکل بھی دھرم پریمی نہیں ہیں۔ میں نے کبھی انہیں دادی کی طرح گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے نہیں دیکھا۔ سال میں ایک، آدھ دفعہ سے زیادہ وہ گوردوارہ بھی نہیں جاتیں۔"

"ہو، ہو۔" شلپا منہ گول کر کے ہنستی۔ "تیری بے بے تو بڑی ماڈرن ہے امرتے! یہ خوبیاں تو پڑھی لکھی مہیلاؤں میں پائی جاتی ہیں۔ تیری بے بے یونیورسٹی میں پڑھی ہیں کیا؟"

اور امرت سچ مچ برا مان جاتی۔

"کیوں ایک سیدھی سادھی گھریلو عورت کا مذاق اڑا رہی ہو؟ جس کی زندگی اس کے بچوں سے شروع ہو کر بچوں پہ ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی تیسری چیز اس کی زندگی میں ہے ہی نہیں۔" اس نے پورے یقین سے کہا تھا۔

مگر اس کا اپنا دل اس یقین کے معاملے میں ڈانواں ڈول رہتا تھا۔

بے بے کی زندگی میں اپنے بچوں کے علاوہ کچھ دوسرا بھی تھا۔ جو اسے کبھی کبھی انتہا درجے کا بے حس بنا دیتا۔

سب کے درمیان اٹھتے بیٹھتے، چلت پھرت کرتے وہ وہاں نہ ہوتی۔ جہاں اس کا ظاہری وجود دکھائی دیتا۔

کیا وجہ تھی کہ اس راز کو اس کے آٹھ بچوں میں سے صرف امرت نے پایا۔ شاید اس لیے کہ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ بے بے سے بے حد قریب تھی یا بقول دادی کے بڑھاپے کی اولاد ہونے کے کارن وہ اور بے بے اک دوجے کی مجبوری تھیں۔

باقی اولادیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے گھروں میں مصروف ہو گئیں۔ اس کی بڑی بہن بلونت کور کو ہفتوں میکے جھانکنے کی فرصت نہ تھی۔

پانچوں بھائی اپنے اپنے کاروباروں میں مست تھے۔ سب سے چھوٹا دلبر سنگھ بے بے کا سب سے پیارا لاڈلا تھا۔

امرت کو لگتا، بے بے کو ساری اولاد میں دلبر سا کوئی نہیں۔

اس کا یہ پیار خاموش ندی کا سا تھا۔ جس میں جذبات کا مدوجزر اس نے کبھی نہ دیکھا۔

شاید بے بے کے اندر جذبات تھے ہی نہیں۔ یا وہ انہیں کمال مہارت سے چھپا جاتی تھی۔

بہرحال یہ طے تھا کہ اولاد کے لیے اس کے دل میں محبت کی کمی نہیں، اظہار کے طریقے البتہ عجیب سے تھے۔

گھر میں موسم کا پھل، میوہ آتا... بے بے کے معدے میں انتہائی تکلیف ہو جاتی لیکن خود بڑے آرام سے امرت کی پلیٹ میں پروس دیتی۔

سیزن کا سوٹ مسکنے پہ رفو کرنے کا فن اس سے بہتر کون جانتا تھا۔ باپو سب کے کپڑے لاتے، بانٹتے تو سوٹ اکثر وہ بیروں سے ایک آدھ زائد بنا لیتے کپڑوں سے۔

ڈاکٹری دوائیوں سے اسے الرجی تھی۔ گرمی ہو جانے کی شکایت کرتی۔ بیمار پڑتی تو باپو کی طرف سے دیے گئے علاج کے پیسے بڑی سہولت سے کروڑ سنگھ اور محبت سنگھ کی جیبوں میں منتقل ہو جاتے۔

باپو کے سورگ باش ہونے کے بعد بھی اس معمول میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ بے نفس اور سادھو سنت ہو گئی۔

باپو گئے۔ پھر دادی بھی چلی گئی۔

بے بے جلے پاؤں کی بلی بنی اندر باہر پھرا کرتی۔ کبھی کبھی خود کو کمرے میں بند کر لیتی اور دیر دیر تک اندر ٹھہرے رہتی۔

دلبر کہتا تھا، بے بے کو دورہ پڑتا ہے۔ باپو سے جدائی کا دورہ امرت اس کی تنہائی بٹانا چاہتی تھی۔

مگر ہزار بے تکلفی کے باوجود اسے بے بے کی آنکھوں تک رسائی نہ تھی۔ اسے ان سرد اور اجنبی آنکھوں سے کبھی کبھی خوف آتا تھا۔

اور اس روز اس خوف میں الجھن کا اضافہ ہو گیا، جب اس نے بند دروازے کے پیچھے بے بے کا آدھا ادھورا راز پایا تھا۔

جاتی برسات کے دن تھے۔ دلبر اپنے دوستوں کے ساتھ شملہ گیا ہوا تھا۔ وہ بے بے کو گھر میں تنہا چھوڑ کر یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی تھی، مگر شلپا مصر تھی۔

"گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے آجاؤ۔"

اسے اپنی منگنی کی خوشی میں دوستوں کو ٹریٹ دینا تھی۔

بمشکل یونیورسٹی پہنچی تھی کہ مینہ برسنے لگا۔ برسات ہو اور امرتسر کی بارشیں۔ ابر کرم اتنا کھل کے برسا کہ گھر پہنچنے کے لالے پڑ گئے۔ واپسی لوکل بسوں پہ دھکے کھاتے ہوئی۔

گھر خالی ڈھنڈار پڑا تھا۔

بیٹھک میں، رسوئی کے اندر، اوپر برساتی میں اس نے ہر جگہ دیکھا۔ بے بے کہیں نہیں تھی۔

ہو سکتا ہے کہیں آس پاس میں گئی ہو۔ خود سے مفروضہ قائم کرتے، گیلی ساڑھی لٹکانے وہ اسٹور کی طرف آئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر بے بے کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ حیران ہوئی۔ اتنی گرمی اور حبس میں وہ اندر کیا کر رہی ہے۔

مارے تجسس کے بغلی کھڑکی کے کواڑ پہ ہاتھ مارا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ بے بے کو زمین پہ جھکے دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔

وہ کیا کر رہی تھی؟

جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔ کیا یہ نظر کا دھوکا تھا؟ شدید صدمے کی کیفیت نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔ بے بے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے امرت کی موجودگی کو پا لیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ بے بے کی نگاہوں میں بے بس کر دینے والا احساس تھا۔ آج اس کی سرد نگاہوں میں التجا تھی جیسے کہہ رہی ہو "امرت! یہ میرا پردہ ہے۔ اسے مت اٹھانا!"

اس روز اسے وہ آنکھیں اجنبی نہیں لگیں۔

پھر اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ بے بے دھلکی چال چلتی اس کے پیچھے آئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ بے بے کا پردہ رکھے گی۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک دو دن بعد بے بے کو دل کا دورہ پڑ گیا۔

تینوں بھائی کروڑ سنگھ، محبت اور بچن سنگھ آئے بیٹھے تھے۔ آج تینوں بڑی فرصت سے بے بے سے باتیں کرنے آئے تھے۔ باپو کے مرنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سب اکٹھے ہوئے تھے۔ اتفاقاً اس روز دلبر سنگھ بھی وقت سے پہلے کالج سے لوٹ آیا۔ بھائیوں کو بیٹھے دیکھ کر اس نے بے اختیار خوشی سے فتح بلائی۔

"ست سری اکال" کا نعرہ ابھی سب کے منہ میں تھا۔ کہ رسوئی کے دروازے پہ دھڑام کی آواز سے گری۔ وہ بچوں کے لیے ٹھنڈا شربت لینے گئی تھی۔

یہ بے بے کے دل پہ پہلا جان لیوا حملہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چٹ پٹ ہو جاتی۔ پانچوں سوڈھی سکھ بیٹوں نے اسے ہسپتال پہنچا دیا۔

اور پچھلے تین روز سے وہ بے بے کے ساتھ ساتھ تھی۔

باقی بہن بھائی باری باری آ کے ٹھہرتے رہے، مگر امرت اور دلبر نے ایک لمحے کے لیے بھی ماں سے دوری برداشت نہ کی۔

بے بے کو آکسیجن لگی تھی۔ پچھلی دونوں شامیں اس نے دلبر کے ساتھ آئی سی یو کے ٹھنڈے کوریڈور میں گزاری تھیں۔ نہ وہ اٹھنے کو تیار ہوتا تھا، نہ امرت اپنی جگہ چھوڑتی تھی۔

رات ہوئی تو بے بے کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ اب اس کی حالت بہتر تھی، تب سے دونوں بہن بھائی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد

بے بے کی پلکوں پہ خفیف لرزش ہوئی۔ دلبر نے لپک کر ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"دلبر خان!" بے بے کی آواز بے حد خفیف تھی کہیں بہت دور سے سنائی دی جانے والی۔

دلبر نے بے اختیار امرت کی طرف دیکھا۔ اسے لگا، کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ وہ خود ششدر تھی۔

"دلبر خان!" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بیٹے کے چہرے کو چھونا چاہا۔ بازو کٹے شہتیر کی طرح نیچے گر گئے۔

"لگتا ہے بے بے کے دماغ پہ بھی اثر ہوا ہے۔" دلبر نے اس کی طرف سرگوشی لڑھکائی۔

امرت نے ماں کے ہونٹوں پہ موہوم سی مسکراہٹ ٹھہرتے دیکھی۔

"آج میرا دل تمہیں ایسے ہی بلانے کو چاہ رہا ہے۔"

کسی انہونی کے احساس نے امرت کے دل کو جکڑا۔ اس نے چاہا بے بے کو روک دے۔

"ڈاکٹر نے آپ کو بولنے سے منع کیا ہے۔"

"مجھے بولنے دو امرت! اگر آج بھی نہ بولی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔" امرت نے سوچا۔ "دل تو پھٹ چکا ہے بے بے! ڈاکٹروں نے بتلا دیا ہے، دوسرا دورہ جان لیوا ہو گا، جو کسی بھی وقت متوقع ہو سکتا ہے۔" مگر چپ رہی۔

"تریسٹھ سال کی چپ ہے دلبر! آج اسے ٹوٹ جانا چاہیے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو بے بے؟" دلبر سخت الجھا ہوا تھا۔ ماں کی بیماری نے اسے اعصابی طور پہ تھکا دیا تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"میری آدھی ادھوری باتوں پہ غور کرو گے تو ساری کہانی سمجھ میں آ جائے گی۔ میرے پاس وقت کم ہے اور سفر بڑی دور کا ہے۔ وقت تو اس روز بھی بہت کم تھا، جب میں اپنے ماں جائے دلبر خان کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔ تب بھی ایسی ہی گھپ اندھیری رات تھی۔ باہر سڑکوں پہ کرپانیں کھلی تھیں اور گلی کوچوں میں مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

دلبر نے کہا۔ "آسیہ وقت کم ہے۔ اب نہ نکلے تو پھر موقع نہ ملے گا اور ہمیں موقع مل گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ بلوائیوں کی بھیڑ چھٹنے لگی۔ دلبر اماں کی دعاؤں کے سائے میں مجھے لے کر نکلا۔ بڑی مشکل سے چھپتے چھپاتے چوک پہ پہنچے۔ آگے مسلمانوں کا محلہ تھا، جہاں سے قافلہ نکلنے کو تیار تھا۔ ہم بھی اس میں شامل ہو گئے۔"

بے بے کا سانس بولتے بولتے پھولنے لگا۔

امرت اور دلبر دم بخود سن رہے تھے۔

مگر اس دم گھونٹتی کیفیت میں بھی بے بے نے محسوس کر لیا کہ اس کے ہاتھوں پہ دلبر کی گرفت کمزور پڑ چکی ہے۔

بے بے کی آواز ٹکڑے لگی۔ امرت نے خود کو رونے سے نہیں روکا۔

"بڑی سڑک پہ پہنچے تو حملہ ہو گیا۔ قافلے میں افراتفری کا عالم تھا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، دوڑ پڑا۔ گولیوں کی تڑتڑ، کرپانوں کے کوندے، بچوں کا رونا اور عورتوں کی چیخوں سے ماحول بھر گیا۔ اس دھکم پیل میں دلبر خان مجھ سے بچھڑ گیا۔"

بے بے کے سینے سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔

"پھر کچھ نہیں بچا۔ صبح ہونے پہ وہاں صرف لاشیں تھیں اور مجھ جیسی کم نصیب عورتیں، جنہیں تمہارے بھائی بندوں نے یرغمال بنا لیا۔ تمہارے باپو کے مجھ پہ بہت احسان ہیں دلبر! اس نے مجھے بھیڑیوں سے بچا کر اپنے گھر کی زینت بنایا۔

اب مرتے سمے ایک احسان تم مجھ پہ کرنا۔ تمہیں اس تعلق کا واسطہ، جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ مجھے مسلمان دفن کرنا۔ بسنت کور نہیں، آسیہ خاتون بنا کر میری آخری رسومات کرنا۔ خدا گواہ ہے۔ میں کبھی اپنا اصل نہیں بھول پائی۔"

دلبر ایک جھٹکے سے اٹھا اور اسے پرے ہٹاتا باہر نکل

گیا۔ امرت نے دیکھا، شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

بے بے کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے دوڑی۔

انہیں ایک دفعہ پھر آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔

☼ ☼ ☼

تب سے وہ کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ نگاہیں پلیٹ فارم پہ ہجوم میں بھٹک رہی تھیں اور ذہن میں خیالات کی یورش تھی۔

"تو یہ تھی تمہاری حقیقت، جو تنہائی میں تم سے سجدے کرواتی تھی۔

آج میری سمجھ میں آیا ہے بے بے کہ تیری آنکھیں اتنی اجنبی کیوں تھیں۔

تیری روح اپنوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنوں کی تلاش میں کیوں کرلاتی تھی۔ میرے جیتے ننھیال کو مردہ کرنے کا کرب تیری راتوں کو کالا کرتا رہا۔

میں نے تجھے سجدے کرتے بھی دیکھا اور عربی پڑھتے بھی۔ میں ان لمحوں کی گواہ ہوں بے بے جب تو زیرِ لب اللہ کا نام لیتی تھی۔ کاش تو نے ایک مرتبہ مجھ سے دل کا حال کہا ہوتا۔ کبھی تو مجھ پہ اعتماد کرتی۔

یا کاش تو چلی گئی ہوتی۔ زندگی میں کبھی تو موقع ملا ہو گا تو ہمیں تب چھوڑ کر چلی جاتی۔ تو وہ تکلیف اس تکلیف سے کم ہوتی، جو دلبر کا ردِعمل دیکھ کر تجھے ہوئی ہے۔

دلبر نرم پڑ بھی گیا تو مجھے یقین ہے کہ تیرے سوڈھی سکھ بیٹے تیری خواہش کبھی پوری نہ ہونے دیں گے۔ اپنی مری ماں سے زیادہ انہیں اپنی عزت پیاری ہے۔

وہ دنیا کو منہ نہ دکھا پائیں گے۔

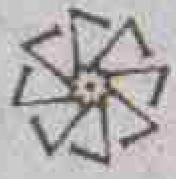
وہ ساری زندگی سر اٹھا کے نہیں چل سکیں گے۔

اس نے اضطراری کیفیت میں شیشے پہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

یا پھر بے بے! یہ راز تو اپنے سینے میں لے کر مر جاتی۔ ان گنت آسیاؤں کی طرح جو پتا نہیں کہاں کہاں، امرتسر کی فضاؤں میں کامنی دیوی، بسنت کور اور آشا بن کر زندگی گزارتی ہیں۔ سکھوں کے گھر بساتی ہیں۔ سکھ پیدا کرتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔"

شدتِ غم سے اس نے سر کھڑکی کی چوکھٹ پر پٹخ دیا۔

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



حیا بخاری



گرمیوں کی کڑکتی دھوپ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ لو سے بچنے کے لیے چرند پرند بھی جیسے کہیں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ ہر سو ایک عجیب سی خاموشی تھی۔

سرسبز کھیتوں کے درمیان سرخ اینٹوں سے بنے تقریباً" دو کینال کے رقبے پر پھیلے اس خوب صورت مکان کے مکین بھی شاید گرمیوں کی دوپہر میں آرام کر رہے تھے کہ اچانک ہی ایک زنانہ' زوردار چیخ سے اس مکان کے درودیوار لرز اٹھے۔

اپنے کمرے میں قیلولہ کرتیں دادو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"الٰہی خیر۔" اپنی مخصوص چھوٹی سی لائبریری میں آرام دہ کرسی پر جھولتے جھولتے "دیوان غالب" پڑھتے داداجان کے ہاتھوں سے کتاب نیچے گر پڑی۔

"یا اللہ' یہ تو میری سندرے بچے کی چیخ تھی۔" انہوں نے ایسے آنکھیں بند کرلیں' جیسے کبوتر' بلی کو دیکھ کر۔

صباحت بیگم ابھی نہانے کے لیے گئی تھیں۔ چیخ باتھ روم کے درودیوار بھی پار کرچکی تھی۔ نتیجتاً" وہ شیمپو' صابن لگائے تہائے بغیر کپڑے پہن کر باہر کی طرف دوڑ لگا چکی تھیں۔

صنوبر بیگم نے بھی اپنے بستر پر لیٹے لیٹے چیخ سنی تھی۔ وہ آرام سے اٹھیں اور سیدھا دادو کے کمرے کا رخ کیا۔ دادو ابھی تک بستر پہ بیٹھی آنکھیں بند کیے کوئی ورد کر رہی تھیں' ساتھ ساتھ کانپنے بھی جا رہی تھیں۔ آہٹ پر آنکھیں کھولیں' صنوبر کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"بہو' کیا ہوا؟ خیر تو ہے نا۔"

"جی اماں جی۔" وہ آرام سے کہتی کھڑکی کی طرف بڑھ گئیں۔

داداجان نے بید کی چھڑی اٹھائی اور باہر چل دی۔ دادو نے دل پہ ہاتھ دھرا اور جلدی سے بستر سے اتر کر' بیگم کے پیچھے ہولیں۔

"ارے دلہن' صبر تو کرو' رکو تو سہی' بات تو سنو۔"

مگر وہ ان سنی کرتیں' باہر چلی آئیں' جہاں توقع کے عین مطابق گھر کے سارے افراد آم کے پیڑ کے نیچے گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ دائرے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھیں تو دیکھا کہ سندرے آنکھیں موندے داداجان کی گود میں سر رکھے نرم گرم گھاس پہ لیٹی ہے۔

صباحت بیگم شیمپو لگے بالوں کے ساتھ مسلسل اس کے پاؤں کے تلوے مل رہی ہیں۔ وہ پرجوش سی آگے بڑھیں۔

"ادھر' مجھے دیکھنے دیں ذرا اس کو' میں آج اس کا علاج کرتی ہوں۔"

سب جیسے ہوش میں آئے۔ "ارے اللہ کا نام لیں' کیوں اتنا ظلم کرتی ہیں' وہ بے ہوش ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں' ٹھیک کردیتی ہوں' ابھی ہوش میں آجائے گی۔" انہوں نے بید کی چھڑی ہوا میں لہرائی۔

سندرے نے جھٹ آنکھیں کھول کر ہرنی کی طرح قلانچ بھری اور پھر وہ آگے آگے اور صنوبر پیچھے پیچھے۔

"امی اس بار معاف کردیں' قسم سے دوبارہ آم کے پیڑ کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں' چڑھنا تو دور کی بات ہے' قسم سے پھسل گئی تھی' گلہری کو دیکھ کر۔"

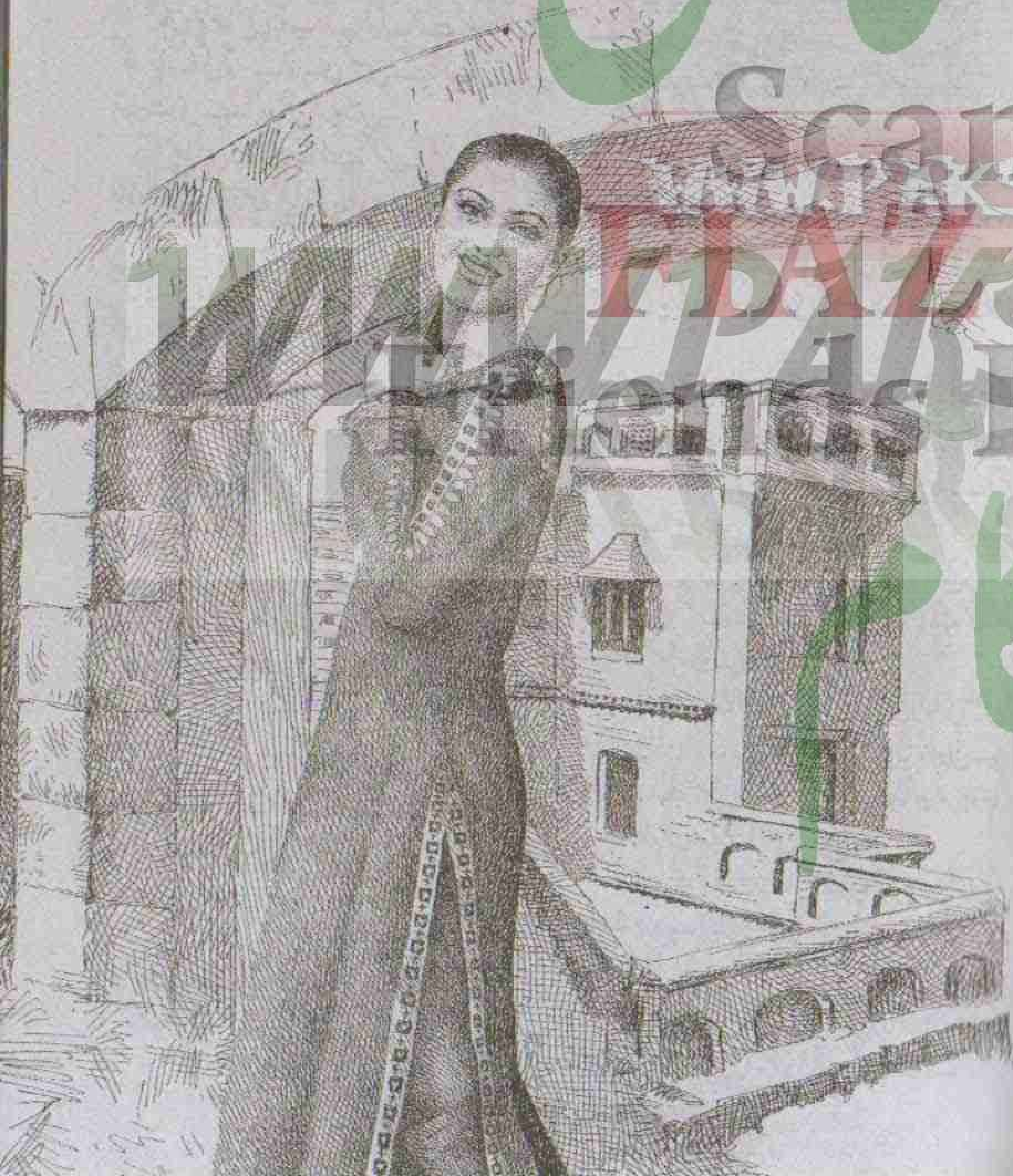
وہ بھاگتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔

دادا اور باقی سب آرام سے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت دادو باہر آئیں تو سندرے جھٹ ان سے لپٹ گئی۔ "ہائے دادو! پلیز مجھے بچالیں' دیکھیے آپ کی پھول جیسی سندرے کو یہ چھڑی چھو گئی تو یہ تو بے موت ماری جائے گی۔"

دادو نے فوراً" اسے اپنی پناہ میں لیا تھا۔

"ہائے بہو! سٹھیا تو نہیں گئی ہو اس عمر میں' اب کیا جوان اولاد پر ہاتھ اٹھاؤ گی۔" دادو نے ہانپتی کانپتی صنوبر کو ٹوکا۔

"اماں جی! آپ لوگوں کے لاڈ نے ہی اسے بگاڑ رکھا ہے۔ ورنہ اور لڑکیاں بھی تو ہیں اس گھر میں..... وہ تو ایسی حرکتیں نہیں کرتیں۔" انہیں جواب دے کر وہ سندرے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "ارے کم بخت!



اپنی چھوٹی بہنوں سے ہی کچھ سیکھ لے۔" وہ سندرے کی جانب جھپٹیں، وہ جھٹ سے دادو کے پیچھے ہولی۔

"اچھا بس، میں نے کہہ دیا آئندہ یہ ایسا کچھ نہیں کرے گی، اب تم سب جاؤ، آرام کرو۔" دادا نے گویا تخلیے کا حکم دیا۔

سب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئے۔

"میری جان، زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" صباحت چچی نے اسے خود سے لپٹایا تو صنوبر بیگم اور چڑ گئیں۔

"ہاں چڑھائیں آپ سب لوگ اسے سر پر، اگلے گھر جائے گی تو سب تو یہ ہی کہیں گے ناکہ ماں نے یہ تربیت دی ہے۔" وہ جل کر بولیں۔

"اچھا بس بہو! تم جاؤ اپنے کمرے میں اور تم بھی جاؤ دلہن! یہ سر دھوؤ کیا حال بنایا ہوا ہے۔"

دادو نے چچی کے شیمپو لگے سر پر چوٹ کی تو انہیں بھی یاد آیا اور جھٹ سے اندر کی طرف بھاگیں۔ صنوبر بھی بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ سندرے، دادا جان کے کاندھے سے لگی ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

آج موسم بہت خوش گوار تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی آسمان ابر آلود تھا۔ وہ سب شام کی چائے پینے صحن کی خوب صورتی سے لگائی گئی گھاس پر بیٹھے تھے۔ دادا جان مسلسل اپنی یادیں ان سے شیئر کر رہے تھے۔

"دادا جان، آپ کے اور بھائی نہیں تھے۔" سندرے نے سموسہ اٹھاتے ہوئے سوال کیا تو ایمان نے اس کی بے خیالی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ذیشان کی لائی ہوئی پلاسٹک کی چوہیا اس کی گود میں چپکے سے ڈال دی۔

ساری ینگ پارٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرانے لگی۔

"نہیں بیٹا۔" دادا جان نے چائے کا سپ لے کر جواب دیا۔

"میں اپنے ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرے دادا کو بہت شوق تھا کہ میرے بابا وکیل بنیں، مگر بعض وجوہات کی بنا پر وہ یہ شوق پورا نہ کر سکے۔ تب بابا نے مجھ پہ اپنا یہ جنون عیاں کیا اور میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اپنے دادا کا خواب پورا کروں گا۔"

بابا اس دن بہت خوش تھے جب میں کالا کوٹ پہنے ان کے سامنے آیا تھا۔ پھر وقت گزرتا گیا، زندگی کی پت جھڑ میں ایک بہار کا تازہ جھونکا آیا، بوجھو کون۔" دادا نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

تو سندرے چیخ اٹھی "دادو۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"پھر دادا!" ایمان بے صبری سے بولی۔

"بس پھر اللہ نے یکے بعد دیگرے مجھے تین ہونہار بیٹوں سے نوازا۔ تینوں کی پرورش میں نے اپنے ان اصولوں پہ کی، جس پہ میری شخصیت کی عمارت کھڑی تھی۔

شاہد تو ایم بی اے کرکے بیوی، بچوں سمیت امریکہ چلا گیا۔ زاہد اور مجاہد یہیں اپنے کاروبار زندگی میں مصروف ہوگئے، اس لیے میں نے یہ گھر شہر سے اتنی دور خوب صورت پر فضا مقام پر بنوایا، تاکہ تم لوگ بھی خالص ماحول میں پروان چڑھو۔ پڑھائی تو تمہاری شہر میں ہی ہے، مگر زندگی کا جو اصل مزا یہاں ہے، وہ شہر کے شور شرابے میں نہیں۔"

سب بچوں نے ان کی تائید کی۔ "ہاں دادا جی، میں تو خواتنا پریشان ہوتا ہوں، جب یونیورسٹی جاتا ہوں۔ سچ! دھوئیں سے بھری فضا میں سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔" فاران نے فوراً ہی تائید کی۔

"اسی لیے تو فاران بھائی ہماری طرح دو ہفتوں کی بجائے ہر ویک اینڈ پر یہاں آجاتے ہیں۔" سندرے نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا بیٹا، تم لوگ باتیں کرو، میں ذرا زمینوں کا چکر لگالوں۔" دادا نے اپنی چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی اذعان نے زور کی چیخ ماری۔

"کیا ہوا؟" تقریباً سب ہی اچھل پڑے۔

"وہ دیکھو سندرے کی گود میں۔" اور پھر سب کے منہ سے نکلتی چیخوں میں واضح چیخ سندرے کی ہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اچھلنے لگی، جبکہ باقی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔

صنوبر بیگم کو دوڑتے آتا دیکھ کر سب چپکے سے کھسک لیے اور سندرے نے کود نا بند کرکے دوڑ لگائی جب عین سر پر پہنچ کر صنوبر بیگم نے سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر زور کی دھپ اس کی کمر میں جمائی۔

اندر سارے بھاگ جانے والے مفرور اب کسی ایسی خفیہ جگہ کی تلاش میں تھے، جہاں ان کو سندرے نامی جاسوس طیارہ نہ ڈھونڈ پا سکتا، جبکہ سندرے ڈرون حملے کی نیت سے سیدھا تور اور ا جیسے جگر اشور کی طرف بڑھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ سارے مطلوبہ دہشت گرد وہیں ملیں گے۔

☼ ☼ ☼

شہر سے دور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان اور نہر کنارے سرخ اینٹوں سے بنا، یہ مکان، ماجد خان اور ان کے خاندان کی محبتوں کا امین تھا۔

ماجد خان کے بڑے بیٹے شاہد خان، بیوی زرتاج بیگم اور بچوں بسام اور انعم کے ساتھ امریکہ میں رہائش پذیر تھے۔ وہاں ان کا اپنا کاروبار تھا۔

منجھلے بیٹے زاہد خان اور ان کی بیوی صباحت اپنے بچوں، فاران، ذیشان اور ایمان کے ساتھ، جبکہ چھوٹے بیٹے مجاہد خان بھی بیوی صنوبر اور بچوں اذعان، سندرے، گل اور صدف کے ساتھ اسی گھر میں رہتے تھے۔

ویسے تو سب لوگ ایک دوسرے کے بغیر نہ جی سکتے تھے، مگر سندرے سب گھر والوں کی جان تھی، کیونکہ ایک تو وہ خوب صورتی میں بے مثال تھی، دوسرے شرارتوں اور اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے وہ سب کی لاڈلی تھی۔ آج کل ان کی چھٹیاں تھیں تو وہ سب "خان ہاؤس" میں خوش تھے، ورنہ تو پڑھائی کے لیے اس گھر کی جدائی ان سب کو نچوڑ کے رکھ دیتی تھی۔

"شانی! ذرا چھت پہ جا کر ٹوکرا تو ہلا دو، سگنل نہیں آرہے۔"

ینگ پارٹی اس وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھی ٹی وی کے ڈراموں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

دادا نے ان کو ایک عدد ڈش انٹینا لگوا دیا تھا، کیونکہ شہر سے اتنی دور کیبل میسر نہیں تھی۔

"میں کیوں چڑھوں چھت پہ، میں تمہیں بندر نظر آتا ہوں۔" شانی نے صاف جواب دیا۔ "اور ویسے بھی یہ کام تو اپنی سندرے کرتی ہے۔" ذیشان نے سندرے کو چڑایا۔

"اے اے، میرے منہ مت لگنا ہاں۔" سندرے نے دور سے ہی اپنے جنگلی بلی والے ناخن دکھائے۔

"ہوئی ماں۔" وہ چیخ مار کے فاران کے پیچھے چھپ گیا۔

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔" سندرے نے مصنوعی جناتی قہقہہ لگایا اور گود میں دھرے خشک میوے سے انصاف کرنے لگی۔

اس وقت دوڑ کر آتی گل صوفے سے ٹھوکر کھا کر عین ان کے درمیان آگری۔

"ارے یہ آج تربوز کیوں ادھر ادھر دھما چوکڑیاں بھر رہا ہے؟" ذیشان نے گل کے ہلکے سے موٹاپے پر ٹھیک ٹھاک وار کیا۔ اس نے اپنے بڑے شیشوں والی عینک سے گھورا تو وہ دوبارہ سہم کر دبک گیا۔

"ارے ٹی وی بند کرو، میں بریکنگ نیوز لائی ہوں۔" گل نے دیدے نچاتے ہوئے گویا کوئی بم چھوڑا۔

"ہم ٹوٹی پھوٹی نیوز کا کیا کریں۔ جاؤ پہلے پوری خبر لاؤ۔" سندرے نے کمال کی بے نیازی دکھائی۔

"ہاں، ہاں، ابھی کرلو باتیں۔ بعد میں سب سے پہلے تمہیں ہی اچھلنا ہے۔" گل نے اسے دھمکایا۔

"اچھا! تم اسے گولی مارو، خبر سناؤ۔" صدف نے ہمیشہ کی جلد بازی دکھائی۔

"اپنی بنو کو دیکھنے لوگ آرہے ہیں۔" اس نے گردن ہلا ہلا کر اعلان کیا۔

"لو، تو اس میں ہمارا کیا عمل دخل، بنو جانے اور بنو کے ماں، باپ جانیں۔" فاران نے مکھی اڑائی۔

"کیا مطلب؟" گل اپنی خبر کا یہ ستیاناس دیکھ کر تلملا گئی۔

"بھئی اب بنو۔ ساری عمر ہمارے گھر کے کام تھوڑا کرے گی، آخر اپنے گھر بھی جائے گی نا؟ ہاں، اگر اس کے شوہر نے اجازت دی تو پھر شاید وہ یہاں کام کرتی رہے۔"

ذیشان نے کام والی بنو کی ٹھیک ٹھاک حمایت کی تو گل کے ہاتھ سیدھے اس کی گردن تک لمبے ہوگئے۔ وہ آنکھیں سٹپٹاتا پھر فاران کے پیچھے اچک لیا۔

"اے اللہ کن پینڈو لوگوں سے میرا واسطہ پڑ گیا ہے۔"

"کھل کر بتاؤ، بات کیا ہے؟" ایمان چڑ کر بولی۔

"ارے بات یہ ہے کہ کل کچھ لوگ سندرے کو دیکھنے آرہے ہیں۔" گل کے بولنے کے ساتھ ہی سب نے سندرے کا جائزہ لینا شروع کردیا، لیکن کچھ دیر بعد مایوسی سے نگاہیں واپس پھیر لیں۔

"اس کو دیکھنے کا فائدہ؟" فاران ہنس کر بولا۔

"کیوں مجھے دیکھنے کیوں آئیں گے؟ میں بھلا کوئی شو پیس ہوں؟" سندرے جیسے اب ہوش میں آئی تھی۔

"ابھی دادو کے کمرے سے اس خفیہ میٹنگ کا پورا حال چھپ چھپ کے سن اور دیکھ آئی ہوں۔ امی کے مطابق ایمان کی سالگرہ پر ہماری جو فرینڈز آئی تھیں ان میں اپنی صدف کی بھی ایک فرینڈ تھی۔"

"اوہ! ہاں، یاد آیا وہ، جس نے سارا ٹائم سندرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزارا تھا، وہ چمپینزی سی۔" فاران نے ذہن پہ زور ڈالا۔

"اوں ہوں۔" حسب معمول حساس سی سندرے برا مان گئی۔

"جی، اسے اپنے قابل ڈاکٹر بھائی کے لیے سندرے پسند آگئی ہیں۔ آج ان کی مادر شریف نے امی کو فون کرکے اطلاع دی ہے اور کل بہ نفس نفیس خود حاضر ہوں گی۔"

"لو بھئی اپنی سندرے کے تو ٹھاٹھ ہوگئے۔" ایمان نے پیشگی اس کا مستقبل بیان کیا۔

"چلو کسی ایک سے تو جان چھوٹے گی، ورنہ جنگلی بلیاں روز بروز خونخوار اور طاقت ور ہوتی جارہی تھیں۔" یہ فاران تھا۔ سب سے زیادہ سیدھا سادھا (الو) سندرے نے جل کر سنا۔

"ٹھاٹھ کرتی ہے میری جوتی، اور میرے لیے کیوں آرہے ہیں، تم دونوں ان کو نظر نہیں آئیں؟" اس نے گل اور ایمان سے پوچھا۔

"ارے ہم تو تم سے بہت چھوٹی ہیں۔ ہماری باری تو بعد میں آئے گی۔" گل نے عذر پیش کیا جو فوراً سے پیشتر اپوزیشن کی طرح بالکل رد کردیا گیا۔

"ہاں چھوٹی؟ صرف دس منٹ اور ایمان صرف پانچ مہینے۔"

سندرے نے اپنی جڑواں بہن گل اور ایمان کو ٹیبل سے چھوٹا سا آئینہ اٹھا کر دکھایا۔

"جو بھی ہے اب بحث سے کیا حاصل، تم اب سامان سفر باندھنا شروع کردو، کیونکہ سنا ہے انہیں بہت جلدی ہے اور پھر میری بھی تمہارے ساتھ رہ رہ کے پرائیویسی ہی ختم ہوگئی ہے۔ کچھ تو ایزی فیل کروں گی۔" گل نے چشمہ اتار کر اپنے دوپٹے سے صاف کیا تو سندرے بل کھا کے رہ گئی۔

"ارے یاد رکھنا، اول تو ایسا ہو نہیں سکتا اور اگر ہوگیا تو اپنے سسرال کے کونے کونے چھان کر انواع و اقسام کے دولہے تمہارے لیے بھی برآمد نہ کرلیے تو سندرے نام نہیں میرا۔"

سندرے نے لڑاکا عورتوں کی طرح آستینیں چڑھا کر ہاتھ لہرا لہرا کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف مارچ کرگئی۔

"ویسے یار! اس کا موڈ تو بتا رہا ہے کہ اس کے ٹلنے

کے کوئی آثار نہیں۔ دادو اس کی مرضی کے خلاف ایک قدم آگے نہیں بڑھائیں گے۔" فاران نے کف افسوس ملتے ہوئے سوچا اور برملا اظہار بھی کردیا۔

"تو کیا ہوا اب بیری ہے تو پتھر تو آئیں گے ہی نا۔" اذعان نے پہلی بار زبان کھولی۔

"تم میں سے کوئی اور اپنا نام کیوں نہیں پیش کردیتیں، کچھ تو آسانی ہو۔" اس نے دیگر لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا اور چاہنے کے باوجود کہیں بھی پناہ نہ پاسکا۔

تینوں لڑکیاں پاک فوج کے مستند جوانوں کی طرف کمربستہ ہو کر اس پہ ٹوٹ پڑی تھیں۔ فاران اور ذیشان اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہے کہ جب لڑکیاں ہٹ جائیں تو وہ کوئی امدادی کارروائی شروع کرسکیں۔

☼ ☼ ☼

"ہائے اللہ سندرے چپ ہو جاؤ، کل تو صرف دیکھنے آرہے ہیں، ساتھ تو نہیں لے جائیں گے تمہیں نکاح پڑھوا کے۔" ایمان نے کوئی چوتھی بار الفاظ دہرائے تو فاران نے اسے گھور کر دیکھا۔

"سارا دن ایک ہی ڈائیلاگ رٹتی رہی ہو ایک، دو اور نہیں سیکھ سکتی تھیں، ایمان کی بچی!" وہ دبک کر سندرے کے اور نزدیک ہو بیٹھی۔

"آپی آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ قسم سے اتنا ہینڈسم بھائی ہے تانی کا۔" فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ صدف نہایت مدبرانہ انداز میں بہن کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"تم چپ کرو، ورنہ کچا چبا جاؤں گی۔" سندرے نے اسے دانت دکھائے اور ڈرانے کے لیے منہ تھوڑا زیادہ کھول لیا۔

"ہائے اللہ۔" ذیشان فوراً غش کھا کر زمین پہ گر پڑا۔

"اسے کیا ہوا؟" سندرے حیران رہ گئی۔

گل اسے ہوش میں لانے لگی۔ "کیا ہوا شانی! آنکھیں کھولو۔" گل نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"اف! ابھی یہاں ایک چڑیل آئی تھی، یہ لمبے لمبے دانت۔"

اس نے اپنے ہاتھوں سے دانت بنائے تو سندرے اسے فقط گھور کے رہ گئی۔

"اچھا چھوڑو یہ سب۔ میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔" ایمان متانت سے بولی، تو سب ہی اچھل پڑے۔

"وہ کیا۔" سندرے جلدی سے بولی۔

"نہیں، پہلے وعدہ کرو تم مانوں گی۔"

"مانوں گی بابا، تم بتاؤ تو سہی۔" وہ بے چینی سے تڑپی۔

"تم فون کرکے یعنی صدف تم فون کرکے اپنی دوست سے کہہ دو کہ تمہاری آپی تو پہلے سے ہی فاران سے انگیجڈ ہیں۔" اس نے گویا بم پھوڑا۔

فاران تو صوفے سے اچھل کر میز پر آبیٹھا۔

"ہم، ارے لاحول پڑھ چڑیل، کبھی کبھی منہ کا کہا سچ ہوجاتا ہے۔"

سندرے غصے سے لال پڑ گئی۔ "اوہو تو یہاں کون مرا جارہا ہے تم سے منسوب ہونے کے لیے... ہونہہ! شکل دیکھی ہے اپنی؟" اس نے بھی فوراً بدلہ چکا دیا۔

"تو پھر تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا سوری۔" ایمان نے ہتھیار پھینکے۔

"نہیں، میرے پاس ہے اک شاندار آئیڈیا۔" گل کچھ سوچتے ہوئے بولی تو سب چونک گئے۔

اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، طویل راہداری میں کوئی نہیں تھا، دروازہ اچھی طرح لاک کرکے وہ سب کے درمیان آبیٹھی اور پھر جوں جوں وہ بولتی گئی، سب کے چہرے مسکراہٹ سے سجتے گئے۔ سندرے بھی کھل کر مسکرادی۔

☼ ☼ ☼

تانیہ اپنی امی کے ساتھ آچکی تھی۔ تانی کی طرح وہ

بھی بہت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں تھیں مگر لہجہ اور شخصیت دونوں ہی زبردست تھے۔ گل نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ وہ تھی بھی سلیقہ مند' جبکہ سندرے اس کی جڑواں بہن ہونے کے باوجود اس معاملے میں بالکل کوری تھی۔ اس نے تمام خبریں ان تک پہنچادیں تھیں۔ تاکہ وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرسکیں۔

"آپی! یہ صدف لوگ کہاں ہیں؟" پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد جب تائی سے رہا نہ گیا تو اس نے پوچھ لیا۔

"ہاں چلو' ان کو لے کر آتے ہیں۔" گل نے آنٹی کے پہلو سے اٹھتے ہوئے کہا جو پندرہ منٹوں سے اسے چمٹائے بیٹھی تھیں۔

"ارے کہاں چلیں بیٹا! کچھ دیر تو بیٹھو۔"

"الہٰی خیر' یہ مجھ پہ اتنا لٹو کیوں ہو رہی ہیں؟ کہیں ان کے کوئی اور صاحبزادے بھی... اللہ نہ کرے۔" اس نے دل ہی دل میں اپنے خدشات چھپا کر آنٹی سے مسکرا کر اجازت لی اور تائی کو لے کر سیدھا سندرے کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

حسب توقع وہاں سب کے چہرے لٹک رہے تھے۔

"خیریت تو ہے' کیا ہوا' سندرے کہاں ہے؟" اس نے تائی کا ہاتھ چھوڑ کر لہجے میں جھوٹ موٹ کی فکر پیدا کی۔

"وہ وہ..." ایمان ہچکچائی۔

"کیا ہوا ہے' آپ سب لوگ ٹھیک تو ہیں؟" تائی حقیقتاً" پریشان ہو گئی۔

"میں پوچھتی ہوں' سندر کہاں ہے؟" گل نے لہجے میں رعب پیدا کیا تو ایمان سر جھکا کر بولی۔ "اسٹور میں"

"او میرے خدا۔" گل تیزی سے کمرے سے نکل کر اسٹور کی طرف بھاگی۔

سب کسی چرواہے کے ریوڑ کی طرح اس کے پیچھے تھے۔ اسٹور کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈرامے کے اگلے سین کے عین مطابق فاران اور ذیشان سر پکڑے صندوقوں پر بیٹھے تھے' جبکہ ازعان پیٹی (لوہے سے بنا ایک بڑا صندوق ہوتا ہے' جس میں چھوٹے صندوق' لحاف اور بہت سارا سامان اکٹھا آسکتا ہے۔) پر تقریباً" اوندھا گرا' مگرمچھ کے آنسو گرانے میں مشغول تھا۔

"یہ اتنا رو کیسے رہا ہے؟" گل کو ڈائیلاگ بھول کر ازعان کی بہترین ایکٹنگ کی فکر لگ گئی۔

"خود ہی تو کہا تھا' سارا گلیسرین لگا کر آنا' اس نے بھی لگالی ہوگی۔" ایمان نے سرگوشی کی۔

"اوہ۔" اس نے سر ہلایا۔ وہ فوراً" ڈرامے کی طرف پلٹی۔

"کیا ہوا ہے' تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو' سندرے کہاں ہے؟" اس نے فاران کا کندھا ہلا کے پوچھا۔

وہ آنسوؤں بھری آنکھیں اس کے چہرے پہ ٹکا کر بولا۔ "تائی کے سامنے ہی بتادوں کیا؟"

"تو اور کیا' ایک نہ ایک دن تو اسے پتا چلنے کا ہی' اچھا ہے' ابھی سے پتا چل جائے۔" ذیشان نے بھی روتی ہوئی نم آنکھیں آستینوں سے صاف کیں۔

"کیا بکواس ہے۔" گل بپھری۔

"سندرے پھر پیٹی کے اندر چلی گئی۔"

"کیا؟ ہٹو میں دیکھتی ہوں۔" اس نے ازعان کو پیچھے دھکیل کر پیٹی کا ڈھکن اٹھایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ باقی سب جو اس کے پیچھے ہی تھے' یک دم ہی اچھلے تھے۔

"اب اتنا بھی ڈراؤنا چہرہ بنانے کے لیے نہیں کہا تھا کہ میں سچ مچ ہی ڈر جاؤں۔" گل نے ایمان کے کان میں غصیلی سرگوشی کی۔

"خبردار' جو کوئی میرے نزدیک آیا۔"

اس لمحے پیٹی کے اندر سے سندرے کی جگہ کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ "یہ کون بے غیرت ہے اور ہمارے گھر میں کیا کر رہا ہے؟" گل نے پھر ایمان کے کان میں سرگوشی کی۔ "کوئی مرد نہیں ہے اپنی سندرے ہے۔"

"اوہ۔" گل نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔

"بند کردو تاج محل کا دروازہ' شہزادہ سلیم روشنی سے سخت بے زار ہیں۔" سندرے نے اداکاری اور ڈائیلاگ ڈلیوری میں مادھوری کو بھی مات دے دی تھی۔

"اف! مجھے تو اس کی حالت پہ رونا آرہا ہے۔" ایمان نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"مجھے بھی۔" گل نے بھی اس کی تائید کی۔ "مگر رونا آکیوں نہیں رہا؟" اس نے اپنے آنسو چیک کرتے ہوئے ایمان کے کان میں سرگوشی کی۔ "اوہ! ہم تو گلیسرین ڈالنا ہی بھول گئے۔" ایمان کے کہنے پہ گل نے اسے گھور کے دیکھا۔

"یہ تم لوگ کیا کھسر پھسر کر رہی ہو' چلو باہر جاؤ' خوامخواہ تائی بے چاری کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔"

فاران نے جیسے ان کی توجہ تائی کی طرف دلائی' جو آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر آنسو لیے چپ چاپ پیٹی میں قید اپنی پیاری سندرے کو اس حال میں تکے جا رہی تھی۔

"چلو تائی!" گل اسے پکڑ کر کمرے سے نکل آئی اور ان کو بھی آنٹی کو سلام کرنے کا کہا۔ ایمان نے احتیاطاً" پیٹی کی کنڈی چڑھادی۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں چلے گئے' جبکہ گل تائی کو کمرے میں لے آئی۔

"تم لوگوں کو حق ہے تائی انکار کرنے کا' کیونکہ سندرے پہ دیو کا قبضہ ہے۔"

"دیو؟" وہ تو دل و جان سے دہل گئی۔

"اور ہاں! کسی سے بھی اس کا ذکر مت کرنا۔ ورنہ تمہارے گھر تک پہنچ آجائے گا۔ بس تم طریقے سے اپنی امی کو منع کردو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم جیسے اچھوں کے ساتھ کچھ بھی برا ہو۔"

(اللہ کرے' برا ہی ہو تمہارے ساتھ) اس نے دل ہی دل میں کوستے ہوئے پوری طرح اچھا بننے کی اداکاری کی۔

☼ ☼ ☼

تائی کے اصرار پر آنٹی بہت جلدی اٹھ گئیں۔ حالانکہ گل نے بہت اصرار کیا کہ کھانا کھا کر ہی جائیں۔ سب لڑکیوں' لڑکوں نے سکھ کا سانس لیا۔ اور سیدھا سندرے کے کمرے میں آکر سوکھے ہوئے پتوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے۔

"ہائے اللہ' تم سب نے کیا شان دار اداکاری دکھائی ہے۔ ایسے لگ رہا تھا' جیسے بالی ووڈ کے بڑے بڑے اداکار ایک چھت کے تلے جمع ہو گئے ہیں۔" ایمان نے مبالغہ آرائی کی۔

"میں نے بھی تو رام گوپال ورما اور سید نور کو پیچھے چھوڑ دیا ہدایت کاری میں۔" گل نے فرضی کالر جھاڑے۔

"مگر سچ یار! تھک بہت گئی ہوں۔" اس نے لمبی جماہی لی۔

"ہاں' ویسے اداکاری تو سندرے کی بھی لاجواب تھی' میں تو سچ میں ڈر گیا تھا۔" فاران نے بھی تعریف جھاڑی۔

"تو کی ماں ہے۔" ازعان جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

"تمہیں کیا ہوا؟" سب نے اسے کوفت سے دیکھا۔

"سندرے..." اس کی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور جب سمجھ میں آیا تو سب آ... کی لمبی چیخ مارتے عینک والے جن کی طرح اسٹور میں نازل ہوئے۔

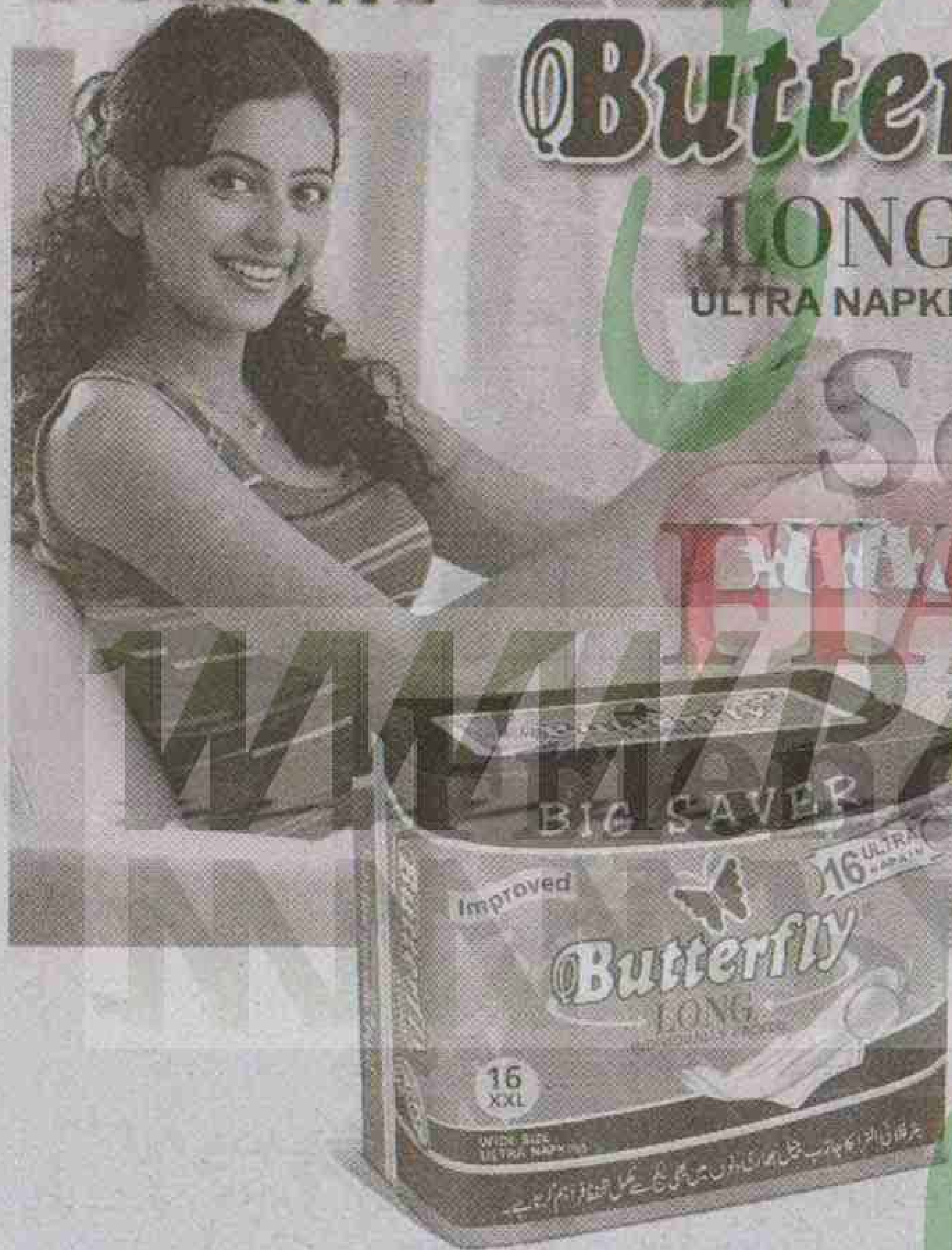
پیٹی کا ڈھکن کھلتے ہی گرمی اور پسینے سے بے حال اور بدشکل چڑیل نظر آنے والی سندرے جمپ لگا کر باہر آئی تو سب نے باہر کی طرف دوڑ لگادی۔

☼ ☼ ☼

سندرے کو امی' دادو اور چچی نے دادو کے کمرے میں طلب کیا تھا' جب سے سب لڑکے لڑکیوں کا ٹہل ٹہل کے برا حال تھا۔ اب آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا' مگر سندرے کا کچھ پتا نہیں تھا۔

"پتا نہیں کیوں بلایا ہوگا۔" گل پریشان تھی۔

"تم نے تواضع تو ٹھیک کی تھی نا۔" ایمان کو



مہمانوں کی فکر تھی۔

"ہاں ہاں چائے کباب رولز سموسے اور پتا نہیں جو جو بن پایا سب ہی سرو کر آئی تھی۔ آنٹی تھیں تو بہت خوش۔" گل نے وضاحت دی۔

"تانی نے بھی ہمارے سامنے تو آنٹی کو کچھ نہیں بتایا کہیں گھر جا کر بتا نہ دیا ہو اور آنٹی نے معذرت کا فون کیا ہو؟" صدف نے اپنی عقل جھاڑی تو سب اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"ہائے اللہ پھر تو سمجھو میری شامت پکی سب سے زیادہ تو میں ہی بولی تھی۔" گل فکر مند ہوئی۔

اسی لمحے سندرے اندر داخل ہوئی مسکراتی ہوئی گنگناتی ہوئی سب اس کی طرف دوڑے۔

"کس لیے بلایا تھا؟" یہ صدف تھی۔

"کیوں بلایا؟" فاران بھی نہ چپ رہا۔

"ڈانٹ تو نہیں پڑی؟" اذعان ہمیشہ کی طرح اپنی بہن کی فکر میں دبلا ہوا۔

"کہیں اداکاری کا انعام تو نہیں ملا؟" ذیشان عسد اکا جل ککڑا۔

وہ آرام سے چلتی اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ "آپ سب لوگوں کے لیے بریکنگ نیوز۔" وہ نہایت جوش سے گویا ہوئی تو سارے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"یہ دیکھو!" اس نے ایک تصویر گل کے سامنے پھینکی۔ "تانی کا بھائی ہے۔"

"واؤ۔" گل چہکی۔ "کتنا ہینڈسم ہے۔ بہت گڈ لکنگ ہے۔" ایمان بھی خوش ہوئی۔

"یار! تو کیا تم نے فیصلہ بدل لیا؟" فاران پرجوش ہوا۔

"اچھا ہوا کیا یہ بکو۔" گل پھر تڑپی۔

"دیکھ لو پھر سب سے زیادہ تم ہی اچھلو گی۔" سندرے نے کل والا بدلہ چکایا۔

"ارے میرے خیال میں تو اتنا خوب صورت ہے کہ اگر میں ہوتی تو فوراً ہاں کر دیتی اس لیے مجھے قوی امید ہے کہ تم نے بھی ہاں کر دی ہوگی۔ کیوں؟" گل نے اندازہ لگایا۔

"اب بتا بھی دو سندرے۔" ایمان تڑخی۔

"اوکے تو سنو۔" سب ہمہ تن گوش ہوئے۔

"تانی کی امی آئیں تو میرے لیے تھیں مگر بھا گئی ان کو فرماں بردار سلیقہ شعار گل سو انہوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کا کہہ دیا اور امی ابو سمیت سب بزرگ راضی ہیں۔ میرے ذمے ابو نے یہ کام لگایا کہ گل کی مرضی معلوم کروں تو گل نے ابھی چونکہ اپنی رضامندی دے دی ہے سو جمعرات کو منگنی پکی۔" آخر میں سندرے پرجوش ہوئی تھی۔

گل منہ کھولے ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے اسے گھورے جا رہی تھی۔

"ارے تمہیں کیا ہوا؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے اتنا ہینڈسم لڑکا مل گیا اور پھر دیکھ بھی..." سندرے نے شرارت سے ایمان اور صدف کی طرف دیکھتے ہوئے زبان روکی۔

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

اب کی بار وہ تینوں یک زبان ہو کر بولیں۔ لڑکے بالکل سیانے احتساب شدہ سیاست دانوں کی طرح چپکے سے ہجرت کر گئے تھے مگر بے چاری لڑکیاں۔

کچھ ہی دیر بعد ان تینوں کی چیخ و پکار عرش ہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کیونکہ گل نامی خونخوار و سرپھری بلی اپنے لمبے ناخنوں اور نوکیلے دانتوں سے ان تینوں پہ حملہ آور ہو چکی تھی۔



نایاب جیلانی

دریچہ کھولیے

مکمل ناول

سنہری دھوپ نے اپنے پر سمیٹے تو ماہ کامل بھی تسبیح ہاتھ سے رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نیلا آکاش سیاہی مائل ہونے کے قریب قریب تھا۔ چڑیوں اور ابابیل کے غول کے غول پھدکتے جا رہے تھے۔ سب ہی کو اپنے اپنے آشیانے کی طرف بھاگنے کی جلدی تھی۔ وہ پنجرے میں موجود تیتر اور بٹیر کی جنگ دیکھنے کے بعد سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھی۔

آج فاتح کا انٹرویو تھا۔ اور یہ انٹرویو اس کی زندگی کا سب سے مشکل ترین انٹرویو تھا۔ اس نے مقابلے کا امتحان دے رکھا تھا۔ اس کی پوزیشن آٹھویں تھی۔

اب سارا دارومدار انٹرویو پر تھا۔ اس انٹرویو میں کامیابی اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اگر وہ ناکام ہو جاتا تو شاید مر جاتا۔

فاتح، ماہ کامل کا چچا زاد بھی تھا اور منگیتر بھی۔ ابا نے باقاعدہ منگنی تو نہیں کی تھی تاہم فاتح مطمئن تھا کہ ماہ کامل اسی کی ہے۔ اسی اطمینان کی وجہ سے وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا کچا پکا گھر راج اقبال کا تھا۔ مستری اقبال ذات پات کے لحاظ سے خاندانی جٹ تھا مگر ان کے بزرگوں نے ان کے لیے کوئی اثاثے نہیں چھوڑے تھے، سوچ بیٹھے کے لحاظ سے

وہ معمار تھا۔ غربت اس کے گھر کی بہت پرانی باسی تھی اور مستری اقبال کا کل سرمایہ اکلوتی بیٹی ماہ کامل اور بھتیجا فاتح تھا۔ فاتح کی تعلیم و تربیت کے لیے مستری اقبال نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔

یہ جیٹھ کی گیارہ تاریخ کی بات ہے۔ گرمی اپنے زوروں پر تھی، جب فاتح نے ماہ کامل سے کہا۔

"ماہے! میں نہر کی طرف جارہا ہوں۔ دو، چار ڈبکیاں لگانے، یار دوست بھی ساتھ ہوں گے۔ واپسی پر کچھ دیر ہوجائے گی۔"

اس وقت وہ منڈیر پر کھڑی گھر سے کچھ فاصلے سے گزرتی نہر کی طرف دیکھ رہی تھی، جب ایک دم اس کی چیخ نکل گئی۔

"فاتح! جلدی اوپر آؤ، دیکھو تو، کسی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ایک ٹرک، کار سے ٹکرا گیا ہے اور کار نے اتنی قلابازیاں کھائیں، ٹرک کا ڈرائیور ٹرک سمیت بھاگ گیا۔ کار کھائی میں سڑک کے دوسری طرف گری ہے۔ ہائے اللہ! یہ کیا غضب ہوگیا۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے کار میں۔" وہ مسلسل چیختی جارہی تھی۔

"فاتح! اوپر آؤ۔"

"اوپر بلائے جارہی ہو پاگل! میں وہاں جاکر دیکھتا ہوں۔" فاتح اوپر آنے کے بجائے باہر کی طرف بھاگ گیا تھا اور پھر اس کی واپسی تین گھنٹے بعد ہوئی۔ زخموں سے چور چور وہ اجنبی بھی اس کے ساتھ تھا۔ گاؤں کے معالج نے کچھ تو ابتدائی طبی امداد دے دی تھی۔ تاہم زخمی کو شہر لے جانا ضروری تھا۔

ماہ کامل اس وقت دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھی۔ ایک غیر ارادی سی اس کی طرف نظر اٹھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ حالانکہ سامنے موجود زخم زخم سا وہ اجنبی کوئی یونانی شہزادہ بھی نہیں تھا، مگر پھر بھی ماہ کامل کا دل لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھ کر دھڑکنا بھول گیا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ ہر زخمی جان دار اس کے دل میں گویا گڑ کر رہ جاتا۔

اس اجنبی مہمان کو اسپتال سے آکر واپس اس گھر میں رہتے ہوئے دن، ہفتے اور مہینے گزر گئے تھے۔ اس کی مہمان نوازی کرتے اس کی خدمت کرتے، تیمار داری کرتے ہوئے عجیب سا سرور اور خوشی کا احساس دل میں بھرا رہتا تھا۔

"کیا یہ محبت تھی؟" وہ خود بھی چونک چونک جاتی تھی۔ ٹھٹک ٹھٹک جاتی تھی۔ گھڑی گھڑی پریشان ہوتی، گھڑی گھڑی حیران ہوتی۔ بھلا محبت ایسے بھی ہوجاتی ہے؟

پھر ایک دن اپنی بے قراریوں اور بے چینیوں کو اس نے اجنبی کے سامنے عیاں کر دیا تھا اور وہ گویا اس کی بات سن کر ساکت و صامت رہ گیا، گویا پتھر کا مجسمہ ہو اور وہ اپنی ہمیشہ والی سادگی اور معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے ارباب!" وہ ماہ کامل تھی یعنی پورا اور مکمل چاند، اس کے منہ سے کھلا اظہار محبت نے ارباب کی سانسوں کو لمحہ بھر کے لیے روک دیا تھا۔

"بغیر جانے، بغیر پرکھے، بغیر سمجھے تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟" اس کا لہجہ بلا کا تلخ تھا۔ پیار اور میزبانی کا خیال آڑے آگیا تھا، ورنہ نہ جانے وہ کیا کچھ بول دیتا۔

"ہاں۔" وہ پر یقین بھی تھی اور با اعتماد بھی۔

"تم جانتی ہو میں کون ہوں؟" وہ ایک دم گہرے، سلگتے لہجے میں بولا۔

"نہیں، مگر تم بتادو کہ تم کون ہو؟" ماہ کامل نے بغیر جھجکے سادگی سے پوچھ لیا۔ ارباب کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں تکلیف دہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس وقت کمرے میں تین افراد موجود تھے۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" وہ گویا تول تول کر بول رہے تھے۔

"میں اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کرچکا ہوں۔"

مبرم نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بہت مضبوط اور ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟" انہوں نے کاٹ دار انداز میں کہا۔

"بخوبی جانتا ہوں، پھر بھی مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں۔" مبرم نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اویس اور گوشی مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"تمہاری معذرت کی ایسی کی تیسی۔" وہ پھر سے بھڑک اٹھے۔ "جمعہ کی شام کو تمہارا نکاح ہے، اچھی طرح سے سن لو۔"

"اور مجھے یہ نکاح نہیں کرنا، آپ بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔ مجھے گوشی سے شادی نہیں کرنا۔ میں شادی کروں گا تو صرف اسی کے ساتھ، جس کے ساتھ میری بات طے تھی۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا، جبکہ اماں گویا دل تھام کر رہ گئیں۔

"مبرم!" باپ کے لہجے میں پھنکار نما دھاڑ تھی۔

☼ ☼ ☼

فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے ایک نظر موبائل کو دیکھا تھا، پھر اپنا بے بی پنک ٹاول اٹھا کر گردن اور چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ دائیں ہاتھ میں پکڑا ریکٹ اس نے بیڈ پر پھینک دیا تھا۔ بیل ایک دفعہ پھر سے بجنے لگی۔ وہ بے نیازی سے گیلے، گردن سے چپکے بال سمیٹ کر کیچر میں جکڑنے کے بعد اپنے جاگرز اتار رہی تھی۔

موبائل کی طرف دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قدر تسلسل سے بیل دینے والا مستقل مزاج کون ہے۔ پھر فون ایک دم بند ہوگیا تھا۔ کچھ دیر بعد میسج کی ٹون سنائی دی۔

"تم میرا فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہی ہو؟ فرام مبرم"

میسج دوسرے نمبر سے سینڈ کیا گیا تھا۔ وہ اس کی چالاکی پر تاؤ کھا کر رہ گئی تھی۔

اس کے کمرے میں موجود تینوں فون ایک تسلسل سے بجنے لگے تھے۔ لینڈ لائن فون اور وائرلیس کو دانت کچکچا کر دیکھتے ہوئے اس نے سیل فون اٹھا لیا تھا۔ دوسری طرف سے گویا وہ پھٹ پڑا۔

"ٹینس گراؤنڈ سے تمہارے گھر تک کا فاصلہ اتنا تو نہیں ہے، جو تم نے پچاسویں بیل پر کال ریسیو کی ہے۔" اس کے اکھڑے اکھڑے لہجے کو سن کر وہ تلملا ہی تو گئی تھی۔

"دیکھیے مسٹر!" وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اسے کافی سرعت سے ٹوک دیا گیا۔

"مبرم نیازی۔ میرا نام مشکل تو نہیں، پھر بھی تمہیں یاد دلانا پڑتا ہے۔" اس کا لہجہ پھر بھی طنزیہ اور کاٹ دار قسم کا تھا۔ بغیر طنز کیے تو وہ کوئی بھی بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"کہو کیا کہنا ہے؟" وہ گویا سلگ کر رہ گئی۔

"صرف چند گنتی کے دن رہ گئے ہیں شادی ہونے میں، تمہاری طرف سے ابھی تک کوئی آواز بلند نہیں ہوئی، تم جو خاموش رہ کر فرماں برداری کا ایوارڈ حاصل کرنا چاہتی ہو نا، بہت بری طرح سے پچھتاؤ گی۔" مبرم کا انداز صاف دھمکانے والا تھا، تب ہی تو وہ اور بھی سلگی۔

"اتنے ہی دلیر، جری اور بہادر ہو نا، تو پھر خود اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہو کر انکار کر دو، ایک کمزور عورت کو ہتھیار کیوں بناتے ہو؟"

"ویرا! تم اچھا نہیں کر رہی ہو، ابھی بھی وقت ہے، سمجھ لو میری بات، میرے اور تمہارے ستارے نہیں ملتے۔" وہ گویا چڑ کر چیخا تھا۔ "میں گوشی سے پیار کرتا ہوں، وہ میری بچپن کی منگ ہے اور میں شادی کروں گا تو صرف گوشی سے۔"

"ایک کے بجائے دس شادیاں کر لو میری بلا سے۔" وہ ہمیشہ اسی طرح سے بے نیازی دکھا جاتی تھی۔ "مگر انکار میری طرف سے نہیں ہو گا۔" ساتھ جتا بھی دیا گیا۔

"خود کو سمجھتی کیا ہو؟" مبرم کا پارہ چڑھ گیا۔ "میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ اگر اس نام نہاد منگنی کو توڑنے کی ہمت تم میں نہیں تو پھر میرے ساتھ دوزخ میں جلنے کے لیے تیار ہو جانا۔ ایک دن بھی سکھ کا نصیب نہیں ہو گا تمہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ دوزخ میں جلنے کے لیے تیار ہوں۔ آفٹر آل تم میرے منگیتر ہو، دو سال سے یہ ایک تولے کی موٹی سی زنجیر نما چین تمہارے نام کی پہن رکھی ہے۔" ویرا ابھی اسے جلانے سے باز نہیں آئی تھی۔

"تو... تم انکار نہیں کرو گی؟"

"نہیں۔" اس نے صاف جھنڈی دکھا دی۔

"تمہیں میرے ساتھ شادی پر اعتراض ہے تو خود اپنے والد بزرگوار سے کہو، ایک طرف پیار پیار الاپتے ہو اور دوسری طرف چار ایکڑ زمین سے ہاتھ دھونے کا غم بھی جان کو لگا رکھا ہے۔ گوشی سے اتنی محبت ہے تو لعنت بھیجو زمین جائیداد پر۔" اس نے چار مربع کو چار ایکڑ محض اسے جلانے کے لیے کہا تھا۔

"چار ایکڑ... اس زمین پر میں دس مرتبہ لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ اس کے طعنوں کے جواب میں بلبلا اٹھا۔ "تم جیسی خود غرض لڑکی کو کیا خبر کہ خاندان سے کٹ کر رہنا کس قدر مشکل ہے۔"

"یا خاندان بچا لو یا محبت۔" اس نے صاف طنز کیا۔

"میں تمہارا حشر کر دوں گا۔ پچھتاؤ گی تم، مگر وقت تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔" اب وہ اپنے خطرناک ارادوں کا رعب ڈال کر اسے خوف زدہ کرنا چاہ رہا تھا۔

"تم جیسے "بہادر" آخر میں دھمکیوں پر ہی اتر آتے ہیں۔ تمہارے بھیجے میں یہ بات کیوں نہیں سما سکتی کہ تم مرد ہو کر اپنے باپ کے مقابل کھڑے ہونے سے ہچکچاتے ہو تو میں کیسے اپنے جان نچھاور کرنے والے باپ کو دھوکا دینے کا سوچ سکتی ہوں۔ اگر تم بے بس ہو تو میں تم سے دس گنا زیادہ مجبور ہوں۔" وہ گویا رخ کر بولی۔

"ہونہہ مجبور۔" وہ طنز سے بولا۔ "اس وقت باپ کا خیال کر لیا تھا جب یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے مری جا رہی تھیں۔ ٹینس گراؤنڈ میں شوق پورا کرتے ہوئے ہی باپ کا خیال کر لیتیں۔ شہر کی سڑکیں ناپتے ہوئے کون سی مجبوری تمہیں باندھے ہوئے ہے۔ یہاں نیاز پور میں آ کر سارے کس بل نکل جائیں گے۔ ہماری عورتیں یوں آزادانہ نہیں گھومتیں۔ سچ میرے منہ سے نہ ہی نکلتا تو بہتر تھا۔ تاہم تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں یہ سب تمہارے منہ پر ہی کہہ دوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم میرے "معیار" پر پورا ہی نہیں اتر سکتیں۔ تمہاری سوچ، رہن سہن اور طرز زندگی میرے معیار سے میچ نہیں کر سکتے۔ سو ہمارے راستے جدا ہی رہیں تو بہتر ہیں۔" وہ بولتا ہی چلا گیا۔

"بات یہ ہے کہ تمہارے جیسے حاکمانہ نیچر کے آدمی کی انا بہت بے چین ہے۔ تمہیں ایسی عورت پسند ہے جس پر تم حکومت کر سکو۔ گوشی میں تمہیں

اپنا آئیڈیل نظر آتا ہے۔ خوف زدہ، دبو اور بے زبان گائے۔ جبکہ میری صورت میں تمہارے حاکم پسند مزاج کی تسکین نہیں ہو سکتی۔" وہ ویرا ہی کیا جو دوبدو جواب نہ دے۔

"جسٹ شٹ اپ۔" مبرم یکدم دھاڑا۔ اسے ویرا کا یہی انداز آگ لگا دیتا تھا۔ "تم انکار کرو گی اور ضرور کرو گی۔"

"انکار کرتی ہے میری جوتی۔" غصے میں وہ بھی دیہاتی پن پہ اتر آئی تھی کہ جڑیں تو آخر دیہات سے ہی تھیں۔ شاخیں اگرچہ کہیں کہیں شہروں میں بھی جا نکلتی تھیں۔

"میں گوشی سے شادی کر کے رہوں گا۔"

"شوق سے کر لینا۔ پہلے ادھر بارات لے کر آنے کی تیاری کرو۔" ویرا کیا خوب لطف اٹھا رہی تھی۔

"نیاز پور میں آنے کے بعد "عیاشیوں" کو بھول جانا۔ بڑی سخت زندگی ہے یہاں کی۔ کیوں خود کو عذاب میں ڈالنا چاہتی ہو۔"

"مجھے کالے پانی کی سزا بھی قبول ہے صرف اپنے بابا جانی کے لیے۔"

"بڑی فرماں بردار ہو؟ تمہیں اس سعادت مندی پر کوئی میڈل تو ہرگز نہیں ملے گا۔" وہ کھرے کاٹ دار لہجے میں بولا۔

"اچھا، اب غصہ تھوک دو۔" ویرا نے موضوع بدلنا چاہا۔ لہجہ بھی خاصا نرمی لیے ہوئے تھا۔ اس نرمی کا مبرم پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

"دیکھو ویرا میں نے اپنی ماں اور گوشی کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے۔ ابو محض مجھے جھکانے کے لیے تمہیں درمیان میں لے آئے ہیں۔ تم ویل ایجوکیٹڈ ہو۔ یہاں آ کر اپنی شناخت کیوں کھونا چاہتی ہو۔ میں کسی کے ساتھ بھی زیادتی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے گھر میں تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ نہ محبت نہ عزت۔ نہ خلوص نہ پیار۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میری تین عدد بہنیں اور ماں گوشی کے علاوہ کسی اور کو میرے ساتھ دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ان کا رویہ کبھی بھی تمہارے ساتھ اچھا یا بہتر نہیں ہو سکے گا۔ ابو اس ضد میں بہت نقصان اٹھائیں گے لیکن سب سے زیادہ نقصان تمہارا ہو گا۔"

"مجھے تو یہ بہترین ایڈونچر یا پھر کوئی مزیدار سا چیلنج نظر آ رہا ہے۔ دیکھیں گے کہ کیا کیا ہوتا ہے۔" وہ یوں بول رہی تھی گویا کسی اور کے متعلق گفتگو کر رہی ہے۔ اور مبرم اپنی اتنی لمبی تقریر کو بے اثر جاتا دیکھ کر پھر سے شائستگی کا چولا اتار بیٹھا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر بھگتتی رہنا۔ کل کو مجھے کسی بھی بات پر ذمہ دار مت ٹھہرانا۔ میں نے من و عن سچائی تم تک پہنچا دی ہے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ ضمیر مطمئن ہے اور میں تم پر بار بار واضح کر رہا ہوں کہ میں شادی کروں گا تو صرف گوشی سے۔ تم صرف نام کی حد تک بیوی ہو گی۔"

اس نے ایک ایک لفظ گویا چبا چبا کر ادا کیا تھا، اور پھر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ویرا جو کافی دیر سے خود کو مضبوط کیے ہوئے تھی، ایک دم بھربھری ریت کی طرح بکھر بکھر گئی۔

مبرم کی فون کال نے اسے بے حد اپ سیٹ کر دیا تھا۔

مبرم کا لہجہ، انداز اور باتیں اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں گویا، اور یہ نئی بات تو نہیں تھی۔ جب سے چاچا جی اس کی مبرم کے ساتھ منگنی کر کے گئے تھے تب سے ہی ایسی صورت حال کا سامنا تھا۔ دو سال ہو چکے تھے۔ اس نام نہاد منگنی میں چاچا جی کے علاوہ اس کے بابا ہی موجود تھے۔

ہوا کچھ یوں کہ چاچا جی زمینوں کے کیس کی تاریخ بھگتنے کے لیے شہر آئے تھے۔ جب بھی وہ شہر آتے تھے۔ ان کا قیام ان ہی کے گھر میں ہوتا۔ بابا اور چاچا جی میں پیار بھی بلا کا تھا۔ بابا چھوٹے بھائی کو آج تک ادب و احترام سے بلاتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ یونیورسٹی سے نمایاں کامیابی کے بعد فارغ ہوئی تھی۔ اسے دوران تعلیم ہی ایک دو پرائیویٹ کالجز سے لیکچرر شپ کی آفرز

مل رہی تھیں سو اس نے آئی ٹی ایم کالج میں اپنی سی وی بھجوادی تھی۔

چاچا جی کو اس کی کامیابی کی خبر کیا ملی' وہ مٹھائی کے ٹوکروں سمیت ان کے گھر آموجود ہوئے۔ ساتھ وہ ایک بہت ہی خوبصورت ڈیزائن کی کافی بھاری سونے کی چین لائے تھے اور بڑی محبت سے انہوں نے وہ چین اس کے گلے میں پہنادی تھی۔ وہ چاچا جی کی پسند کو خوب سراہنے کا سوچ رہی تھی' جب چاچا جی نے بابا کے ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے کہا۔

"آج سے ویرا بیٹی میرے مبرم کی امانت ہوئی۔"

وہ بڑی آس بھری نظروں سے بابا کو دیکھ رہے تھے۔ بابا کی طرف سے مثبت رد عمل نے چاچا جی کو گویا ہفت اقلیم کی دولت سے نواز دیا تھا۔

اس زبانی کلامی منگنی کے بعد نیاز پور سے کبھی چاچی یا مبرم کی بہنوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ کسی نے ٹیلی فونک رابطہ رکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اکثر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مبرم اور چاچی وغیرہ کے سرد رویے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ان دو سالوں میں بارہا مبرم چاچا جی کے ساتھ اپنے کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں شہر آتا رہا تھا۔

مبرم کو کئی مرتبہ قریب سے دیکھنے کے بعد اور اس سے پہلے بھی وہ اس نئے رشتے کی بدولت اپنے دل میں کافی نرم جذبات محسوس کرنے لگی تھی۔

مبرم کے لیے یہ میٹھے میٹھے جذبے وقت کے ساتھ ساتھ نشوونما پا رہے تھے۔ پھل پھول رہے تھے۔ اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔

اگرچہ اس نے گوشی کے بارے میں بھی کافی اڑتی اڑتی خبریں سن رکھی تھیں مگر ان خبروں کی صداقت پر اسے یقین نہیں تھا۔

نیاز پور والوں سے اس کا رشتہ بہت گہرا اور اٹوٹ تھا۔ اس کے بابا اور چاچو جی صرف دو بھائی تھے۔ دونوں میں بلا کا اتفاق اور پیار تھا۔ چاچا جی پڑھائی میں کچھ کمزور تھے جبکہ اس کے بابا بہت ذہین اور محنتی۔ سو تعلیم کے میدان میں وہ چاچا جی سے آگے نکل گئے تھے۔

بابا کی شادی بھی شہر میں ہوئی تھی سو وہ مستقل شہر میں ہی شفٹ ہو گئے تھے۔ ویرا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس سے چھوٹے تین بھائی کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ منگنی سے ایک سال پہلے اس کی بہت ہی خلیق الطبع امی بھی انہیں تنہا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔

امی اور چاچی کے تعلقات بالکل روایتی سے تھے۔ چاچی کافی تنگ مزاج تھیں۔ بہت موڈی اور نک چڑھی خاتون تھیں۔ شاید وہ کچھ کچھ احساس کمتری کا شکار بھی تھیں۔ انہوں نے بھی خیر سے اسکول کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ تاہم چاچو کو اپنی اولاد کو اعلا تعلیم دلوانے کا خاصا شوق تھا۔ مگر ان کا اکلوتا نور چشم ان کی اس خواہش کو شاید قسطوں میں پورا کرنا چاہتا تھا۔

چاچا کی خواہش تھی کہ مبرم انگریزی میں ماسٹرز کرے اور وہ اسے اعلا تعلیم کے لیے باہر بھجوادیں مگر مبرم تھا پکا زمیں والا... اپنی سونا اگلتی زمینوں کا عاشق' وہ یونیورسٹی آف ایگری کلچر فیصل آباد سے زراعت میں ماسٹرز کرنے کا خواہشمند تھا مگر چاچا جی کی ضد نے اسے بھی "ضد" دلادی تھی۔ اور وہ کسی بھی طریقے سے ان کی خواہش پوری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو ابھی تک ایم اے فائنل کی کلاسز بڑے شوق سے اٹینڈ کرتا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز اب تک عملی زندگی میں بھی قدم رکھ چکے تھے مگر مبرم کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ بھی بلا کا ضدی ڈھیٹ اور بد دماغ واقع ہوا تھا۔ چاچا اگر سیر تھے تو مبرم سوا سیر۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا ایم اے پارٹ ون کے فائنل ایگزامز میں بھی چاچا زبردستی مبرم کو پکڑ کر اس کے پاس لے آئے تھے۔ وہ شکل سے ہی بے حد بیزار لگ رہا تھا اور اب فائنل ایگزامز میں بھی وہ اسے ویرا کے پاس لے آئے تھے۔

"میں پرچے پر کچھ لکھوں گا' تب ہی پاس کریں گے نا۔"

مبرم نے ناک چڑھا کر زیر لب کہا تھا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ چاچا کا دھیان اس کی طرف نہیں

تھا۔ ورنہ یہ دونوں باپ بیٹا کافی ۔۔۔ بدلحاظ واقع ہوئے تھے۔

بغیر کسی لحاظ کے ایک دوسرے پر ناک ناک کر حملے کرتے۔

چاچا تو اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر وہ مبرم ہی کیا جو وہاں ٹک کے کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ چاچا کے چلے جانے کے فوراً" بعد وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور ان سے پہلے ہی باہر بھی نکل گیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد پھر سے واپس آگیا۔ ویرا صوفے پر اطمینان سے بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی مگر اس کا سارا دھیان مبرم کی طرف تھا۔ وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد اب صوفے کے کشن اٹھا اٹھا کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کافی دیر کی تلاش کے بعد وہ ناکام ہوا تو بظاہر لاپروائی ویرا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے میری گاڑی کی چابی دیکھی ہے؟"

"چابی' کون سی چابی؟" وہ چونک کر یوں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی گویا اس کی موجودگی کی اسے قطعاً" خبر تک نہیں تھی۔

"میری گاڑی کی چابی۔" مبرم دانت پیس کر گویا ہوا۔

"نہیں۔"

وہ صاف مکر گئی تھی۔ حالانکہ چاچا نے مبرم سے نظر بچا کر چابی اسے تھما دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے چلے جانے کے بعد مبرم آوارہ گردی کے لیے نہ نکل سکے۔

"ابو نے ضرور تمہیں چابی دی ہوگی۔" وہ بھی ٹلنے والوں میں سے نہیں تھا۔

"میرے پاس نہیں ہے اور میرا دماغ مت چاٹو۔ اگر پڑھنا چاہتے ہو تو جو کچھ میں کہوں گی' وہی کرنا ہوگا۔"

"تم سے میں پڑھوں گا۔ ہونہہ۔" مبرم نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"تو نہ پڑھو۔ لیکن سوچ لو' چاچا کو کتنا دکھ ہوگا۔" اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

"بڑی آئی چاچا کی ہمدرد۔" مبرم نے طنز کیا۔

"میں تو چاچا کے بیٹے کی بھی ہمدرد ہوں۔"

اونہہ! مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا چھوڑو۔ چائے پیو گے؟" ویرا ابھی اسے باہر نکلنے سے روکنا چاہتی تھی۔ چاچا جی نے بہت دفعہ تاکید کی تھی کہ مبرم کو باہر آوارہ گردی کے لیے نہیں جانے دینا۔

"میں نہیں پیتا چائے وائے۔"

"پھر کیا پسند ہے؟"

"میرے کھانے پینے کی آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" مبرم خواہ مخواہ تڑخا۔

"کیوں تمہاری اماں گوشی کو تو یہاں بھیجنے کا پروگرام نہیں بنا رہیں؟"

"گوشی تمہاری طرح ہر جگہ دندناتی نہیں پھرتی۔ ہمارے ہاں رواج نہیں کہ رشتہ داروں کے گھر لڑکیاں جا کے قیام کریں۔" وہ بھی دل کی جلن زبان تک لانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔

"تائیدی انداز میں سرہلانے لگی۔ "سینڈوچ اور کوک لاؤں تمہارے لیے؟" اس نے ایک دفعہ پھر موضوع بدل دیا۔

"سینڈوچ اور کوک تمہیں ہی مبارک ہوں۔ میں تو انبالہ سدھار رہا ہوں۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"شوق سے جاؤ۔" وہ بھی ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوگئی۔ "مگر جاؤ گے کیسے؟" بڑی معصومیت سے پوچھا جا رہا تھا۔

"پبلک ٹرانسپورٹ کس مرض کی دوا ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "میری گاڑی کی چابی کسی مزار پر چڑھا دینا۔ یا پھر تمہارے چاچا جی واپس تشریف لائیں تو چپکے سے ان کے ہاتھ میں دبا دینا تاکہ جاتے ہوئے کسی شو روم میں دیتے جائیں۔" مبرم بھی دل کی جلن زبان پر لے آیا۔

"اپنا والٹ چیک کرکے جانا ڈیئر کزن! کہیں انبالہ والے بل پے نہ کرنے کے جرم میں تم سے ڈش واشنگ کروانا نہ شروع کردیں۔" کچن کی طرف جاتے

جاتے اس نے شگوفہ چھوڑا تھا۔ مبرم نے بے اختیار اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا دیا تھا اور پھر اس کا دل سچ مچ دھک سے رہ گیا۔ والٹ جیب میں نہیں تھا۔

"میرا والٹ کہاں ہے؟"

"میرے پاس۔" وہ اطمینان سے بڑے سجاتی بولی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ دھپ دھپ کرتا غصے کے عالم میں سیڑھیاں چڑھ گیا تھا جبکہ ویرا دیر تلک ہنستی رہی تھی وہ اسے روکنے میں کامیاب تو ہو چکی تھی۔ سو اب اطمینان کے ساتھ سینڈوچز کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہ سارے سینڈوچ اس نے اب اکیلے ہی کھانے تھے۔

ویرا کے دادا کی نیاز پور میں خاصی زمینیں تھیں۔ شہر میں دو پلاٹ بھی تھے۔ شہر والے پلاٹ بھی بیچ کر انہوں نے مزید زمینیں خریدلی تھیں۔ مختصر سی اولاد تھی سو اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ مگر ویرا کے پاپا جب مزید پڑھنے کے لیے شہر چلے گئے تو دادا کو اپنی جلد بازی پر بلا کا افسوس ہوا۔ اگر وہ پلاٹ نہ بیچتے تو شہر میں ایک گھر بنا ہی سکتے تھے۔

پاپا کی جاب کیا لگی' وہ مصروف سے مصروف تر ہوتے چلے گئے تھے' گویا نیاز پور کا راستہ ہی انہیں بھول گیا تھا۔ دادا کے بعد چاچا جی ہی تھے جو باقاعدگی سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے اور انہوں نے فاصلوں اور دوریوں کو کبھی درمیان میں نہیں آنے دیا تھا۔

پاپا اور امی بہت کم گاؤں جاتے تھے سوامی کی چاچی کے ساتھ بے تکلفی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ امی بھی انہیں خاص پسند نہیں کرتی تھیں اور وہ بھی امی سے خوب خار کھائی تھیں۔

امی کی وفات کے بعد بھی چاچی کے ساتھ تعلقات بحال نہیں ہو پائے تھے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ چاچی کو بے شمار خدشات لاحق تھے۔

پہلا خوف تو انہیں یہ تھا کہ کہیں چاچا جی اپنی اکلوتی بھتیجی کا رشتہ مبرم سے طے نہ کردیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر ان کی اکلوتی بھانجی گوشی بھلا کہاں جاتی۔

گوشی سے ان کی محبت کا انداز ہی کچھ الگ تھا۔ بہن اور نشئی بہنوئی کے مرنے کے بعد وہ گوشی کو اپنے گھر لے آئی تھیں۔ ان ہی کی مہربان گود میں گوشی نے پرورش پائی تھی۔ سو اب وہ اپنی لاڈلی بھانجی کو بہو بھی بنانا چاہتی تھیں۔ مگر چاچی اور گوشی کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے تھے جب انہیں اطلاع ملی کہ چاچا جی ویرا کے ساتھ مبرم کا نام جوڑ آئے ہیں۔ یعنی مبرم اور ویرا کی بات طے ہوگئی تھی۔

چاچی اور ان کی بیٹیوں نے آج تک اس منگنی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور مانتا تو مبرم بھی نہیں تھا مگر جب چاچا نے اسے اپنی جائیداد سے عاق کردینے کی دھمکی دی تھی تو مبرم نے خواہ مخواہ ویرا سے عداوت پال لی تھی۔

مبرم کی آمد کے دوسرے دن ہی چاچی میراں بھی کشاں کشاں چلی آئی تھیں۔ بیٹے کی جدائی انہیں بھلا گوارا ہی کہاں تھی مگر شوہر کی وجہ سے مجبور ہوگئی تھیں۔ جو ان کے لاڈلے کو عالم فاضل دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی شوق کے ہاتھوں وہ مبرم کو یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ مبرم کی توجہ ویرا کی طرف مبذول کروانے کے لیے سارے پاپڑ بیلے جا رہے تھے۔

چاچی کی آمد سے ویرا بھی خاصا بوکھلا گئی تھی کہ چاچی کے میزائل اور بم بارود کا مقابلہ کرنا آسان کہاں تھا۔

یہ پہلی صبح کی بات تھی۔ ویرا اپنے دھیان میں مگن ناشتہ بنا رہی تھی جب چاچی دبے قدموں کچن میں داخل ہوئیں۔

"کیا کر رہی ہو؟" آواز اور انداز ایسا تھا کہ ویرا بری طرح سے بوکھلا گئی۔

"ناشتہ بنا رہی ہوں۔" سلام کے بعد اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

"دلسی" ریڑک گئی ہے؟" انہوں نے ارد گرد کا جائزہ لے کر کافی نخوت سے پوچھا۔ چاٹی اور مدھانی تو

کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

"جی۔" وہ توس ٹوسٹر میں سے نکال رہی تھی۔ ساتھ ساتھ آملیٹ بھی بن رہا تھا۔

"مبرم کا ناشتہ بنالیا؟" "یقیناً" وہ خود ناشتہ بنانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

"سب کا ناشتہ بن گیا۔" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "آپ بیٹھیے وہاں۔"

"کیوں؟" وہ تنک کر بولیں۔ "تم نے نظر بچا کر چائے میں تعویذ ملانا ہے۔"

"جی نہیں۔" ویرا سمجھ کر نفی میں سر ہلانے لگی۔ "بھلا مجھے تعویذوں سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟"

"کیوں فائدہ حاصل نہیں ہوگا؟ مبرم کو مٹھی میں کر لوگی۔" وہ چمک کر بولیں۔

"چاچی! ایک غلط فہمی تو اپنے ذہن سے نکال دیں۔" ویرا کا انداز پرسوچ قسم کا تھا۔

"کیسی غلط فہمی؟" وہ ناک چڑھا کر بولیں۔

"یہی کہ آپ کا ستون کی طرح لمبا اور بر آمدے جتنا چوڑا بیٹا میری ننھی سی مٹھی میں کیسے آسکتا ہے۔" اس کے سادگی بھرے انداز میں بھی شرارت چھپی تھی۔

"باتیں بنانا تو بہت آتی ہیں۔ ماں سے بس یہی کچھ سیکھا ہے۔" چاچی بھی بیٹے کی طرح طنز کے تیر پھینکنے کا سلیقہ رکھتی تھیں اور یہ تیر عین نشانے پر لگتے تھے۔

"نہیں، سیکھا تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ کبھی فرصت کے لمحوں میں بتاؤں گی۔" اس کا انداز مصروف قسم کا تھا۔ آج اس نے کالج جانا تھا۔ صبح کے اس کے تین پیریڈ ہوتے تھے اور باقی کا وقت وہ فری ہوتی تھی۔ سو اسے ابھی کالج جانے کی تیاری بھی کرنا تھی۔ مبرم ابھی تک نیچے نہیں اترا تھا۔ آج بھی یقیناً" اس کا چھٹی مارنے کا ارادہ تھا۔ وہ کچھ سوچ کر مبرم کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ نیند میں دھت تھا۔ اسے غصہ آگیا، کمرے کی حالت ابتر تھی۔

"مبرم! اٹھ جاؤ۔" وہ ساتھ ساتھ چیزیں بھی سمیٹ رہی تھی مگر مبرم ٹس سے مس نہ ہوا۔

"آج پھر چھٹی کرنے کا ارادہ ہے؟" اب کے اس نے کچھ نرمی سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" بڑی خوش دلی سے بتایا گیا۔ اگرچہ آواز سوئی سوئی سی تھی۔

"کیوں؟"

"بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"بہانے مت بناؤ۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی "کیا چاچا چاچی کو فون کرکے بتاؤں؟" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"بتادو۔"

"کیا ہوا؟ کیوں مبرم کے سر پر سوار ہو؟" چاچی بھی ان کے مذاکرات سننے کے لیے آپہنچی تھیں۔

"کچھ نہیں چاچی! بس مبرم کو جگانے کی کوشش کررہی ہوں۔ بہت بگاڑ رکھا ہے آپ نے اس کو۔ چار دن اور میرے پاس رہا تو تیر کی طرح سیدھا کردوں گی۔ دعائیں دیں گی آپ مجھے۔" اس نے پانی کا جگ اٹھا کر بھرپور طریقے سے چاچی کے منع کرنے اور چلانے کے باوجود مبرم پر پھینک دیا تھا۔ پانی سے نہانے کے فوراً" بعد ہی وہ اچھل کر اٹھ گیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" وہ چیخا۔ نیند سے آنکھیں بھاری تھیں۔ آواز بھی حلق سے نکل نہیں پارہی تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دیکھیں اماں! مجھے کتنا بخار ہے۔" وہ ہمدردیاں لوٹنے کے چکر میں تھا۔ چاچی کی ممتا گویا تڑپ اٹھی۔

"لڑکی! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ بخار میں اس پر پانی پھینک دیا ہے۔ ہائے میرے اللہ" چاچی بے قراری سے مبرم کا منہ پونچھنے لگیں۔

"کچھ نہیں ہوا اسے۔ ڈرامے بازیاں ہیں ساری۔ آپ خاموش ہوکر تماشا دیکھیں۔" چاچی کی دہائیوں کو وہ کسی خاطر میں نہیں لائی تھی۔

"اٹھو، یہاں سے۔" وہ زبردستی اس کا بازو پکڑ کر باتھ روم کی طرف دھکیلنے لگی۔

"لڑکی! نہ کر، بخار ہے اسے۔ اے ویرا! تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ اے، چھوڑ بھی دے۔" چاچی ہکا بکا ہی تو رہ گئی تھیں۔ مبرم کو اس نے باتھ روم میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگادی۔

"اسے بند کردیا ہے۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میرا بچہ بخار میں پھنک رہا تھا۔" ان کا ملال کسی طور کم نہیں ہوپا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مبرم نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کردیا تھا۔ وہ صاف ستھرے حلیے میں باہر آیا تھا۔ نیند بھی غائب ہوگئی تھی۔

"بخار اتر گیا ہے؟" ویرا نے طنزیہ کہا۔

"میرے منہ مت لگو، سویرے سویرے۔" وہ سر سے پیر تک جلا بیٹھا تھا۔ ویرا مزے سے مسکراتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ اس سے پہلے چاچی بھی باہر نکل آئیں۔

"میرے بچے کی یہاں تو کوئی حالت نہیں۔ نہ مرضی سے سونا نہ اٹھنا۔ ایک پڑھائی کو بھائی میں بلکتی ہوں۔ میرے بچے کی صحت کا ستیاناس ماردیا ہے۔ ہائے ہائے کیسی جلا و صفت لڑکی ہے۔ نہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس اپنی چلائے جاتی ہے۔"

"مبرم! ناشتہ کرلو۔" اس نے چاچی کی تقریر کے جواب میں ہانک لگائی تھی۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کررہی تھی۔ اسے وقت پر کالج پہنچنا تھا۔ خلاف توقع مبرم جلدی باہر آگیا تھا اور اسے توس کے ساتھ آملیٹ کھاتے ہوئے دیکھ کر چاچی کا کلیجہ گویا منہ کو آگیا۔

"یہ ناشتہ ہے؟ سوکھی ڈبل روٹی، تب ہی کہوں۔ مبرم کی صحت کیوں گرتی جارہی ہے۔ نہ پراٹھا نہ مکھن نہ لسی کا گلاس۔"

"سلائس پر مکھن لگا کردیا ہے۔ پراٹھا یہ خود نہیں کھاتا۔ پوچھ لیں اس سے۔ اور لسی کا یہ جگ آپ کا مبرم روزانہ ڈکار جاتا ہے۔ یاد رہے پورا جگ۔" وہ گرما گرم چائے حلق سے جلدی جلدی اتار رہی تھی۔

"ماشاء اللہ نظر مت لگا دینا۔ میرے بچے کی دشمن۔" چاچی نے نظروں ہی نظروں میں اپنے بچے کی نظر اتاری۔ "ویسے نہ چاٹی نہ مدھانی، تو یہ لسی کیسے بنالی؟" وہ حیرانی سے چونکی تھیں۔ "اچھا اچھا گرینڈر میں بنائی ہوگی، مگر چاٹی کی لسی کا تو اپنا ہی سواد ہے۔ میری گوشی اپنے ہاتھ سے مکھن کے تازہ پیڑے نکالتی ہے۔ بڑی برکت ہے گوشی کے ہاتھ میں۔ چار پانچ پیڑے سے کم مکھن نہیں نکلتا ہے۔"

"کبھی گوشی کے بابرکت ہاتھوں کا نظارہ بھی کرلیں گے۔" مبرم نے صاف اس کا طنز محسوس کرلیا تھا۔ تب ہی تو اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

"وہ تمہاری طرح زبان دراز نہیں ہے۔ کم از کم بڑوں سے بات کرنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔" مبرم نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"او کے، کبھی تمہاری گوشی سے بڑوں کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ سیکھوں گی۔ ایڈوانس میں بکنگ کروا دینا۔ گوشی سے کلاسز لینا ضرور شروع کروں گی۔" وہ جی بھر کر اسے جلا چکی تھی تب ہی اپنے خالی برتن سنک میں رکھنے لگی۔

"اسے تمہاری طرح چالاکیاں نہیں آتیں۔ سیدھی سادی سی خدمت گزار صوم و صلوۃ کی پابند بچی ہے۔ میری اتنی خدمت کرتی ہے کہ اپنی بیٹیوں کی طرف سے ملنے والے آرام بھول گئے ہیں۔ ایسی سگھڑ سیانی، اس قدر میٹھی طبیعت، باپردہ باحیا۔ کبھی گیٹ کے قریب تک نہیں گئی۔ کبھی سر کھلا نہیں چھوڑا۔ آج کل کی لڑکیاں تو گلے میں پٹکے لٹکا کر باہر نکلتی ہیں۔ نہ شرم ہے نہ حیا۔ بھئی میں تو گلی لپٹی کی قائل ہرگز نہیں ہوں۔"

وہ ناک ناک کر اس پر حملے کرتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے رکیں۔

"میرے گھر بھی بیٹیاں ہیں۔ بے حیائی کے نمونے گھروں میں سجا کر اپنی بچیوں کو بگاڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر ہماری بچیوں نے تایا زاد کو دیکھ کر رنگ ڈھنگ بدلنے شروع کردیے۔ دوپٹے گلے میں لٹکا کر آوارہ گردی کرنے لگیں تو بھائی حلق پر چھری پھیرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"توبہ، توبہ، ایسی خوف ناک، دہشت ناک، غضب ناک اور ہر قسم کی اونچی، نیچی، موٹی پھیلی "ناک" والی باتیں آپ کو آتی ہیں چاچی! میرا تو ننھا سا دل آپ نے

ہلا کر رکھ دیا ہے۔" اپنی طویل دل جلانے والی تقریر کے جواب میں یہ الفاظ سن کر وہ بری طرح سے جلی تھیں۔

"کیسی ڈھیٹ لڑکی ہے۔ انا اور غصہ نام کی چیز نہیں۔ سوچا تھا' طعنے دے دے کر اور باتیں بنا بنا کر اسے متنفر کردوں گی مگر یہ تو بڑی استاد ہے۔"

"مبرم! تم کیسے ظالم' خود غرض اور جلاد قسم کے بھائی ہو۔ اتنی معمولی سی بات پر بہنوں کے حلق پر چھری پھیر دو گے؟ ہمارے تو خاندان میں ایسا کوئی ظالم درندہ آج تک پیدا نہیں ہوا۔" وہ برتن دھوتے ہوئے خاموش بیٹھے مبرم کو بھی چھیڑ رہی تھی۔ مبرم سر جھکائے ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔

"میرا بیٹا درندہ ہے؟ کچھ شرم کرو لڑکی! ہائے کیسی قینچی جیسی زبان ہے تمہاری۔ بھابھی صاحبہ تو ایسی نہیں تھیں۔" چاچی کو نہ چاہتے ہوئے بھی بولنا پڑ گیا۔

"ددھیال والوں پہ گئی ہوں اس لیے۔ ذرا اپنے بیٹے کو گفتگو فرماتے ہوئے سنا کریں۔ کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ایسی باکمال طنزیہ گفتگو فرماتا ہے۔" اب وہ رگڑ رگڑ کر کچن کی سلیب صاف کر رہی تھی۔

"لو اور سن لو۔" چاچی نے گویا ہاتھ جھاڑے۔ "یہ ددھیال والوں پر گئی ہیں۔ یعنی دادی پر۔" چاچی بھی کوئی نہ کوئی نقطہ نکال ہی لیتی تھیں۔

"اب دادی کی شان میں گستاخی تو نہ کریں۔ بھلا دادی کب گلے میں پٹکا لٹکا کر کالج پڑھانے جاتی تھیں؟" اس کا انداز بھرپور شرارت لیے ہوئے تھا۔

"میں تمہارے جیسی عالم فاضل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

انہوں نے گویا عاجزانہ طور پر دونوں ہاتھ جوڑے۔

"عالم فاضل تو میں ہوں۔ آپ کے خاندان میں کسی لڑکی تو کجا لڑکے تک نے ماسٹرز کی ڈگری نہیں لی۔" وہ مبرم پر صاف چوٹ کر رہی تھی۔ محض اس لیے کہ شاید اس کے طنز و طعنوں سے تنگ آ کر وہ اپنی ضد چھوڑ دے اور کیریر کی طرف دھیان دے لے۔

"کیا فائدہ اس علم و فضل کا' بڑوں کے ساتھ بات کرنے کی تو تمیز نہیں۔" مبرم کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"اور تمہیں بڑوں کے فیصلوں پر سر جھکانے کی بھی تمیز نہیں' یوں ماش کے آٹے سے اینٹھ رہے ہو۔" وہ بھی تو جتلانے سے باز نہیں آتی تھی۔

"مری جا رہی ہو' میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے۔" وہ ایک دم زہر خند ہوا۔

"کیا کروں' خوب صورت ہی اتنے ہو' مجھے تمہارے جیسا اِس جہان میں اور اُس جہان میں ملنا مشکل ہے۔" اس نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ کچن سے فارغ ہو چکی تھی۔ اور چاچی من پسند ناشتے سے... ایسا لذیذ ناشتا تو کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا' ایک بات کی تو وہ قائل ہو ہی چکی تھیں کہ ویرا کے ہاتھ ذائقہ بھی ہے اور کام کاج میں بھی پھرتیلی ہے مگر زبان کی بے پناہ تیز۔

"یہ میری بدقسمتی ہے۔" اس کا لہجہ اب بھی کٹیلا تھا۔ جب سے منگنی ہوئی تھی تب سے ہی مبرم یوں ہی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اب اس میں بھلا ویرا کا کیا قصور تھا۔ وہ کیونکر اپنے پاپا کے سامنے سر اٹھاتی' ان کا دل دکھاتی' جبکہ مبرم میں کوئی کمی بھی تو نہیں تھی۔ بس مسئلہ تھا تو صرف گوشی کا۔ مگر گوشی کے معاملے میں بھی اس کا بھلا کیا قصور تھا۔

"غم نہ کھاؤ۔" اب وہ ڈائننگ ٹیبل کا سامان سمیٹ رہی تھی۔ نظریں اس کی گھڑی کی آگے بڑھتی سوئیوں پر تھیں۔ "یوں کرنا' گوشی سے بھی شادی کر لینا۔"

"بک بک نہ کرو۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری گاڑی سروس کے لیے گئی ہے۔ جاتے ہوئے مجھے بھی ڈراپ کرتے جانا۔" وہ اپنا بیگ' گلاسز اور فائلیں اٹھا کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ چاچی سے یہ منظر بھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ نہ جانے بے چاری کے کیسے تاثرات تھے۔ ویرا جلدی میں دیکھ نہیں پائی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی مبرم نے پیشگی کہہ دیا۔ "واپسی پر خود ہی آجانا۔"

"آپ فکر نہ کریں شہزادہ عالم! آپ کو زحمت نہیں دوں گی۔"

"تو پھر کیسے آؤ گی؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پوچھنا پڑا۔

"تم لینے آجانا۔" وہ ایسے ہی باتوں میں چکرا کر رکھ دیتی تھی۔

"میرے پاس ٹائم نہیں ہو گا۔" مبرم کو اس کے اسی لہجے سے سخت چڑ تھی۔ عجیب سا رعب جماتا لہجہ تھا۔

"تم نے اے سی کی میٹنگ اٹینڈ کرنا ہے؟" ویرا کو بھی غصہ آگیا۔

"اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو آج سچ مچ کمشنر ہوتا۔" وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ گیا۔

"یہ تمہاری بے وقوفی ہے کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو، وہ بھی ایک ایسی ضد میں جس کا کوئی حاصل نہیں۔" ویرا کا انداز ناصحانہ تھا۔ مبرم کو احساس زیاں نے عجیب سے دکھ میں مبتلا کر دیا۔

"یہ سب میرے والد صاحب کی کرم نوازی ہے۔"

"جی نہیں، یہ تمہاری خود ساختہ انا اور ضد ہے، ورنہ آج تم کہاں سے کہاں پہنچے ہوتے۔" وہ لیکچر کے صفحات کو ترتیب دے رہی تھی۔

"ابو نے ہمیشہ ہر مقام پر مجھے ڈی گریڈ کیا ہے۔" اس کا لہجہ بے پناہ دکھ لیے ہوئے تھا۔ اتنی آسانی سے تو وہ کھلنے والا نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے یہ الفاظ اس کے منہ سے پھسل گئے۔

اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی تھی۔ عجیب سی بے چینی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ویرا کے ساتھ اس کا رشتہ ابو نے ہٹ دھرمی اور اسے شکست سے دوچار کرنے کے لیے طے کیا تھا۔

یہ جنگ دو مردوں کے درمیان تھی اور اس جنگ میں دو عورتوں کے جذبات مجروح کیے جا رہے تھے۔ ویرا کو اپنے ساتھ ساتھ گوشی کے جذبات کا بھی بے حد احساس تھا۔

"کیا تم ٹھیک کر رہے ہو مبرم؟" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"ہاں...."

"مگر یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے، تم اپنا نقصان کر رہے ہو۔"

"نفع و نقصان بھلا کون دیکھتا ہے۔" وہ ایک پیٹرول پمپ کے قریب گاڑی روک چکا تھا۔ ویرا نے گھڑی کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ مبرم جان بوجھ کر اسے لیٹ کروا رہا تھا۔ صبح والا بدلہ لینے کے لیے۔ ویرا کو غصہ آگیا۔

"مبرم! اسپیڈ بڑھا دو، میں لیٹ ہو رہی ہوں۔"

"تو میرے ساتھ نہ آتیں ناں۔" وہ بھی بلا کا کمینہ تھا۔

"اگر مجھے نہیں خود گاڑی ڈرائیو کرتی ہوں۔" ویرا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا لیتی۔

"محترمہ! یہ گاڑی میری اپنی ہے۔" اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ "میری موجودگی میں تم ڈرائیو کرو، یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"عورت کی ترقی تم لوگ بھلا کہاں برداشت کر سکتے ہو۔" ویرا کو رونا آنے لگا۔ آج پھر وہ بغیر وجہ کے لیٹ ہو گئی تھی۔

"آئندہ مجھ پر پانی تو نہیں پھینکو گی؟" مبرم نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔ وہ بھی اسے چڑا کر سینے میں ٹھنڈ ڈال چکا تھا۔

"نہیں۔"

"آملیٹ میں چینی تو نہیں ملاؤ گی؟"

"نہیں۔"

"لسی میں نمک تیز تو نہیں کرو گی؟"

"نہیں۔" وہ گویا بھنا اٹھی۔ مبرم نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

"اور تمہارے ساتھ کم از کم کالج جانے کی غلطی بھی نہیں کروں گی۔" وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔

"نوازش ہے آپ کی۔"

"جاتے جاتے دعا دے کر جاؤ۔" وہ پیچھے سے ہانک لگاتے ہوئے بولا۔ "سفر پر جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" ویرا جاتے جاتے پلٹی۔

"گاؤں...."

"کیا مطلب؟" وہ چیخ پڑی تھی۔

"وہ ہی جو تم سمجھ چکی ہو۔" وہ گاڑی زناٹے سے بھگا کر لے گیا تھا۔

"مبرم!" وہ چیختی رہ گئی تھی۔ "لگتا ہے، اس دفعہ بھی تم فیل ہونا چاہتے ہو۔" ویرا زیر لب بڑبڑاتے ہوئے افسردگی سے سوچنے لگی تھی اور پھر سر جھٹک کر کالج کے کھلے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

پورے ڈیڑھ ہفتہ بعد وہ پھر سے گاؤں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ مگر اس دفعہ ویرا کو چکمہ دینا آسان نہیں تھا۔ اس کا جیب خرچ جو کہ ابو جان نے خیر سے ویرا کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور گاڑی کی چابی اور اس کے کاغذات حتی کہ سیل فون اور آئی ڈی کارڈ تک ویرا کے قبضے میں تھا۔

ابھی کل ہی تو وہ اس سے دو ہزار روپے مانگنے کے لیے منتیں کر رہا تھا۔ اپنے ہی پیسے کسی دوسرے سے بھکاریوں کی طرح مانگنا کہاں کا انصاف تھا۔ مگر وہ اپنے جلاد صفت ابو کو بھلا کس انداز میں سمجھاتا۔ دونوں ایک دوسرے کی بات الٹ سمجھتے تھے۔ آئے دن ان کی آپس میں ٹھن جاتی تھی اور دونوں میں مہینہ مہینہ بول چال بند رہتی تھی۔ ان دونوں کے سرد تعلقات چاچی کا بلڈ پریشر بڑھانے کا سبب بنتے تھے اور وہ بات کو گھما پھرا کر ویرا کے ساتھ منسوب کر دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سارے فساد کی جڑ ویرا کی ذات ہے۔ حالانکہ ان باپ، بیٹے کے درمیان اختلافات بچپن سے ہی شروع ہو گئے تھے۔

پہلے پہل مبرم کو مبارز نام دیا گیا تھا۔ نام تو خاصا مشکل تھا، مگر چاچی کو خوب پسند آیا مگر چاچا جی نے معنی معلوم کیے تو پتا چلا کہ مبارز کے معنی تو خاصے خطرناک ہیں۔ جنگجو، سپاہی، فوجی۔

چاچا جی نے سنا اور دل تھام لیا۔ سپاہیوں اور فوجیوں سے سخت الرجک، جنگجو اور لڑاکا لوگوں سے دور بھاگنے والے چاچا جی نے فوراً نام تبدیل کر کے مبرم رکھ دیا۔ اس کے معنی بھی انہیں خوب پسند آئے۔ پائیدار، پکا، مستحکم اور مضبوط۔

چاچا جی بہت خوش ہوئے تھے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان پر مختلف انکشافات ہوتے رہتے تھے۔ یعنی کہ ان کا بیٹا ارادوں کے معاملے میں مستحکم، ضد کا پکا، غصہ پائیدار اور مضبوط ترین انا اور اونچی ناک رکھنے والا اسم بامسمیٰ تھا۔ نام شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ عید کے عید بھی وہ کبھی مسکرایا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک انہوں نے اسے خود سے متنفر ہی پایا تھا۔ حالانکہ بہت سے معاملوں میں وہ خود ہی قصوروار بھی ہوتے تھے، مگر پھر بھی مبرم کا دل جلانے سے باز نہیں آتے۔

"تمہارا نام پاسم رکھ دیتا تو بہتر تھا۔ کم از کم کچھ نہیں جنس ملکھ تو ہوتے۔ تمہاری ماں نے بھی اپنے کھیت کے سارے کریلے تڑکا لگا کر تمہاری پیدائش سے پہلے کھا لیے تھے۔"

مبرم کو ابو کی ان ہی باتوں سے تپ چڑھ جاتی تھی۔ اب تو اس کے ضبط کی انتہا ہو گئی تھی۔ یعنی کہ وہ ویرا محمود الحسن نیازی سے فقیروں کی طرح ضرورت کے لیے رقم مانگا کرے گا۔

"بھاڑ میں گئے ابو جی آپ کے حصے کے پورے چار مربع۔" وہ خالی والٹ لیے سویرے سویرے کچن کے چوکھٹے میں چہرہ سجا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ویرا ہمیشہ کی طرح ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ بلینڈر چل رہا تھا اور مخصوص گرر گرر کی آواز سماعتوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ مبرم نے ہاتھ بڑھا کر بلینڈر کا سوئچ کھینچ کر نکال دیا تھا۔ یہ ویرا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق ویرا اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" مبرم نے تیوری چڑھا کر

اپنا خالی والٹ کچن کی سلیب پر زور سے پٹخا۔

"کون سی بے ہودگی؟" ویرا مصنوعی انداز میں چونکی۔ "ارے' یہ تو والٹ ہے، مگر مجھے کیوں دے رہے ہو؟ میرا نان نفقہ ابھی تمہارے ذمے نہیں ہے۔ صرف منگنی تو ہوئی ہے' ابھی دل بڑا نہ کرو' اور والٹ اٹھالو۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔" مبرم بھنا اٹھا۔ "اس والٹ کو نوٹوں سے بھر دو' فوراً" اور ابھی۔" اس کا انداز تحکم لیے ہوئے تھا۔

"نوٹوں سے بھر دوں؟ یا عجائب! کیا نوٹ درخت کے پتے ہیں؟ اور کیا تمہارے دادا کی فیکٹریاں چل رہی ہیں؟" وہ بغیر برا مانے میدہ گوندھنے میں مصروف تھی۔ آج اس کا ارادہ میٹھی روٹی پکانے کا تھا۔ سو اسی سلسلے میں مصروفیت حد سے سوا تھی۔

"محترمہ! جو رقم آپ کے چچا حضور میرے لیے دے کر گئے ہیں نا' خون پسینہ شامل ہے ان پیسوں میں میرا۔ جون کی کڑکتی دوپہروں اور سرما کی سرد ترین راتوں میں ہل چلاتا اور پانی لگاتا رہا ہوں۔ کوئی احسان نہیں کر رہے وہ مجھ پر [illegible] میری رقم' سانپ بن کر بیٹھ جاتی ہو۔" وہ جلبلا کر بولتا چلا گیا۔

"تو نہ زمینوں پر ہل چلایا کرو' کون مجبور کرتا ہے تمہیں۔ آرام سے پڑھو' مقابلے کا امتحان دو اور افسر لگ جاؤ۔ الگ سے ہی ٹھاٹھ باٹھ ہوں گے۔" وہ گندھے ہوئے میدے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا رہی تھی۔

"وہ زمینیں جو ہیں نا' میرا عشق ہیں' ان کی دیکھ بھال' ان کی نشوونما میرا سیروں خون بڑھا دیتی ہے' آم کے پھل سے لدے درخت دیکھ کر اور زمین کے پیٹ سے ابلتے ٹھنڈے شفاف پانی کی ٹھنڈک محسوس کر کے میری رگوں میں خون جوش کھانے لگتا ہے۔ اپنی مٹی سے محبت ہر زمین دار کے خون میں دوڑتی ہے۔ کیا تھا اگر میں زراعت میں ماسٹرز کر لیتا، مگر ہمارے بڑوں کی بے جا ضدیں ہمیشہ شوق اور لگن کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔"

اسے نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ اسی لیے لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"اور مقابلے کے امتحان کے بعد اگر میں افسر بن بھی جاتا' بننا تو میں نے تمہارا ہی شوہر تھا۔ پھر تمہیں کیوں میرے توسط سے خوشی میسر آتی۔"

"بھئی مجھے تو تم ہر روپ میں قبول ہو۔ چاہے ہل چلاؤ یا چاہے کمشنر لگ جاؤ۔" پیڑا نما گولیاں بیل رہی تھی۔

"نیاز پور میں جا کر دیکھنا زندگی کتنی مشکل ہے۔ یہ آرام' یہ نخرے وہاں نہیں ہوں گے۔" وہ جل کر بولا۔

"میں گوبر سمیت کے اپلے تھاپنے کی اور چاٹی میں مدھانی ڈال کر مکھن نکالنے کی پریکٹس کر کے جاؤں گی۔" اسے بھی لاجواب کرنا خوب آتا تھا۔

"صرف کہنے کی باتیں ہیں۔" مبرم نے تمسخرانہ کہا۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔" توے پر آنچل ڈال کر وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"وقت تو تب ہی بتائے گا نا جب میں تم سے شادی کروں گا۔" مبرم چڑ کر بولا۔

"یہ زہر تو تمہیں پینا پڑے گا' چاہے اپنی پسند سے پینا یا چاچا جی زبردستی پلا دیں گے۔" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

"اور یہ ہی میری بدقسمتی ہے۔" وہ خوامخواہ دکھی ہو گیا۔

"غم نہ کھاؤ نا' کہا تو ہے تمہاری دوسری شادی کروا دوں گی۔" اس کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ وہ سر سے پیر تک سلگ گیا۔

وہ پہلی سنہری روٹی پلیٹ میں رکھ کر چکھنے لگی تھی۔ "واہ' مزا آگیا۔" اب وہ دوسری روٹی بیل رہی تھی' جب مبرم بھنا کر بولا۔

"میں کچھ بکواس کر رہا ہوں۔"

"کیوں سیلاب زدگان جیسی صورت بنا رکھی ہے۔ جاؤ میرے پاؤچ میں سے دو سو روپے نکال لاؤ۔" اس نے کمال مہربانی سے کہا تھا۔

"ایسی سخاوت کی صرف تم ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔" مبرم کا انداز بھرپور طنزیہ تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" مبرم بھنا کر پلٹ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ویرا اسے ہرگز بھی بغیر کسی ضرورت کے پیسے نہیں دے گی سو اس کا رخ پاپا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اسے پاپا کے کمرے میں جاتا دیکھ چکی تھی۔ سو اس کا ناشتہ بھی وہیں اٹھا لائی۔ جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے مبرم کو دبی آواز میں کہتے سنا۔

"پاپا جی! کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" اس نے باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سیدھے طریقے سے اپنا مطالبہ دہرا دیا۔

"کیوں بیٹا جی! ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟" وہ صبح صبح اخبار سے لطف اندوز ہوتے تھے' اپنے اور اخبار کے درمیان کسی تیسرے کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اخبار بینی کے شوق میں انہوں نے کبھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بس بھتیجے کی طرح نہار منہ لسی پینا پسند کرتے تھے۔

"پاپا جی! اویس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھے فوراً" ہسپتال پہنچنا ہو گا۔" جھوٹ بولتے ہوئے اس کی آواز لمحہ بھر کو ڈگمگائی تھی۔

"اچھا' اویس کا۔" انہوں نے عینک کے پیچھے سے اپنے لاڈلے کو دیکھا۔

"جی' وہ ہی اویس۔ جو میرا سب سے اچھا دوست ہے۔" مبرم نے لہجے میں قدرے رقت بھری۔

"یہ اویس کا پانچواں یا چھٹا ایکسیڈنٹ ہے۔ بڑا خوش نصیب بچہ ہے' جو دو دن بعد بھلا چنگا ہو کر ہمارے گھر بھی آجاتا ہے۔ اور ہر دفعہ حادثے میں اسے چوٹ تک نہیں آتی۔"

پاپا نے اطمینان سے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ یقیناً" وہ مطالعہ کر چکے تھے۔ اب فرصت میں مبرم کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے اسٹائل سے مبرم کو خاصی بے چینی ہو رہی تھی۔ ویرا کو بے اختیار ہنسی آئی۔

"جی' واقعی خوش نصیب ہے۔"

"کتنے پیسے چاہئیں؟" وہ اتنی آسانی سے مان جائیں گے نہ ویرا کو اندازہ تھا نہ ہی مبرم کو۔

"یہی پانچ چھ ہزار۔" مبرم نے بے ساختہ خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"ویرا بیٹا! مبرم کو پیسے لا کر دو۔" انہوں نے اپنے خزانچی کو آواز دی تھی۔ وہ تابع داری سے ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی۔ واپس آئی تو چڑمڑ سے دو تین نوٹ پکڑ رکھے تھے۔

"صرف اتنے؟" مبرم نے تین سو روپے دیکھ کر بمشکل غصے کو ضبط کیا۔

"تمہارے لیے اتنے ہی کافی ہیں۔" پاپا کا انداز قابل دید تھا۔ مبرم جل کر رہ گیا۔

"یہ بہت زیادہ ہیں۔ کچھ آپ واپس رکھ لیں۔"

"واپسی پر ویرا کے لیے آئس کریم لیتے آنا۔" پاپا نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"پاپا جی! یوں کریں۔ آپ خود ہی آئس کریم منگوا لیجئے گا۔ یہ پیسے آپ کو مبارک ہوں۔ چلتا ہوں۔" وہ زہر کے گھونٹ بھر رہا گویا ہوا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر پاپا سرعت سے بولے۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو بیٹا! اگر اس دفعہ فیل ہو گئے تو یہ دو تین سو روپے بھی نہیں ملیں گے۔"

"آپ کی کرم نوازی کا شکریہ۔" وہ آگ بگولا باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ پاپا نے پھر سے اخبار اور عینک کو اٹھا لیا تھا جبکہ ویرا تقریباً" بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آئی۔

"مبرم! ناشتہ تو کر لو۔"

"خود کھا لینا' موٹی بھینس۔" اس کے قدم پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ویرا کچھ سوچ کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

"ناشتہ کر لو' پیسے دیتی ہوں۔"

"مجھے نہیں ضرورت۔" وہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔ اور ویرا کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ اگر اس لمحے اس کی جگنوؤں سے چمکتی آنکھوں کو دیکھ لیتا تو لمحہ بھر کے لیے ضرور دم بخود رہ جاتا۔ عجیب

سے جذبوں کی حدت سے ویرا کے رخسار تپ رہے تھے۔ اور اس کا دل یوں ہی بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک ہی احساس بس کچوکے لگا رہا تھا کہ مبرم خالی معدہ لیے صبح سویرے ناراض گھر سے نکلے گا۔ اس کی ناراضی کے احساس نے ویرا کو حد درجہ متوحش کر دیا۔

"پلیز، مبرم! رک جاؤ نا۔ اچھا، جتنے مرضی پیسے لے لینا، مگر ناشتہ تو کر لو۔" وہ منتوں پر اتر آئی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بھنا کر پلٹا، گملے کو زور دار ٹھوکر لگائی اور بولا۔ "یہ پیسے تمہیں ہی مبارک ہوں، مگر یہ بات یاد رکھنا کہ میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔"

وہ ایک تنفر بھری نگاہ اس کی طرف اچھال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا، جبکہ ویرا بے چاری جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مبرم کا جیب خرچ بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ چاچا جی نے اس کی گاڑی بھی بیچ دی تھی۔ اسے دی گئی تمام آسائشات چھین لی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ فلیٹ بھی جو مبرم کو کرائے پر لے کر دیا گیا تھا۔ مبرم اپنے ابو کی ساری سیاست کو اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مبرم کو اس حد تک تنگ کریں گے کہ وہ نہ صرف اپنے تایا کے گھر میں قیام کرنے پر مجبور ہو جائے بلکہ پڑھائی کے معاملے میں بھی کچھ سنجیدہ ہو جائے۔

اور یہ مبرم کی بد قسمتی تھی کہ ویرا کو اس کے کالج میں بطور لیکچرار اپائنٹ کر لیا گیا تھا۔ ان دنوں ویرا کے گویا زمین پر قدم نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے آئی ٹی ایم سے ریزائن کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کالج کی طرف سے ملنے والے پیکیج سے وہ مطمئن نہیں تھی۔

ویرا کو زیادہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ وہ اب کالج میں بھی مبرم پر کڑی نظر رکھ سکے گی اور مبرم کی ساری سرگرمیوں پر اس کا دھیان رہے گا۔

پہلا دن تو تعارف میں ہی گزر گیا۔ باقاعدہ کلاسز کا آغاز تیسرے دن سے ہو چکا تھا اور ویرا بہت محنت، لگن اور توجہ کے ساتھ لیکچر تیار کرتی تھی۔ اسے پوری پوری امید تھی کہ مبرم کہیں نہ کہیں اس پر ضرور چوٹ کرے گا۔ وہ کلاس کا ذہین اسٹوڈنٹ تھا مگر فائنل ایگزامز میں جان بوجھ کر خالی پرچہ پکڑا کر آتا تھا، صرف اور صرف ایک ضد، غصے اور انا کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ اپنے کیریئر کے بہترین سال ضائع کر رہا تھا۔ اور ویرا ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

اس روز کلاس روم میں وہ بہت اہم موضوع پر لیکچر دے رہی تھی مگر ہمیشہ کی طرح مبرم اسے زچ کرنے کے لیے کھڑکی سے باہر کے منظر دیکھ رہا تھا۔ محض یہ جتلانے کے لیے کہ اسے کسی بھی قسم کے لیکچر سے کوئی دلچسپی نہیں۔

"ریگولر اسٹڈی پلیز اے وری امپورٹنٹ رول ان ونز کیریئر۔" کلاس روم میں اس کی آواز کے علاوہ محض سناٹا بول رہا تھا۔ اور وہ چن چن کر تعلیم کی افادیت کے متعلق ٹاپکس زیر بحث لاتی تھی۔ کچھ دیر بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، مگر مبرم کی طرف سے ہمیشہ کی طرح سے خاموشی کے علاوہ کچھ بھی سننے کو نہیں ملا تھا۔

پورے تین ماہ تک وہ اس کی ایسی روٹین کو برداشت کرتی رہی تھی مگر اس ڈھیٹ پر قطعاً "اثر نہیں ہوا تو اس نے ایک دم گویا فیصلہ کر لیا۔ یعنی مبرم کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی وہ خود بخود مطمئن ہو گئی تھی۔ اور اس کا اطمینان بھی مبرم کو کہاں گوارا تھا۔ اب وہ جان بوجھ کر اسے کلاس روم میں بھی زچ کرنے لگا تھا۔ ایسے ایسے بے تکے سوال کرتا کہ ویرا بھنا اٹھتی۔

"میم! میرے ایک چھوٹے سے کونسچن کا جواب تو دیں۔" اس دن بھی وہ لیکچر سے فارغ ہو کر کلاس روم سے نکل رہی تھی جب مبرم اس کے برابر چلتے ہوئے مزے سے بولا۔

"جی فرمائیے۔!" نہ چاہتے ہوئے بھی ویرا کو رکنا پڑا۔

"سیڈ سٹک اور ٹرو کولینٹ میں کیا فرق ہے؟"

"ہوں۔" ویرا نے گویا ہنکارا بھرا۔ "سیڈ سٹک لفظ جانتے ہو کس کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے؟"

"جانتا تو ہوں۔ پھر بھی تم بتا دو۔" مبرم کا لہجہ خاصا دھیما تھا۔ وہ اس وقت کوریڈور میں کھڑے تھے۔ ویرا نے کچھ سوچا اور بولی۔

"گھر کب جاؤ گے۔؟"

"ابھی گھر ہی جا رہا ہوں۔"

"تو پھر چلو" وہ پارکنگ کی طرف آئی تھی۔ مبرم بھی بغیر اختلاف کیے اس کے پیچھے آ گیا۔ ویرا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ مبرم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"تم نے بتایا نہیں؟" گاڑی مصروف شاہراہ پر رواں دواں تھی، جب مبرم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دوسروں کو ستانے یا ان پر حکومت کر کے خوش ہونے والا سیڈ سٹک ہوتا ہے اور وحشی، بے رحم اور سنگ دل ٹرو کولینٹ ہوتا ہے۔ یعنی کہ تم۔" وہ لمحہ بھر کو رکی۔ "تم خوش ہوتے ہو، خود سے وابستہ لوگوں کو ستا کر۔ اور یہی تمہاری سب سے بڑی سنگ دلی ہے۔ تم اپنے قول اور فعل کو اولیت، فوقیت دینا چاہتے ہو۔ اور تمہاری سب سے بڑی خود غرضی ہے۔"

"اپنی جائز خواہش کی تکمیل چاہنا خود غرضی ہے؟" اس کی توقع کے عین مطابق وہ بھڑک اٹھا۔ "خود غرض تو آپ کے چچا حضور ہیں۔ تمام عمر اپنے فیصلے زبردستی دوسروں پر ٹھونسنے میں لگے رہے۔ چاہے کوئی ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جائے۔ گھٹن سے اس کی سانس بند ہو جائے یا دل۔"

"تم کیوں ایسا سوچتے ہو مبرم!" دفعتاً اس کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

"کیوں نہ ایسا سوچوں۔" وہ تپ کر بولنے لگا۔ "شروع سے لے کر آج تک ابو اپنی مرضی کو اولیت دیتے رہے ہیں۔ ایف ایس سی کے بعد میں نے آرمی جوائن کرنا چاہی تو یہ میرے شوق کی راہ میں دیوار بن گئے۔ نجانے کن دقتوں کے بعد میں نے ابو کی خواہش پر سر جھکا دیا تھا۔ پھر سوچا کہ فارمیسی پڑھوں گا، مگر اس دفعہ بھی وہ اپنی مرضی ٹھونسنے کے چکر میں میرا خواب توڑ گئے۔ پھر سوچا کہ بزنس فیلڈ سلیکٹ کر لوں گا۔ بی بی اے میں ایڈمیشن لینا چاہا تو پھر اپنی ضد پر اڑ گئے۔" کہہ تو وہ سچ ہی رہا تھا۔

"تم اپنا نقصان کیوں کر رہے ہو؟" وہ آرام سے بولی۔

"اس لیے کہ انہوں نے میرا نقصان کیا ہے۔" اس نے چبا چبا کر جواب دیا۔

"تمہارا نقصان؟" ویرا الجھی۔

"ہاں۔" اس کی نظریں شفاف سڑک پر تھیں جبکہ ویرا کی نظریں اس کے چہرے پر۔

"کیا مطلب۔"

"تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ گتھیاں، یہ الجھنیں۔ یہ قصے یہ کہانیاں۔" مبرم نے نچلا لب دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ وہ اور بھی الجھ کر رہ گئی۔

"کچھ تو بتائو۔؟" وہ سخت متجسس ہو گئی۔

"وقت بہت کچھ بتا دے گا۔" مبرم کا انداز اب بھی مبہم تھا۔ "ویسے ایک بات تو بتاؤ۔" کچھ دیر بعد وہ لہجہ اور انداز بالکل بدل چکا تھا۔

"پوچھو۔"

"تم نے اتنا علم حاصل کیا ہے۔ کیا لوگوں کے ذہن، سوچ اور چہرے پڑھ سکتی ہو؟"

"شاید ہاں۔ یا شاید نہیں۔" اس نے کچھ نا سمجھی کے عالم میں جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس فن سے نا آشنا ہو۔" وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا۔ ویرا اب بھی نہیں سمجھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

"میں کبھی بھی کچھ غلط نہیں کہتا۔" اس کا انداز پھر سے مبہم ہو گیا۔

گاڑی گھر کے گیٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ ویرا نے نیچے اتر کر گیٹ کھولا تھا۔ مبرم گاڑی کو اندر لے آیا تو وہ گیٹ بند کر کے اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"ویرا بٹیا! آج تو سادہ سے دال چاول بنا لو۔" وہ

اسے کچن میں مصروف دیکھ کر بولے تھے۔

"اور مبرم کیا کھائے گا۔" وہ جانتی تھی کہ مبرم کو دال چاول پسند نہیں۔

"میں تمہارا بھیجہ کھا کر گزارا کرلوں گا۔" مبرم چینل سرچنگ میں مصروف تھا مگر ساری توجہ ان دونوں کی طرف تھی۔ پاپا نے مسکرا کر مبرم کو دیکھا اور بولے۔

"ویرا کا بھیجہ کھا کر اگر تم ماسٹرز کی ڈگری لے لو تو میری جان! ہمیں ویرا بغیر بھیجے کے بھی قبول ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ایسا ذہین دماغ کھانے کے بعد نتیجہ سو فیصد ہونا چاہیے۔"

"ماسٹرز کی ڈگری کو آپ سب نے زندگی موت کا مسئلہ بنالیا ہے۔" مبرم جھنجلا کر بولا۔

"کیا کریں بیٹا جی! ہماری مجبوری ہے اور آپ کے فائدے کے لیے تو کہتے ہیں۔" پاپا نے مزے سے کہا تھا۔ وہ بلا کے خوش مزاج انسان تھے۔ کوئی بندہ ان کی کمپنی میں بور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"میرا فائدہ؟" وہ چونکا۔

"تو اور کیا۔" پاپا ذرا اونچی آواز میں بولے۔ "اب دیکھو نا۔ ویرا کے برابر کی ڈگری تو تمہارے پاس لازمی ہونا چاہیے۔ ورنہ خواہ مخواہ میرے بیٹے پر رعب ڈالتی رہے گی۔"

"یہ آپ دونوں کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں۔" وہ چاول چُن رہی تھی مگر توجہ ٹی وی لاؤنج کی طرف ہی مبذول تھی۔

"کم از کم آپ کی غیبت نہیں کر رہے۔" مبرم اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ "پانی دو۔" وہ فریج کے پاس ہی کھڑا تھا اور پانی مصروف ویرا سے مانگا جارہا تھا۔

"خود پی لو نا۔ یہ گلاس بھی پاس ہی رکھا ہے۔" اسے جلدی جلدی لنچ تیار کرنا تھا، کیونکہ نیند سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔

"میں تم سے پانی مانگ رہا ہوں۔" مبرم کے لہجے میں عجیب سی دھونس تھی۔

"تمہاری نوکرانی تو نہیں ہوں۔ مفت میں تمہاری خدمتیں کرتی رہوں۔ کپڑے دھو کر اور استری کر کے بھی دوں، من پسند کھانے بھی تیار کروں۔ فری میں دماغ کھپا کھپا کر پڑھاؤں بھی۔" وہ جل کر بولی۔

"نوکرانی نہیں ہو، مگر زبردستی کی منگیتر تو ہو نا۔" ویرا جانتی تھی کہ اب وہ اسے چڑانے کی کوشش میں رہے گا۔

"منگیتروں پر حکم کی بجا آوری نہ فرض ہے نہ واجب۔" اس نے ابلتے ہوئے پانی میں چاول ڈال کر چمچہ چلایا۔

"تو رشتہ بدل لیتے ہیں؟" مبرم نے معنی خیزی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگی تھی۔ تمام تر توجہ کھانا پکانے کی طرف تھی۔

"نکاح کر لیتے ہیں۔" مبرم شاید جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔ تبھی تو اسے خود بھی خبر نہیں ہو پائی کہ اس نے کیا کہہ دیا ہے۔

"کیا؟" ویرا چونک کر پلٹی۔

"کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"اب بات کو پلٹو نہیں۔ میں سن چکی ہوں۔" نجانے کیوں اس کے دل میں ایک شگوفہ کھل گیا تھا۔

"بڑی بے قرار ہو۔" اس کے لہجے میں عجیب سی تپش تھی۔ ویرا کے رخسار گرم ہو اٹھے۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" ویرا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ اس سے کوئی بات ہی بن نہیں پائی۔

"بات تو کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ کچھ جذبے خوشبو کی مانند ہوتے ہیں ویرا! اور ان کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی۔ اور ان جذبوں کی آگ بجھائے نہیں بجھتی۔" وہ بے انتہا سنجیدہ تھا۔ ویرا گویا نگاہ جھکا کر رہ گئی تھی۔ بھلا اپنا آپ عیاں کرنا کچھ آسان تھا۔ وہ بھی اس شخص کے سامنے جس کے نزدیک آپ کی کوئی اہمیت سرے سے نہ ہو۔

"اور کچھ لوگ جذبوں اور "رشتوں" کا مذاق بنا لیتے ہیں۔" وہ صاف مبرم پر چوٹ کر رہی تھی جو کہ آج بھی اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ بڑوں کے طے کیے جانے والے اس رشتے پر معترض تھا۔ انکاری تھا۔ جھٹلا دیتا تھا۔

"شاید اس لیے کہ وقت ان لوگوں سے عجیب بے ڈھنگے انداز میں پیش آتا ہے۔ تمہیں ایک بات بتاؤں۔ کبھی ایک چیز کے حصول کے لیے ہم پاگل ہو رہے ہوتے ہیں، مگر وہ چیز ہمیں مل نہیں پاتی اور جب زبردستی ہماری جھولی میں ڈال دی جائے تو وہ چیز اپنی اہمیت خود بخود کھو دیتی ہے۔" اس کا لہجہ عجیب ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔

پھر ایک دم ہی وہ سنبھل بھی گیا۔ اسے اپنے تمام تاثرات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔

"پانی نہیں دو گی؟"

"دیتی ہوں۔" اس نے گلاس میں ٹھنڈا ٹھار پانی انڈیلا۔ وہ پانی پی کر جانے لگا تھا جب ویرا نے اسے روکا۔

"کھانا کھا کر سو مت جانا۔ ابھی کچھ دیر تمہیں پڑھاؤں گی۔ آج میں نے ٹینس کلب جانا ہے۔" اس کی سوئی ہوئی ٹینس کی شوقین روح بیدار ہو اٹھی تھی۔ شاید مبرم حیران ہوتا تھا۔ اس قدر ایکٹو لڑکی تھی کہ حد نہیں۔ ایک جگہ ٹک کر تو بیٹھ نہیں سکتی تھی۔

نجانے کیوں وہ شروع سے ہی ویرا سے متاثر رہا تھا۔ حسن کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی بلا کی تھی۔ حاضر جواب تھی۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے آگے رہتی تھی۔ اسپورٹس کی بہترین کھلاڑی تھی۔ ٹینس کی شوقین۔ نجانے کتنے ہی پرائز اس نے کالج کی طرف سے جیتے تھے۔

وہ بلا کی پر اعتماد بھی تھی۔ یہ اعتماد اسے پاپا کی طرف سے بخشا ہوا تھا۔ وہ اسے اپنی بیٹی نہیں، بیٹا سمجھتے تھے۔ باپ بیٹی میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی اور دوستی تھی۔ مبرم حیران ہوتا تھا کہ ایسی دوستی ان باپ بیٹے میں کبھی قائم نہیں ہو سکی تھی۔ بیٹیوں سے بھلا کیسے ہوتی۔ اس کی بہنیں ابو جی کی آواز سنتے ہی کونوں کھدروں میں جا چھپتی تھیں۔ عجیب سے خوف و ہراس کی فضا گھر میں قائم ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا ایک دم گھٹن کی ہر طرف چھا گئی ہے۔ ایسے ماحول میں ان کی شخصیت کس طرح سے دب کر رہ گئی تھی۔ اس بات سے ابو یکسر ناواقف تھے۔ وہ ان والدین میں سے تھے جو اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کے بچے آنکھ اٹھا کر بات ہی نہیں کر سکتے۔

کچھ سال پہلے مبرم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ ابو کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے والا۔ پہلے پہل وہ زمینوں پر ابو کے خوف کی وجہ سے کام کرتا تھا تاکہ ابو اس سے خوش رہا کریں، مگر آہستہ آہستہ یہ خوف شوق میں بدل گیا تھا۔ اور اسی شوق کی بدولت وہ زمینوں پر نت نئے تجربات کرنے لگا تھا۔ اور یہ ابو کو کہاں گوارا تھا کہ ان کے مشوروں کے بغیر وہ کوئی بھی قدم اٹھائے۔ اگر وہ انہیں کھاد اور بیج کے "معیار" کے متعلق بتانا چاہتا تو وہ اس کی بتائی باتوں کو سرے سے نظر انداز کر دیتے تھے۔

خوف و ہراس کے اس ماحول سے اٹھ کر ایک دم پاپا کے گھر شہر میں آکر قیام کرنا اس کے لیے بہت خوشگوار تجربہ تھا۔

اور محمود الحسن سے ملنا، اسے پہلی مرتبہ دیکھنا سب سے بہترین، انوکھا اور اچھوتا سا تجربہ تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ویرا میں ایسا کیا تھا جس سے وہ بری طرح سے متاثر ہو گیا۔ اس کے بولنے کا انداز، اس کا اعتماد، اس کی ہنسی کے شگوفے یا پھر پاپا سے اس کی بے تحاشا بے تکلفی۔

ویرا اسے بھلا کیسی لگی تھی؟ اس سوال کا جواب اسے اسی پل گویا الہامی طور پر مل گیا تھا اور پھر۔

"مبرم! کہاں کھو گئے ہو تم؟" وہ ناراضی سے اس کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے گویا ہوئی۔

"ہوں۔" مبرم ایک دم چونک گیا۔

"کیا کھڑے کھڑے سو گئے تھے؟" ویرا دال کو بگھار لگاتے ہوئے بولی۔

"شاید، سچ مچ سو گیا تھا۔" وہ عجیب سے انداز میں کہتا پلٹ گیا تھا۔ ویرا کندھے اچکا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ تاہم مبرم کا پل پل بدلتا موڈ اسے الجھا کر رکھ دیتا تھا۔

٭ ٭ ٭

"مبرم! اٹھ جاؤ۔" آج پھر وہ بیماری کا بہانہ بنا کر نیند پوری کر رہا تھا۔ اسے آج ذرا جلدی کالج پہنچنا تھا۔ وہ تیار ہونے میں بھی بچوں کو مات کر دیا کرتا تھا۔ اور ناشتہ بھی بے حد نخرے دکھا دکھا کر کرتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ویرا کو اس کی نخرے بازیاں بہت بھاتی تھیں۔

"مبرم! اٹھ جاؤ ورنہ گرم پانی ڈال دوں گی۔" اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا۔ مبرم کی بند آنکھیں "فوراً" کھل جاتیں۔

"آج میں ذرا دیر سے جاؤں گا۔" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"کس خوشی میں۔" وہ طنزیہ بولی تھی۔ ساتھ ساتھ پھیلاوے کو بھی سمیٹ رہی تھی۔ مبرم کوئی بھی چیز ٹھکانے پر نہیں رکھتا تھا۔ اور وہ تھی بلا کی نفاست پسند۔

"سر عاشق آج چھٹی پر ہیں۔ سو اسی خوشی میں لیٹ جاؤں گا۔" اس نے آنکھیں موندے، موندے جواب دیا۔

"سر عاشق نے تو اپنی شادی والے روز بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ جھوٹ وہ بولا کرو جو قابل قبول ہو۔" وہ ڈسٹنگ والا کپڑا اٹھا کر ڈیکوریشن پیس جھاڑنے لگی تھی۔ مبرم نے لمبی سی جمائی لے کر کروٹ بدل لی۔

"شادی تھی، اسی لیے چھٹی نہیں کی۔ آج تو انہوں نے "ڈیٹ" پر جانا ہے۔"

"بکو مت۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

وہ چڑ کر اٹھ گیا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو کمرہ اپنی اصلی حالت میں آچکا تھا اور ناشتہ بھی میز پر تیار رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کی پھرتیوں کا ایک دفعہ پھر سے قائل ہو گیا حالانکہ اس کی اماں اور تین بہنوں کی موجودگی میں بھی کوئی چیز تیار نہیں ملتی تھی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کے ابو دونوں ہی عین وقت پر انہیں بوکھلا کر رکھ دیتے تھے، جس کی وجہ سے ان کے سیدھے کام بھی الٹے ہونے لگتے تھے۔ اور بھائی اور باپ کا پارہ ہائی دیکھ کر ویسے بھی بے چاریوں کو دانتوں پسینہ آجاتا تھا۔

وہ میز پر سجے لوازمات دیکھ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا تھا۔ سوجی کا حلوہ، میدے کی پوریاں اور اچار چنے کا سالن۔ اگر یہی ناشتہ سمانہ یا ثمو بڑے پیار سے بنا کر سامنے رکھتیں تو اس نے زمین آسمان ایک کر دینا تھا۔

"بھلا ان میدے کی پوریوں سے پیٹ بھرتا ہے؟" اس نے دانت پیس کر کہا۔ وہ جو رغبت سے ناشتے میں مصروف تھی۔ اس اعتراض کو سن کر تحمل سے بولی۔ "بھوک میں چنے بھی بادام ہوتے ہیں۔"

"مجھے یہ گھی میں تر بتر پوریاں پسند نہیں۔ پراٹھا بنادو۔" وہ پلیٹ پرے کھسکا کر بولا۔

"آٹا نہیں ہے۔" اس کا حوصلہ قابل دید تھا۔ اسے پانچویں پوری پر ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر وہ تحیر میں مبتلا ہو گیا۔

"تم کیسے کھا لیتی ہو؟"

"جیسے ہر کوئی کھا رہی ہوں۔ یعنی منہ سے۔" وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔

وہ گرما گرم چائے کا مگ بھی لے آئی۔ بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اور سوندھا سوندھا سنہرا سوجی کا حلوہ۔

"آج میں بھوکا ہی کالج چلا جاؤں گا۔ کاش گوشی اور اماں ہوتیں۔" لہجے میں خواہ مخواہ مسکینی بھر لی گئی تھی، مگر ویرا نے کوئی توجہ نہیں دی۔

"خالی معدہ ہو تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تم ٹھونس ٹھانس کر بھی کون سا توجہ دیتے ہو۔ بہتر ہے بھوکے ہی چلے جایا کرو۔" وہ ناشتہ کر چکی تھی اس لیے برتن بھی سمیٹنے لگی۔

"آج لسی بھی نہیں ملے گی؟"

"نہیں۔ البتہ ملک شیک پینا چاہو تو بنا دیتی ہوں۔" اسے خواہ مخواہ ہی ترس بھی آگیا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ جو بے دلی سے اٹھ رہا تھا، پھر سے بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں پاپا بھی چلے آئے تھے۔ ہاتھ میں اخبار پکڑ رکھا تھا۔ خود تو وہ مطالعہ کر ہی چکے تھے "اب ویرا کو دینے کے لیے آئے تھے۔

"ایک نظر جاتے جاتے دیکھ لو۔" پاپا بولے۔

پاپا نے باؤل میں سے تھوڑے سے چنے نکال لیے تھے۔ "آج تو ناشتے پر کافی اہتمام کیا گیا ہے۔" ان کی نظروں میں خاص ستائش تھی۔

"افسوس کہ آپ کے سڑی شکل والے بھتیجے کو یہ اہتمام پسند نہیں آیا۔" وہ پھرتی اور نفاست سے آم کاٹ کر جگ میں دودھ ڈالنے لگی تھی۔ ساتھ ہی سوئچ بورڈ پر گرائنڈر کا بٹن آن کر دیا تھا۔

"تم میرے بھتیجے کی پسند کا ناشتہ بنایا کرو۔"

"آپ کے بھتیجے کی پسند نیاز پور کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اور میں نیاز پور والوں جیسی نہ ہو سکتی ہوں۔ نہ ان جیسا کچھ بنا سکتی ہوں۔" اس نے مبرم کے گوشی کو یاد کرنے کا جواب دیا۔

"صرف شیک پی کر مبرم کالج جائے گا؟" اس نے جگ اور گلاس اٹھا کر مبرم کے سامنے رکھا تو پاپا خفگی سے بولے۔

"جی، یہ پورا جگ ابھی خالی ہو جائے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیے۔ پورا جگ شیک کا پینے کے بعد مزید کچھ بھی کھانے کی گنجائش نہیں رہتی۔" اس نے پاپا کو تسلی دی۔

"تم میرا کھایا پیا ہی گنتی رہنا۔" مبرم نے شکایتاً کہا۔ ان دونوں کو چونچیں لڑاتے دیکھ کر پاپا نے مبرم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"عزیزم بھتیجے! اس دفعہ پاس ہونے کا ارادہ ہے یا نہیں؟" پاپا نے کیا حساس اور نازک سا موضوع چھیڑ دیا تھا۔ مبرم میرا گلاس چڑھاتے ہوئے ذرا دیر کو رکا۔

"دیکھیں! کیا ہوتا ہے۔" اس نے مکاری سے جواب دیا۔

"نہ بچہ! یہ سیاست دانوں والا جواب مجھے پسند نہیں آیا۔" پاپا بھی پکے وکیل تھے۔ بال کی کھال اتارنے والے۔

"پاپا جی! یہ تو وقت پر ڈپینڈ کرتا ہے کہ وقت مجھ سے کیا فیصلہ کروائے گا۔" مبرم نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

ویرا کو اس کے سنجیدہ انداز پر بے انتہا ہنسی آگئی تھی۔

"اس دفعہ تو ویرا کی لاج رکھ ہی لینا یار! لوگ کیا کہیں گے۔ ویرا نے ٹھیک نیت سے پڑھایا نہیں۔" پاپا نے گویا درخواست کی تھی۔

"میں خود ٹھیک نیت سے پیپر نہیں دیتا۔ اس میں بھلا ویرا کا کیا قصور ہے۔"

"اس دفعہ ہم سب کے حال پر رحم کر لینا۔" ویرا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لائی تھی۔ مبرم سیل فون اور گاڑی کی چابی لیے ویرا کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔

"اتنی منت سے کہو گی تو پھر کچھ غور تو کرنا پڑے گا۔" وہ مسکراتا ہوا اس کے برابر چل رہا تھا۔ پاپا نے انہیں مسکراتی نظروں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور دل ہی دل میں دعا دی۔

"ہمیشہ یوں ہی ساتھ رہو۔" ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

٭ ٭ ٭

مبرم کے فائنل ایگزامز کے بعد ویرا نے بھی اچانک گاؤں جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ مبرم نے سنا تو بدک کر رہ گیا۔

"اب وہاں بھی میرے سر پر سوار ہو گی؟"

"تمہیں سدھار کھنے کے لیے میرا تمہارے ساتھ جانا ضروری ہے۔ ورنہ پھر سے اڑیل گھوڑے بن کر آجاؤ گے۔ مشکل سے سدھارا ہے تمہیں" وہ اپنے ضروری کام نمٹا رہی تھی۔ پھر اسے شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ چاچی، ثمن اور سمی وغیرہ کے لیے کچھ شاپنگ کرے گی۔ بہت بچپن میں وہ صرف ایک دفعہ امی اور پاپا کے ساتھ گاؤں گئی تھی۔ اور اس کے بعد آج جا رہی تھی۔ مبرم خواہ مخواہ کڑوا کریلا بنا ہوا تھا۔ اس کی تیاریوں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کپڑے استری کر کر کے ڈھیر لگائے جا رہی تھی۔ اور مبرم اندازہ لگا رہا تھا کہ گاؤں میں اس کا قیام کتنے دن تک کا ہو گا۔؟

"تم نے وہاں اپنا ولیمہ کروانا ہے، جو اتنا میک اپ اٹھا

کر لے جارہی ہو؟" مبرم کوئی دل جلانے والی بات نہ کرے، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی "بکواس" سن کر آنکھیں سکیڑے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ سارا سامان بطور گفٹ لے کر جاؤں گی تمہاری بہنوں کے لیے" ویرا نے وضاحت کی۔

"اور شاپنگ کے لیے کب تک نکلنا ہے؟" ظاہر ہے اس کام کے لیے بھی مبرم کو ساتھ ہی جانا تھا۔ حالانکہ سارے شہر کی سڑکیں روند نے اکیلی نکل جاتی تھی۔ اور شاپنگ کے لیے اسے ساتھ جانے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ اور ساتھ پاپا کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا تھا۔

ویرا کپڑوں کو سمیٹ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ ارادہ تھا کہ چائے بنا کر پاپا کو دے کر ہی جائے گی، مگر اسے کچن میں جاتا دیکھ مبرم نے اسکواش کے لیے کہہ دیا۔

"یہ کون سا "ٹھنڈا" پینے کا ٹائم ہے۔ لوگ اس وقت چائے پیتے ہیں۔" وہ چولہے پر چائے کا پانی چڑھا رہی تھی۔

"اب تقریر کرنے نہ بیٹھ جانا" میں خود بنا لیتا ہوں۔" مبرم بھی کچن میں آگیا۔

"مہربانی جناب کی۔" وہ طنزیہ بولی۔ "خبردار، جو کسی بھی چیز کو ہاتھ لگایا تو۔ ذرا سے کام میں اتنا پھیلاوا کر دیتے ہو۔"

"تو پھر خود بنا دو۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

اسکواش کا گلاس اسے تھما کر وہ پاپا کو چائے دینے چلی گئی تھی۔ پاپا سے باتوں میں کچھ وقت لگ گیا تھا۔ جب وہ واپس آئی اور اپنا مگ دیکھا تو حیران رہ گئی۔

"میری چائے کہاں ہے؟"

"جہاں اسے ہونا چاہیے۔" مبرم جاگرز کے تسمے کستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ وہ قد میں اس سے کافی اونچا تھا، اسی لیے ویرا کو کچھ گردن اٹھا کر بات کرنا پڑتی تھی۔

"تم نے چائے پی لی؟" ویرا حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ مبرم بھلا کہاں چائے پیتا تھا۔

"ہاں"

"پر تمہیں تو چائے پسند نہیں۔" ویرا الجھی۔

"پر تمہیں تو پسند ہے نا۔" مبرم ایک دم پلٹ کر اس کی طرف آیا تھا۔ "چائے میں تمہارا ساتھ کسی نہ کسی کو تو ضرور دینا ہوگا۔ اور وہ کوئی اور میں کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ اس کی شفاف آنکھوں میں جھانک کر کچھ دیر ٹھہرا رہا تھا اور پھر اسے آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

"ارے، یہ مبرم کیا بول گیا ہے۔" اسے خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

☼ ☼ ☼

شاپنگ مال میں گویا رنگ و بو کا سیلاب اترا ہوا تھا اور مبرم کا چہرہ اسے دھڑا دھڑ شاپنگ کرتے دیکھ کر اتر چکا تھا۔ وہ پندرہ منٹ کا کہہ کر آئی تھی مگر پچھلے تین گھنٹوں سے بذریعہ لفٹ اوپر نیچے آجا رہی تھی۔

مبرم تیوریاں چڑھائے ساتھ ساتھ تھا۔

"ویرا! اب اور کتنا کیا خریدنا ہے۔" وہ رکھائی سے پوچھنے لگا۔

"جب خواتین شاپنگ کر رہی ہوں تو مردوں کو صبر سے کام لینا چاہیے۔ ویسے تم بھی کچھ خرید لو یا چلتے پھرتے آئس کریم ہی کھالو۔ کیا روٹھی روٹھی بدمزاج دلہن کی طرح منہ بسورے میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

ویرا کا موڈ بہت ہی خوشگوار تھا۔ وہ مہنگی مہنگی جیولری خرید رہی تھی۔ یہ تمام تر شاپنگ گاؤں والوں کے لیے تھی۔ خود تو وہ بہت ہی سادہ حلیے میں رہتی تھی۔

اس اثنا میں اویس چلا آیا تھا۔ وہ بھی شاید شاپنگ کرنے آیا تھا یا پھر آوارہ گردی کرنے۔

"السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام، چلو اچھا ہوا تم بھی مل گئے ہو۔ یہ مبرم بڑا بے قرار ہو رہا تھا تمہارے گھر جانے کے لیے" ویرا نے سلام کے جواب کے بعد کہا۔

"میں اس کی بے قراری دور کرنے کے لیے بس آپ کے گھر آنے ہی والا تھا۔" اویس اسے آنکھ مار کر بولا۔ جواباً مبرم نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"کبھی کبھار آجایا کرو۔ مبرم بہت اداس رہتا ہے تمہارے لیے۔" اس نے طنز کا تیر پھینکا اور مڑ کر چوڑیوں کی دکان کی طرف چلی گئی۔

"بڑے خوش نصیب ہو، میم استانی بھی ہیں اور منگیتر بھی۔" اویس کو خواہ مخواہ رشک آرہا تھا۔

"کسی کو کیا خبر کہ کون خوش نصیب ہے۔" مبرم کا لہجہ ایک دم عجیب سے دکھ کی بدولت بوجھل ہو گیا۔

"ہائے یہ فلسفہ۔" اویس کو مسخریاں سوجھ رہی تھیں۔ وہ مبرم کا کزن نما دوست تھا۔ بچپن سے ہی وہ مبرم کے بہت قریب تھا اور ان کے گھریلو حالات سے بھی بخوبی واقف تھا اور مبرم کے دل میں پوشیدہ ہر راز سے بھی تب ہی تو اسے مبرم کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو جس چیز کی طلب کرتے ہیں اور پھر اسے پا بھی لیتے ہیں۔

"پلیز یار!" مبرم نے گویا التجا کی۔

"تم ابھی تک گاؤں بھی نہیں گئے۔" اویس سمجھ کر سرہلا گیا تھا۔

"کل ان محترمہ کو ٹیلر سے کپڑے ملیں گے پھر پرسوں تک گاؤں جانا ہے۔" اس کی نظریں دکان دار سے بحث میں الجھی ویرا کے ارد گرد بھٹک رہی تھیں۔

"میم بھی گاؤں جارہی ہیں؟" اویس کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں" وہ بے دلی سے بولا۔ "کتنا مشکل ہے، ہاتھ آئی نعمتوں کو دھتکار دینا۔" وہ خود اذیتی کا شکار تھا۔

"تم۔" اویس کچھ پل بول ہی نہ پایا۔ "کیا تم اپنے اور ان کے ساتھ اچھا کر رہے ہو، پھپھا جی کے ساتھ ضد میں صرف تمہارا اپنا نقصان ہے۔"

"تم اپنے پھپھا جی کی ذہنیت سے واقف جو نہیں ہو۔" وہ زہر خند ہو کر رہ گیا۔

"اپنے والدین کے بارے میں ایسا سوچنا بھی درست نہیں یار! چلو، اس وقت انہوں نے تمہاری بات نہیں مانی، مگر اب تو خود بخود سارے راستے صاف ہو رہے ہیں نا۔ پھر تم کیوں اس قدر اپ سیٹ ہو۔" اویس کا انداز ناصحانہ تھا۔

"اس لیے کہ میں جانتا ہوں۔ اس سارے معاملے کی کڑی کہاں جا کر ملتی ہے۔" اس نے ضبط کے عالم میں اپنے لب کچلے تھے۔

"عجیب پہیلیاں بجھواتے رہتے ہو۔ میرے بھیجے میں تمہاری باتیں نہیں سما سکتیں۔" اویس سمجھ کر بھی انجان بن جاتا تھا۔ اس کے زخموں کو ادھیڑنا اویس کو کبھی بھی گوارا نہیں تھا۔

"تم نے ایسی باتوں کو سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے۔ کھیلنے کے دن ہیں تمہارے، خوب کھیلو کودو۔" وہ بے دلی سے مسکرایا۔

"کھیل کود تو رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے میرا معاملہ بھی اٹکا ہوا ہے۔ اب تک ہماری نیا بھی پار لگ جانا تھی۔" اویس کو اپنے دکھڑے یاد آگئے تھے۔ "ویسے پھپھا جی بھی جلد از جلد اس معاملے کو نمٹانا چاہتے ہیں۔ انہیں خدشات لاحق ہیں کہ تم کہیں چھپ چھپا کر گوشی سے زبردستی کورٹ میرج ہی نہ کر لو۔" تب ہی ویرا آگئی تھی۔

"احمقوں کی طرح کھڑے ہو۔ بندہ کم از کم ونڈو شاپنگ ہی کر لیتا ہے۔" اس نے کہا۔

"جی، شاپنگ تو کی ہے۔ دیکھنے دکھانے والی نہیں۔ اصلی شاپنگ۔" اویس نے جھٹ سے ایک شاپنگ بیگ اس کے سامنے کر دیا تھا اور ویرا نے بھی اسی پھرتی سے بیگ کھول کر دیکھ لیا۔ "میں دیکھ لوں تم نے کیا خریدا ہے؟"

وہ شاپنگ بیگ کھول کر اس سے اجازت لے رہی تھی۔

"ضرور میم! کیوں نہیں۔"

"اپنی بہن کے لیے شاپنگ کی ہے؟" وہ اسٹائلش سے دو سوٹ دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"اللہ نہ کرے۔ میں نے اسے بہن نہیں بنایا۔" اویس ایک دم دہل کر رہ گیا۔

"تو پھر؟"

"یہ ہماری "انہوں" کے لیے ہیں۔ مبرم کے ہاتھ بھیجوں گا۔ ویسے اطلاعاً "عرض کرتا ہوں۔ میری کوئی بہن اور بھائی نہیں۔ اکلوتا ہوں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" ویرا کو خوشگواریت سی محسوس ہوئی۔ "ویسے کبھی اس ڈفر کو بھی سمجھادیا کرو کہ "تحفوں" کے لین دین سے محبت مضبوط بھی ہوتی ہے اور بڑھتی بھی ہے۔" وہ کچھ شاپنگ بیگ مبرم کے ہاتھ میں تھماتی معنی خیزی سے بولتی باہر کی طرف بڑھ گئی تھی جبکہ یہ دونوں کچھ تحیر زدہ سے رہ گئے۔

"ہونے والی بھابھی کیا بول گئی ہے یار!" اویس، مبرم کے کان میں گھس گیا تھا۔

"لگتا ہے، محترمہ کو کوئی "تحفہ" دینا ہی پڑے گا۔" مبرم اپنے سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔

"تو نیک کام میں دیر کیسی۔ ابھی کچھ خرید لیتے ہیں۔" اویس نے بے صبری دکھائی تھی جبکہ مبرم اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کلب سے واپس آئی تو مبرم اور اویس کو لان میں خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر ان دونوں کی طرف ہی آگئی تھی۔ وہ دونوں ہی اسے دیکھ کر احتراماً "سیدھے ہو گئے۔ ان کے مصنوعی مودب انداز کو دیکھ کر ویرا کو ہنسی تو بہت آئی تھی مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دی۔

"میرے کپڑے ٹیلر سے لے آئے ہو؟" وہ لان میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ کل فجر کے بعد انہیں گھر سے نکلنا تھا۔ سو کپڑوں کو آج ہی ٹیلر سے لے کر آنا تھا اور وہ یہ کام مبرم کے ذمہ لگا کر گئی تھی۔

"آتے کے ساتھ ہی استانی بن جاؤ۔ بس!" مبرم کے منہ میں ڈھیروں کڑواہٹ گھل گئی۔

"یعنی نہیں لے کر آئے۔" وہ گویا چیخ اٹھی۔

"میری مجال ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "آپ کے حجرے میں رکھ کر آیا ہوں۔ جا کر اک نظر دیکھ لیجیے اور جی بھر کے نقص نکال لیجیے۔" وہ اس کی نکتہ چینی والی عادت سے سخت خار کھاتا تھا۔

"تھینک یو سو مچ۔ میں جانتی تھی۔ تم میرا کام بھول ہی نہیں سکتے۔"

"مجھے طعنے اور لیکچر سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس لیے لے آیا ہوں۔" مبرم نے بھی وار خالی نہیں جانے دیا تھا۔

"بس باتیں جتنی مرضی کروالو۔ کبھی پرچے میں بھی کچھ لکھ کر آجایا کرو۔ بلینک پیپر پکڑا آتے ہو۔"

"اس دفعہ بہت کچھ لکھ کر آیا ہوں۔ تمہاری محنت کو ضائع نہیں کیا۔ بس ترس آگیا تھا تم جیسی ٹیوٹر پر۔ ہماری قوم کو تم جیسے استاد مل جائیں تو کیا ہی بات ہو۔"

"یار اتنی دیر سے بیٹھا ہوں نہ چائے پوچھی ہے نہ پانی۔" اویس نے مداخلت کی۔

"تم نے اویس کو چائے بھی نہیں پلائی؟ شرم کرو وہ مہمان ہے کم از کم چائے تو پلا سکتے تھے نا۔" ویرا کو سچ مچ بہت افسوس ہوا۔ وہ تو بلا کی مہمان نواز تھی۔ گھر آئے مہمان کو کبھی سوکھے منہ نہیں جانے دیتی تھی۔

"کب سے باتوں پر ٹرخا رہا ہے۔" اویس نے مزید منہ بسور کر شکایت لگائی۔

"زیادہ چاپلوسی کرنے کی ضرورت نہیں۔" مبرم نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔ "تمہارے جیسے مہمانوں کو میں کیوں کچھ بنا کر دوں جبکہ میں خود بھی مہمان ہوں۔"

"مہمان صرف تین دن کا ہوتا ہے، ذرا حساب لگاؤ، کب سے یہاں پر رہ رہے ہو۔" وہ بھی تو اویس تھا، حساب کتاب میں مبرم کی طرح ماہر۔ "اور کب سے یہاں کا کھا رہے ہو؟"

"تم میری روٹیاں گننے آئے ہو؟" مبرم اس پر چڑھ دوڑا۔

"میری یہ مجال۔" اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تھی۔ "میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس گھر کا کھایا پیا حلال کر جانا۔" اویس کا اشارہ اس کے امتحانات کی طرف تھا۔

"توبہ، کس قدر بولتے ہو تم دونوں۔" ویرا کو مداخلت کرنا پڑی۔ "چائے لاؤں کیا تم دونوں کے لیے؟" وہ اٹھتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔

"بس رہنے دیں ویرا جی! میرا تو روز، روز کا آنا جانا ہے، چائے پینا بلکہ روز، روز پینا کوئی اچھی بات ہے۔" اویس نے خوامخواہ شرمندگی خود پر طاری کر لی تھی، جبکہ مبرم اس کی چالاکی پر تاؤ کھا کر رہ گیا۔

"ارے، یہ کیا بات ہوئی۔" ویرا اس کی شرمندگی پر خود شرمندگی محسوس کرنے لگی تھی۔ "میں ابھی چائے لائی ہوں۔ بلکہ تم کھانا بھی کھا کر جانا۔ اسی بہانے مبرم کا دل بھی لگا رہے گا۔"

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔"

"ہائے، مبرم کے دل کا اس قدر خیال۔" اویس کو گویا ٹوٹ کر پیار آگیا۔

"تم کیوں بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو، جبکہ مادام تم سے مخاطب نہیں، مجھ سے ہم کلام ہیں۔" اویس نے فاخرانہ سینہ پھیلایا۔

"مادام کی چالاکیوں سے میں اچھی طرح سے آگاہ ہوں۔ تمہاری آڑ میں سنایا تو مجھے ہی جا رہا ہے۔" مبرم نے جتا جتا کر کہا۔

"بڑی خوش فہمیاں لاحق ہیں جناب کو۔" اویس کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔ ویرا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"میں بھی اسے یہ ہی اکثر بتاتی ہوں کہ مت خوش فہم بنو اس قدر، کبھی کبھی دوسروں کی خوشی کی خاطر زہر کا جام بھی پینا بھی پڑتا ہے۔" اس نے چمکتی آنکھوں سے مبرم کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ الفاظ آنکھوں میں جلتی قندیلوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور مبرم نیازی اچھی طرح سے جانتا تھا یہ زہر کا پیالہ نہیں، امرت کا جام ہے اور شاید محبت کا بھی۔

"تو نہ پیو، زہر کے اس جام کو بلکہ کسی اور کے لیے رکھ چھوڑو۔" مبرم نے سلگ کر کہا۔

"کوئی اور کیوں اس زہر سے زہریلا ہو جائے، میں بھلا ایسی خود غرضی کا مظاہرہ کر سکتی ہوں۔"

"یہ زہر تو آپ کو ضرور ہی پینا ہے ویرا صاحبہ جی! اگر یہ کام آپ نے نہ کیا تو مجھے خدشہ ہے کہ گوشی معصوم، مظلوم اور مغموم کو مجبوراً "پھانسی کے پھندے کے قریب کر دیا جائے گا۔ میرے منہ میں ماسی رحمت کے تندور کے دہکتے انگارے پڑیں، سات سمندروں کی ریت پڑے، کوئی کالا بھڑ مجھے کاٹ جائے، میرے منہ میں پھر سے خاک، اللہ نہ کرے، اگر اس کی شادی گوشی سے ہو گئی تو یہ ظالم، وحشی اور جلاد صفت انسان تو گرج گرج کر ہی اسے مار ڈالے گا۔ اس معصوم کا تو چڑیا جتنا دل ہے۔ یہ گھر میں داخل ہو جائے تو وہ کسی ایسے کونے میں خوف کی وجہ سے جا چھپے جہاں اس دیو کی آواز اس تک نہ پہنچ پائے۔

میں تو دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ یہ جن آپ کے قبضے میں ہی رہے۔ آپ کے علاوہ اس جلاد کو کوئی قابو نہیں کر سکتا۔ معصوم سی بے چاری گوشی تو بے موت ہی ماری جائے گی۔ بس آپ یہ زہر کا پیالہ پی ہی جائیں۔" اویس نے جس مسخرے انداز میں کہا تھا ویرا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گاؤں جانا اس کے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی وجہ سے کافی تکلیف دہ سفر ہونے کے باوجود ذرا بھی تھکاوٹ کا شکار نہیں تھی۔

نیاز پور کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ ان کا گھر گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ ارد گرد سبزہ ہی سبزہ تھا۔ کینوؤں کے باغات تھے۔ شاخوں پر چھوٹے چھوٹے بیر کے سائز جتنے کینو لگے ہوئے تھے۔ پھل ابھی بہت چھوٹا اور کچا تھا۔ سرما کی شدید سردی میں اس پھل نے پک کر تیار ہونا تھا۔ گھر میں ان کی آمد کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ تب ہی تو نہ جانے کس کس کونے سے سمانہ، ثمرہ اور سمن بھاگی بھاگی چلی آئیں۔

"بھایا آئے ہیں اور وہ بھی۔۔۔" ثمرہ بھاگ کر گوشی کو بھی مطلع کر آئی تھی۔ سمانہ اور سمن کا والہانہ استقبال ویرا کو بے حد مسرور کر گیا تھا۔

مبرم تو نہ جانے کون کون سی جھوٹی کہانیاں سناتا رہتا تھا کہ سمانہ اور ثمرہ اسے ناپسند کرتی تھیں۔ ویرا کو دیکھنا

بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ ایسی تو کوئی بات ان کے رویے سے ظاہر نہیں ہورہی تھی، بلکہ وہ تو بے انتہا خوش تھیں۔ خصوصاً" سمن تو بہت ہی زیادہ خوشی کا اظہار کررہی تھی۔ حتیٰ کہ چاچی تک نے کافی خوش دلی سے اسے گلے لگایا تھا۔ اسے کم از کم چاچی سے اتنی لگاوٹ کی امید نہیں تھی۔

"ویرا باجی! آپ بتا کر آتیں نا، ہم آپ کے لیے اچھا سا کھانا بنالیتے۔ بھایا تو اپنے آنے کا کبھی نہیں بتاتے۔ پھر جب نہ من پسند کھانا ملتا ہے اور نہ ہی کچھ اور تو پھر ہنگامہ کرتے ہیں۔" سمانہ اس کا ہاتھ تھام کر بڑے پیار اور اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔

"جو کھانا تم لوگ کھاؤ گے، میں بھی وہ ہی کھاؤں گی۔ میرے لیے تکلف مت کرنا۔" وہ سمانہ اور ثمرہ کو کچن میں جانے نہیں دے رہی تھی۔

"تکلف کیسا؟ پہلی دفعہ تم آئی ہو۔ روٹی تو کم از کم اچھی ہونا چاہیے۔" چاچی شاید بہنوں کو ترتیب دینے لگی تھیں، جب ویرا نے کافی سختی سے انہیں منع کردیا۔

"میں ابھی کچھ دن تک ادھر ہوں۔ اچھی سی روٹی کا اہتمام پھر کسی دن کرلیجیے گا۔" اس نے سب کی مشکل آسان کردی تھی۔

سمن آڑو کا جوس بنا کر لے آئی تھی۔ دو جگ لبالب بھرے تھے۔ ایک جگ اور گلاس وغیرہ اس نے بیٹھک میں مبرم کے لیے بھجوا دیا تھا۔ ثمرہ پھر سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ سمانہ اور سمن اس کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش تھی۔ وہ اس کی بول چال، پہننے اوڑھنے کے سلیقے سے خوب متاثر ہورہی تھیں۔

"لڑکیو! ویرا کو اے سی والے کمرے میں لے چلو، گرمی بہت ہے، وہیں بیٹھ کر باتیں کرلینا، بلکہ پہلے اسے آرام کرنے دو، سفر سے تھکی ہوئی آئی ہے۔" چاچی نے گھٹنوں پر زور دے کر اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ سمانہ اور سمن اسے اے سی والے کمرے میں لے آئی تھیں۔ کمرہ کافی کھلا، ہوادار اور آرام دہ بھی تھا۔ وہ سب سے پہلے نہا کر تازہ دم ہوگئی تھی اور اس کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹی تھی اور پھر سو بھی گئی۔

اس کی آنکھ اذان کی آواز سن کر کھلی تھی۔ موذن ظہر کی اذان دے رہا تھا۔ ویرا نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا، وضو کیا اور پھر نماز بھی پڑھ لی تھی۔ کچھ دیر آرام کرلیا تھا، سو اسی لیے وہ فریش بھی ہوچکی تھی۔ ابھی وہ باہر نکلنے کے لیے سوچ رہی تھی جب دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا۔

"السلام علیکم۔" وہ جھکی جھکی آنکھوں والی بہت ہی پیاری سی لڑکی تھی۔ ویرا گویا فوراً" ہی سمجھ گئی۔

"وعلیکم السلام، تم گوشی ہو؟" وہ بہت خوش دلی سے گوشی سے ملی۔

"جی۔۔۔ آپ سنائیں۔ ٹھیک ہیں؟ سفر اچھا رہا؟" گوشی نے بہت شائستگی سے پوچھا۔

"بہت اچھا۔۔۔ میں نے کافی انجوائے کیا، تم بیٹھو نا۔" وہ بالوں میں برش کررہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کے بینڈ میں بالوں کو سمیٹا۔

"نہیں۔ بیٹھوں گی نہیں۔ آپ کو دیکھنے کے لیے آئی تھی کہ آپ اٹھی ہیں یا نہیں۔ کھانا لگا دیا ہے، خالہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"اوکے، تم چلو میں آتی ہوں۔" وہ واش روم میں ہاتھ دھو کر خود بھی باہر آگئی تھی۔ دسترخوان ہال کمرے میں بچھایا گیا تھا اور بہت ہی ترتیب سے اور نفاست کے ساتھ کھانا چُن رکھا تھا۔ ویرا نے اک نظر دسترخوان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کرلیا نا تکلف۔" دسترخوان پر مختلف لوازمات رکھے تھے۔ بھنی ہوئی مرغی، پلاؤ، رائتہ اور سادہ روٹی کے ساتھ فروٹ کسٹرڈ بھی تھا۔

"تکلف کیسا، گھر کی بیٹی ہو، پہلی دفعہ آئی ہو، اگر مبرم اطلاع کردیتا تو کچھ اور بھی اہتمام کرلیتے۔" چاچی کا اخلاق اسے خاصا متاثر کررہا تھا۔

"مبرم کہاں ہے؟" اس نے اپنے دائیں بائیں بیٹھی لڑکیوں سے پوچھا۔

"بھایا بیٹھک میں ہیں، ان کے گاؤں میں رہنے والے یار دوست ملنے کے لیے آئے ہیں۔" ثمرہ نے وضاحتی انداز میں بتایا۔

"مبرم کھانا نہیں کھائے گا؟" سمن اس کے لیے پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی، مگر ویرا نے توجہ نہیں دی۔ اس کا دھیان مبرم میں اٹک گیا تھا۔

"وہ بیٹھک میں کھانا کھاتے ہیں۔ خالو جی کے ساتھ یا پھر اکیلے۔" اب کے گوشی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" ویرا کو مبرم کا یوں گھر والوں سے الگ تھلگ کھانا کھانا پسند نہیں آیا۔ "کہاں ہے وہ، بلاؤ اسے۔"

"پتر! یہ تو ان کا روز کا معمول ہے، ہمارے مرد ماؤں، بہنوں، بیویوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے۔" چاچی نے گویا اسے سمجھانا چاہا۔

"بھایا بیٹھک میں ہی کھانا مانگ رہے ہیں، وہ اندر نہیں آئیں گے۔" سمن نے بتایا۔

"جاؤ گوشی جلدی سے کھانا نکال کر بیٹھک میں بھجوا دو۔" ثمرہ اور گوشی سر پر پیر رکھ کے کچن میں بھاگنا چاہ رہی تھیں جب ویرا نے انہیں روکا۔

"کوئی ضرورت نہیں، اگر وہ کھانا کھانے کی خواہش رکھتا ہے تو یہاں ہمارے ساتھ کھائے، ورنہ بھوکا رہے۔"

"ویرا باجی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" گوشی اور ثمرہ خوف کے مارے ہکلا کر رہ گئیں۔ "وہ ہماری جان نکال دیں گے۔"

"جو کہہ دیا ہے، بس اسی کو کافی جانو، آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔"

"یہ ایسی ہی باتیں کرتی ہے۔" چاچی جو اس کے سارے رنگ ڈھنگ دیکھ آئی تھیں۔ سو اطمینان سے کہنے لگیں۔ ان کے بیٹے کی بولتی بند بس یہ ہی کرواسکتی تھی۔ وہ جتنے دن وہاں رہ کر آئی تھیں بس حیران ہی ہوتی رہیں۔ سو اس وقت انہوں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اب ان بے چاریوں کے حیران ہونے کی باری تھی ——— اسی وقت مبرم کا پیغام آگیا۔

"آپا جی! بیٹھک میں روٹی بھجوا دیں۔" منیر چاچا اپنا کھانا لینے کے لیے آئے تھے۔ پیغام دے کر چلے گئے، کچھ دیر بعد مبرم خود آگیا تھا۔

"تم لوگوں نے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے، میں کب سے بکواس کیے جارہا ہوں، خود شاہی خوان سجائے بیٹھے ہیں۔" وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ ویرا نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا اور بولی۔

"ذرا تمیز کے جامے میں رہ کر بات کرو، اپنی بہنوں سے مخاطب ہو، کنیزیں نہیں ہیں تمہاری اور یہ شاہی خوان تمہارے لیے سجا رکھا ہے۔ ہم لوگ تمہارا انتظار کررہے تھے، آؤ یہاں۔" وہ چاچی کی طرف اشارہ کررہی تھی، تاکہ وہ ماں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ جائے۔

"میں یہاں۔۔۔" وہ ایک دم کچھ گھبرایا۔

"ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں کیا حرج ہے؟ وہاں بھی تو میرے اور پاپا کے ساتھ کھاتے تھے۔" اس کی جرح مبرم کو غصہ دلا رہی تھی۔

"وہاں کی بات اور تھی۔" مبرم نے گویا دانت پیسے۔

"کیوں بھئی؟" وہ حیران ہوئی۔ "یہاں اور وہاں میں کیا فرق ہے؟ ادھر تمہاری تین بہنیں اور ماموں موجود ہیں، ان سے بھلا کیا جھجک؟ بس میں اور گوشی ہی کچھ دور کے رشتہ دار ہیں نا، تو ہم دونوں اٹھ جاتی ہیں۔" ویرا نے رسان سے کہا۔

"ویرا!" مبرم کا بس نہیں چل رہا تھا، اس کی قینچی جیسی زبان کو کسی قینچی سے ہی کتر ڈالتا۔ ادھر گوشی اور ثمرہ وغیرہ کو مبرم کی پتلی حالت پر ہنسی آرہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا! کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے۔" چاچی نے بحث کے خاتمے کی خاطر مبرم کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھا لیا۔ "مہمان بچی ہے، تمہارا اتنا خیال رکھتی ہے، کیا حرج ہے جو اس کی بات مان جاؤ گے۔" وہ بیٹے کو پچکار رہی تھیں۔

"مہمان بچی ہمیشہ کے لیے آپ سب کے سروں پر سوار ہو جائے گی۔" سمن نے بھائی کی پلیٹ میں سالن نکال دیا تھا اور اسے کھانا ہی پڑا۔ اس کایا پلٹ پر سب حیران تھیں۔ ویرا کی آمد نے اس گھر پر چھائے سناٹے اور جمود کو توڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چاچا جی، ویرا پر کمال کی مہربانیاں کر رہے تھے۔ ان سب کو ویرا کے ساتھ گاؤں گھومنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اگرچہ مبرم نے کافی اعتراضات کیے تھے، مگر پھر چاچا جی نے جب اجازت دے دی تو مبرم کو خاموش رہنا ہی پڑا۔

ویرا کے جلو میں یہ چھوٹا سا لشکر سیاحت کے لیے نکل چکا تھا۔ حالانکہ گاؤں میں دیکھنے والی کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ ایک گدلے پانی کی نہر تھی۔ یا پھر آم کے باغات تھے اور خربوزوں کے کھیت۔ ویرا کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور وہ فطرت کے حسن کو بہت دل سے محسوس کر رہی تھی۔

ثمرہ، سمانہ اور سمن تینوں خربوزے توڑنے کے لیے کھیت میں اتر گئی تھیں۔ سمن برابر والوں کے تربوز دیکھ رہی تھی۔ ان کے برابر میں کسی اور کی زمین تھی۔ اس کھیت میں تربوز لگے ہوئے تھے۔ ویرا کے پوچھنے پر گوشی نے اسے بتایا۔

"یہ میرے ماما جی کی زمین ہے۔ آپ کے شہر میں ہی ہوتے ہیں۔" وہ دونوں اس وقت ٹیوب ویل کے حوض کی چار دیواری نما کچھ اونچی سی دیوار پر بیٹھی خربوزے کھا رہی تھیں۔

"اویس لوگوں کی؟"

"جی.... کیا آپ اویس کو جانتی ہیں؟" گوشی کچھ چونک گئی۔

"ہاں، اکثر ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔" اس نے لاپروائی سے خربوزہ کھاتے ہوئے بتایا۔

"خالو جی کا جھگڑا چل رہا ہے ماما جی کے ساتھ، زمینوں کے کچھ مسئلے پر۔" نہ جانے کیوں گوشی بے انتہا افسردہ ہو گئی تھی۔

"اچھا.... مگر کیوں؟" اس کی رنجیدگی محسوس کر کے وہ ٹھٹکی۔

"بس ایسے ہی.... معمولی سی بات تھی، مگر خالو جی نے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ جو زمین خالو جی خریدنا چاہتے تھے، وہ ماما جی نے خرید لی تھی، بس اسی وجہ سے۔" گوشی لب کچل کر خاموش ہو گئی۔

"اتنی معمولی سی بات پر رنجش۔"

"جی.... اسی لیے انہوں نے میرا رشتہ بھی توڑ دیا۔" گوشی کی آنکھیں برسنے کو بے تاب ہو گئیں۔

"رشتہ توڑ دیا۔" اب کے وہ پوری اس کی طرف گھوم گئی تھی۔

"پہلے خود ہی اویس کے ساتھ میری منگنی کی تھی اور پھر خود ہی توڑ بھی دی۔ ماما جی اتنی دفعہ آئے ہیں، مگر خالو مانتے ہی نہیں۔" وہ لب کچلتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ شفاف آنسو اس کے گالوں پر پھسلتے جا رہے تھے۔

"خالہ چاہتی تھیں کہ مبرم بھایا سے میری شادی ہو، مگر جب ماما جی نے میرا رشتہ اویس کے لیے مانگا تھا تو پھر خالہ نے انہیں ہاں بول دی، مگر اب خالو نے نہیں مان رہے، وہ میرا رشتہ کہیں اور کر رہے ہیں، سمانہ کے سسرال میں۔"

"مگر چاچا جی ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" وہ گوشی کے آنسوؤں سے اندازہ تو لگا ہی چکی تھی کہ اویس سے کس حد تک اس کی جذباتی وابستگی ہے۔

"پتا نہیں کیوں۔" سمن دو بڑے سائز کے تربوز اٹھا لائی تھی۔ گوشی نے سرعت سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"تمہارے "ان" کے کھیت سے چوری کا مال اڑا لائی ہوں۔" سمن اب ٹیوب ویل کے ٹھنڈے ٹھار پانی سے تربوز دھو کر ٹھنڈے کر رہی تھی۔ سمانہ اور ثمرہ بھی کیچڑ میں لت پت ہاتھ پیر لیے آ گئیں۔

"تم روئی ہو؟ آنکھیں کیوں سرخ ہیں تمہاری؟"

سمانہ کی آنکھوں میں فکرمندی اتر آئی۔ وہ گوشی کی طرف متوجہ تھی۔

"نہیں تو..." وہ ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھیں مسلنے لگی۔

"اویس کے تربوز دیکھ کر اویس یاد آگیا ہوگا۔"

ثمن اسے ہنسانے کی کوشش کررہی تھی۔ گوشی کو اپنا موڈ بحال کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنی جان سے پیاری کزنز کو اپنے لیے فکرمند ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی اور یہ سچ ہی تھا کہ سمانہ اور ثمرہ کو گوشی بے انتہا عزیز تھی۔ بچپن سے اکٹھے رہنے کی وجہ سے انسیت بڑھتی چلی گئی تھی۔ پھر جب ابو نے مبرم کا رشتہ ویرا سے طے کردیا تو ان سب کو اماں سمیت بہت دکھ کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا تھا۔

وہ گوشی جیسی معصوم اور پیاری، بے انتہا ہمدرد لڑکی کو ہی اپنی بھابھی بنانا چاہتی تھیں۔

مگر جب انہیں گوشی کی اویس کے لیے پسندیدگی کی بات معلوم ہوئی تو خود بخود ان کے دلوں اور ذہنوں نے ویرا کو بطور بھابھی قبول کرلیا تھا۔ وہ گوشی کا دل ٹوٹنے کے خیال سے افسردہ تھیں، مگر جب حقیقت معلوم ہوئی تو مطلع خود بخود صاف ہوگیا۔ ویرا کے لیے کینہ، بغض اور کدورت کا بھی خاتمہ ہوگیا تھا۔

"جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔" گوشی جھینپ کر مسکرادی۔ ثمن تربوز کاٹ رہی تھی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا میٹھا بے حد سرخ تربوز کھا کر وہ سب شام ڈھلے گھر واپس آئی تھیں۔



چھت کے پچھواڑے ایک قطار سے بلند و بالا درخت لگائے گئے تھے، جن کی اونچی، گھنی اور بلند شاخیں چھت کو بھی سایہ بخشتی تھیں۔ شام کو اس قدر ٹھنڈی ہوا چلتی تھی کہ گویا سرور آجاتا۔ شام سے پہلے ہی سورج گھنی شاخوں کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔ سو گرمائش اور تپش کا خود بخود خاتمہ ہوجاتا۔

ویرا کو شام کے وقت چھت پر ٹہلنا پسند تھا۔ اکثر سمانہ اور ثمن چائے کے لوازمات لے کر اوپر ہی آجاتی تھیں۔ ویسے مبرم اور ابو جی انہیں بہت کم ہی چھت پر ٹہلنے کی اجازت دیتے تھے، مگر ان دنوں ویرا کی وجہ سے ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ وہ نرم نرم، پکی پکی جامنیں پیالے میں اتار کر رکھتی جارہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ڈوبتے سورج کو الوداع کہا تھا اور خود سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ گیلری میں سے گزرتے ہوئے مبرم کے کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ کر وہ اندر جھانکنے سے باز نہیں آئی تھی۔ مبرم ایک پیکٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا جو اس نے گوشی کے ہاتھ میں تھمادیا۔

"اویس نے خریدے ہیں اور مامی نے بھجوائے ہیں۔ اب یہ نہیں پتا کہ مامی کی آڑ میں اویس صاحب نے کیا کچھ تحفتاً بھیجا ہے ویسے اس کی جاب بھی لگ چکی ہے۔"

"شکریہ بھائی۔" گوشی نے بے ساختہ خوشی چھپاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ شکریہ بھی اسی کا ادا کرنا۔ ابھی کچھ دیر بعد اس کی میرے سیل پر کال آئے گی۔ احتیاط سے بات کرکے سیل مجھے واپس کردینا۔" اس نے اپنا موبائل فون بھی گوشی کو تھمادیا تھا۔ گوشی کے باہر نکلتے ہی ویرا دبے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اگرچہ ساری بات تو وہ سن ہی چکی تھی، مگر مبرم کو بھلا کیوں نہ جلاتی۔

"اوہو... تو تحفے تحائف دیے جارہے تھے۔"

"جی، بالکل... جب تم میرے گھر والوں کو دو، چار تحفے دے کر اپنا گرویدہ بنا سکتی ہو تو میں بھلا کیوں پیچھے رہتا۔" وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے ہی دیتا تھا۔

"اور تم نے سوچا، کیوں نا گوشی کو اپنا گرویدہ بنالیا جائے۔" ویرا نے گویا خوب ہی لطف لیا۔ وہ اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے ایسی گھٹیا کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔" اپنی بات میں وہ خود ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

"مگر میں نے خود تمہیں یہ گھٹیا کوشش کرتے

ہوئے دیکھا ہے۔" وہ جان بوجھ کر اسے چڑا رہی تھی۔

"کوئی کام ہے مجھ سے؟" وہ اس کے کمرے میں آنے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔

"کام تو ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"بولو۔" مبرم کا انداز مصروف سا تھا۔

"یہ گوشی اور اویس کا کیا معاملہ ہے؟" وہ دوپٹے کے ایک کونے میں لپیٹے جامن نکال کر کھانے لگی تھی۔

"جب جانتی ہو تو پھر پوچھنے سے حاصل۔"

"چاچا جی ظالم سماج کس خوشی میں بن رہے ہیں؟"

"چاچا جی ظالم سماج ہی نہیں ظالم جلاد بھی ہیں۔ دوسروں کی خوشیوں کا رس نچوڑنے والے۔" وہ گویا زہرخند ہوا تھا۔

"اب یوں تو نہ کہو، یہ چین تمہارے نام کی انہوں نے ہی مجھے پہنائی ہے۔" ویرا مسکرا کر بولی تھی۔

"بس اسی بات پر خوش ہوتی رہنا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "اچھی بات ہے تم پر آگہی کے عذاب نہیں اترے۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہونا۔"

"نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"ویرا بی بی! کیوں گھر بدر کرنا چاہتی ہو۔" اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔ اور پھر وہ کچھ دیر کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ ویرا کمرے کے عین وسط میں کھڑی رہ گئی۔



"ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔"

گاؤں میں پورے تین ہفتے رہنے کے بعد جب وہ شہر لوٹی تو چاچا جی اور چاچی تاریخ طے کرنے کے لیے آگئے تھے۔ زبانی کلامی تاریخ تو طے ہوگئی تھی۔ تاہم باقاعدہ شگن کی رسم کرنا باقی تھی۔

ان ہی دنوں میں مبرم کا رزلٹ بھی آگیا تھا۔ اور مبرم نیازی صاحب نے ان سب کے حال پر رحم کرتے ہوئے پورے کالج میں ٹاپ کرکے چاچا جی کو بھی خوش کردیا تھا۔ اور وہ مبرم کا نکاح کرنے کے بعد اسے یو کے بھیجنا چاہتے تھے۔

ادھر مبرم نہ تو نکاح کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یو کے جانے کے لیے رضامند ہورہا تھا۔ اسے پاکستان میں ہی رہنا تھا اور یہ اس کی ضد نہیں، خواہش تھی۔

شگن کی رسم سے پہلے مبرم کی فون کالز آنا شروع ہوگئی تھیں اور ہر فون کال میں اس کا ایک ہی دھمکی نما پیغام تھا۔

"تم میرے ساتھ شادی سے انکار کردو، مجھے تم سے شادی نہیں کرنا۔ میں گوشی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس قسم کے فونز سن کر ویرا عجیب سی پریشانی میں گویا جکڑ کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گوشی کا دل کسی اور کے ساتھ منسوب ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مبرم کے دل میں گوشی کا ذرہ بھر خیال نہیں۔ وہ گوشی سے محبت نہیں کرتا۔ اس کے باوجود اسے مبرم کی طرف سے اس مطالبے نے گویا جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ یہ بات درست تھی کہ منگنی سے لے کر آج تک مبرم نے اس سے کوئی اظہار پسندیدگی نہیں کیا تھا، مگر وہ بخوبی سمجھتی تھی کہ مبرم محض اسے جلانے کلسانے کے لیے گوشی کے حوالے سے چھیڑتا ہے۔ شادی سے انکار کی وجہ تو اسے آج تک سمجھ نہیں آئی تھی، یہاں تک کہ شادی کا دن بھی قریب آگیا۔

جس دن شگن کا جوڑا اور دیگر سامان لے کر چاچا جی اور چاچی آئے تھے، یہ اسی شام کی بات ہے، مبرم نے عادتاً پھر فون کیا تھا۔ اور وہ اس کی طویل تقریر خاموشی سے سن رہی تھی۔

"میری ماں اور بہنیں گوشی کو بہت چاہتی ہیں اور میری شادی گوشی کے ساتھ کرنے کی خواہش مند ہیں۔ تمہیں بھلا میرے گھر آکے کیا ملے گا، نہ عزت، نہ محبت، اور تم صرف نام کی حد تک بیوی ہوگی۔ شادی تو میں گوشی سے کروں گا۔" مبرم خاموش ہوا تو وہ گویا پھٹ پڑی۔

"پلیز مبرم! اب اتنے جھوٹ مت بولو، تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے، نہ کرو، مگر گوشی کا بار بار نام کیوں لیتے ہو، میں جانتی ہوں تمہیں گوشی تو کیا کسی سے بھی محبت نہیں۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ وہ میرے دوست کی منگیتر ہے، مگر میں پھر بھی تم سے شادی نہیں کرسکتا، کبھی بھی نہیں۔"

نہ جانے کیوں مبرم کا لہجہ عجیب سے دکھ کے احساس کے بوجھل پن میں دب کر رہ گیا۔

"مجھے ریجیکٹ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ تو بتادو۔" ویرا گویا لمحہ بھر میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ خوابوں کی کرچیوں نے یکبارگی آنکھوں کو زخمی کردیا تھا اور نہ جانے کہاں کہاں سے خون رسنے لگا تھا۔ دل پر گویا عجیب سے سناٹوں نے قبضہ کرلیا۔

"یہ سوال بہت مشکل ہے ویرا! میں اس کا جواب نہیں دے پاؤں گا۔ ہوسکے تو مجھے بھول جانا۔" اس نے گویا درخواست پیش کی تھی، ویرا کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔

"سب جانتے ہو پھر بھی۔" اس نے اپنا ہر آنسو دل پر گرالیا تھا۔

"بعض فیصلے پل صراط کی طرح ہوتے ہیں اور پل صراط کو کسی نہ کسی طریقے سے عبور تو کرنا ہوتا ہے۔" مبرم کا لہجہ بھی چیخ رہا تھا۔

"تم جانتے ہو، صرف تین دن بعد ہماری شادی ہے، کارڈ بھی بٹ چکے ہیں مگر میں پاپا سے بات کرلوں گی۔ تم فکر مت کرنا، جب دل نہ ملیں تو کاغذ کے بندھن کا بھلا کیا فائدہ۔" وہ گویا فیصلہ کرچکی تھی۔

"کبھی کبھی دل بھی مل جاتے ہیں، مگر نصیب اور ستارے نہیں ملتے۔"

مبرم نے فون رکھ دیا تھا اور ویرا کے اعصاب پر گویا صدیوں کی تھکن سوار ہوگئی تھی اور وہ آج بھی مبرم کے رویے کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

بہت ہمتیں مجتمع کرکے اس نے پاپا سے بات کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔

یہ بہت کٹھن ترین اور دشوار مرحلہ تھا، مگر اس نے نوکیلے پتھروں والے راستے کا انتخاب کر ہی لیا تھا۔ پاپا جو اس کے فرض کی سبکدوشی کے خیال سے سرشار رہتے تھے۔ ویرا جانتی تھی، اس کا یہ سفاکانہ فیصلہ ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ اور وہ خود بھی تو اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی تھی۔

پاپا ہمیشہ کی طرح اسٹڈی روم میں بند تھے اور وہ اپنے کمرے میں۔ بہت کوششوں کے بعد وہ لرزتی ٹانگوں کا بوجھ بمشکل سہارے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ اسٹڈی روم تک کا راستہ کسی پہاڑ کو سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔

اس نے جوں ہی دروازے کے ہینڈل کو گھمانا چاہا تو اندر سے آتی آوازوں کو سن کر ٹھٹک گئی تھی۔

"کیا چاچا جی آئے ہوئے ہیں؟" اس نے اپنی بے خبری کو جی بھر کر کوسا تھا اور پھر اندر سے آتی کچھ غیر معمولی سی گفتگو کو سننے لگی۔

"بھائی جی! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" چاچا جی کا اسٹائل تمہید باندھنے جیسا تھا۔ ویرا اندر جانے کے بجائے وہیں رکی رہی۔

"کیوں نہیں عزیز! بولو۔" پاپا نے خوش دلی سے کہا۔ چاچا جی شاید کچھ لمحے سوچ میں ڈوبے رہے تھے۔ جب بولے تو ان کی آواز عجیب سرد سی تھی۔

"بھائی جی! پٹواری سے ایک بات پتا چلی ہے۔" چاچا جی بھی گویا تول تول کر بول رہے تھے۔

"کون سی بات؟" پاپا بھی شاید الجھ گئے تھے۔

"بات دراصل یہ ہے۔" چاچا جی نے گلا کھنکار کر کہنا شروع کیا۔ "مال پٹواری آج میری طرف آیا تھا۔ بس ایسے ہی باتوں باتوں میں اس نے آپ کے سرمائے اور وراثتی جائیداد کے بارے میں بات کرنا شروع کردی تھی۔ پٹواری کے کہنے کے مطابق آپ کے نام کوئی بھی جائیداد نہیں، حالانکہ میں اسے کئی مرتبہ جھٹلاتا رہا ہوں۔ آپ نے صرف اپنے حصے کی زمین بیچی تھی مگر وہ تین کروڑ کی مالیت کا پلاٹ اور یہ بنگلہ تو آپ کی ملکیت میں ہے نا۔ مگر پٹواری مان کے نہیں دے رہا تھا۔ میرا ذہن کافی الجھ گیا تھا۔ سوچا آپ سے بات کو کلیئر کرلوں۔"

"پٹواری ٹھیک کہہ رہا تھا عزیز! میرے نام کسی بھی قسم کی جائیداد نہیں ہے۔" پاپا نے شاید کوئی دھماکہ ہی تو کیا تھا۔ چاچا گویا ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ادھر ویرا نے بھی دروازے کو ذرا سا کھول دیا تھا۔ اب ان کی آوازیں ہی نہیں، چہرے بھی نظر آرہے تھے اور وہ چاچا کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ نسبتاً "بگڑتا" مٹتے نقوش والا چہرہ۔

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" چاچا ششدر رہ گئے تھے۔ "آپ کا وہ ساڑھے تین کروڑ والا پلاٹ۔"

"وہ پلاٹ میرے ایک کلائنٹ نے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں مجھے دیا تھا، بعد میں اس کا کسی اور سے جھگڑا بن گیا۔ کئی سال وہ پلاٹ میرے نام ہی رہا ہے۔ جب اس کا جھگڑا ختم ہوگیا تو میں نے دوبارہ قانونی طور پر اس کا پلاٹ واپس کردیا تھا۔ مجھے جائیدادوں اور جاگیرداروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور یہ تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو۔" پاپا اپنی سادگی میں چاچا جی کو دھیرے دھیرے میزائل گرا رہے تھے اور چاچا جی کی رنگت بالکل متغیر ہوچکی تھی۔

"اور یہ گھر....." انہوں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"یہ گھر بھی کرائے کا ہے۔" پاپا اپنے ازلی سادہ سے انداز میں بتارہے تھے۔

"آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔" چاچا جی کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا تھا۔

"اس میں ایڈورٹائزمنٹ کی بھلا کیا بات تھی۔" پاپا لاپروائی سے بولے۔

"تو کیا اتنے سال مفت مقدمے لڑتے رہے ہیں؟ ایسی پڑھائی اور علم کا بھلا کیا فائدہ، نہ کچھ جوڑا ہے نہ کچھ بنایا ہے۔" چاچا جی کا لہجہ بلا کی کاٹ لیے ہوئے تھا۔

"دنیا جمع کرنے کا خیال نہیں آیا۔ جو کچھ پاس ہوتا تھا بس اللہ کا نام لے کر حج کر آتا تھا۔ مولا کا کرم ہے۔ جو اس نے بار بار اپنے گھر میں بلوایا ہے مجھے۔"

"دنیا داری کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔" وہ جھنجھلاتے لہجے میں بولے۔

"تو ہم نے سارے ہی تقاضے پورے کیے ہیں۔"

"کیا کیا ہے بھلا؟" وہ تنک کر پوچھنے لگے۔ دھیرے دھیرے ان کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی اور ویرا کا دل سمٹ سمٹ جارہا تھا۔

"کیا کچھ نہیں کیا۔ اکلوتی بیٹی کی بہترین تربیت کی ہے۔ بہترین تعلیم دلوائی ہے۔ ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے، سوسائٹی میں نام ہے۔" پاپا بھی گویا برا مان کر بولے۔

"معاف کیجیے گا بھائی جی! سوسائٹی میں نام پیسے کی بدولت بنتا ہے۔"

"چھوڑو ان باتوں کو، بتاؤ چائے پیو گے؟" پاپا نے موضوع بدلنا چاہا۔

"یہ باتیں چھوڑنے والی نہیں۔" یکایک چاچا جی کا لہجہ اور بھی کھردرا ہوگیا۔ ادھر ویرا کا دل کسی انہونی کی طرف اشارہ کرنے لگا تھا۔

"آپ کو پتا ہے کہ ویرا کا رشتہ میں نے مبرم سے کیوں جوڑا تھا؟"

"نہیں۔" پاپا رکھائی سے بولے۔ انہیں چاچا جی کی گفتگو کے انداز غصہ دلا رہے تھے۔

"صرف اس لیے کہ گھر کی جائیداد باہر نہ جائے۔" چاچا جی نے اجنبی سے لہجے میں کہا۔ "مگر اب جبکہ جائیداد سرے سے ہے ہی نہیں تو میں اس رشتے کو ختم کررہا ہوں۔ میرے بیٹے کو رشتوں کی کمی نہیں۔ کئی صاحب جائیداد لڑکیاں منتظر بیٹھی ہیں۔ ایک تو میراں کی بھانجی گوشی ہے۔ پورے آٹھ ایکڑ رقبے کی مالک، اسّی لاکھ کی مالیت کی زمین ہے اس کی، میں مبرم کی شادی گوشی سے کررہا ہوں۔ آپ نے مجھے انجان رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ بتاتے کچھ ہیں اور دکھاتے کچھ ہیں۔" چاچا جی نے اپنے چہرے پر سے سارا نقاب ہٹا دیا تھا اور اب ان کے بدنما اور کریہہ چہرے کی طرف دیکھنا بہت مشکل تھا۔ ویرا کا دل ایک دم بھر آیا۔

"اوہ۔ تو میں اب سمجھا۔" پاپا نہ جانے کیسے اس شاک سے سنبھلے تھے۔ نامور وکیل ہونے کے باوجود انہوں نے دھوکہ کھایا بھی تو کس سے؟ "تم مبرم کی شادی کے ذریعے مفت کی دولت حاصل کرنا چاہتے تھے؟" وہ ان کی خود غرضی اور لالچ پر گہری چوٹ کرتے ہوئے بولے۔

"یہ ہی آج کل ہو رہا ہے بھائی جی! سب ہی کو ترقی کے لیے زینہ درکار ہوتا ہے۔" چاچا جی قطعاً شرمندہ نہیں تھے۔

"اور تم منافع سمیت رقم وصولنا چاہتے ہو' واہ' اچھی چال بازی ہے۔" پاپا کا لہجہ تلخ ترین تھا' چاچا جی اب اٹھ رہے تھے۔ پاپا بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"میں خود بھی اس رشتے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میری طرف سے جواب سمجھو۔" پاپا گویا ضبط اور صبر کی کڑی منزلوں سے گزر رہے تھے اور چاچا جی بغیر کسی پشیمانی کے سر اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔ رشتوں کی اس دراڑ نے ویرا کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ خود غرضی کی یہ نہ جانے کون سی قسم تھی؟

☼ ☼ ☼

"تم نے کچھ کہنا ہے؟" عزیز نیازی نے اپنے سامنے بیٹھے تذبذب کا شکار بیٹے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی ابو!" وہ سر جھکائے لفظ پکڑنے اور جملے جوڑنے کی کوشش میں تھا۔

"پہلے میری بات سن لو۔ پھر اپنی سنانا۔" وہ حساب کتاب کا کھاتہ کھولے بیٹھے تھے۔ نئی زمینیں خریدلی تھیں۔ وہ نفع' نقصان' آمدنی اور سرمایہ کاری کا حساب کر رہے تھے۔

"پہلے آپ میری بات سن لیں۔" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ عزیز نیازی نے گویا سر ہلا کر اجازت دے دی۔

"مجھے ویرا سے شادی نہیں کرنا۔" اس نے اپنی بات چند جملوں میں باپ تک پہنچا دی۔ عزیز نیازی نے ہنکار ابھر کر بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اتنی آسانی سے مان جائیں گے' مبرم کو یقین نہیں آیا۔

"آپ نے انکار کی وجہ نہیں پوچھی؟"

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔"

"مگر میں وجہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔" مبرم کی آواز میں ضدی پن کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' بتادو' مگر مختصر لفظوں میں۔" انہوں نے گویا پھر سے کمال مہربانی کر دی۔ مبرم نے کچھ دیر سوچنے میں وقت لیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

"آج سے صرف چند سال پہلے کی بات ہے ابو! یقیناً آپ کی یادداشت بھی کمزور نہیں ہوگی' آپ کو بھی سب یاد ہے' تو میں بھی جانتا ہوں۔

میں نیا نیا کالج گیا تھا۔ اس وقت ہاسٹل میں مجھے کمرا نہیں مل سکا۔ سو آپ مجھے پاپا جی کی طرف لے گئے تھے اور میں نے پورے تین ماہ تک ان کے گھر میں قیام کیا تھا۔ اس دوران ان کی اکلوتی بیٹی' ویرا نے میرا بے حد خیال رکھا تھا۔ وہ میری ایج کی تھی' مگر پڑھائی میں مجھ سے ایک سال آگے تھی۔ وہ بہت ذہین تھی' پراعتماد تھی' اسٹائلش تھی اور بلا کی سلیقہ مند بھی تھی۔ میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی کو ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور مجھے اس سے باتیں کرنا اور اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا اور میں اپنی فیلنگز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا اور یہی فیلنگز میں نے آپ سے ایک مرتبہ شیئر کر دی تھیں۔ بے تکلفی تو میرے اور آپ کے درمیان کبھی بھی نہیں رہی تھی' مگر پھر بھی میں اپنی خاندانی روایات کو جانتا تھا اور اسی وجہ سے میں نے آپ سے اس غیر مناسب عمر میں ایک مناسب سی بات کہی تھی۔

میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ پاپا جی سے ویرا کو میرے لیے مانگ لیں۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ ہمارے ہاں بچپن میں یا لڑکپن میں رشتے طے کر دیے جاتے ہیں۔ میں نے صرف پاپا جی تک بات پہنچانے کے لیے کہا تھا' مگر آپ نے ہنٹر پکڑ کر میری دھنائی کر دی۔ وہ مار مجھے آج تک نہیں بھولی اور میں نے اس وقت دل میں عہد کیا تھا کہ ویرا محمود الحسن نیازی اگر سونے کی بھی بن گئی تو پھر بھی آپ کے توسط سے طے کیا گیا میرا اور اس کا رشتہ مجھے کبھی قبول نہیں ہوگا۔ یہ میری ضد تھی' جس کی بھینٹ میں اپنے اولین خواب کو چڑھا دینا چاہتا تھا۔ ضد میں اور ہٹ دھرمی میں آپ کے برابر ہی تو میں کھڑا ہوں۔

اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ گوشی کے ساتھ میری شادی کریں گے' تاکہ اس کے حصے کی آٹھ ایکڑ زمین ہمیں مل جائے۔ تب میں آپ کی سوچ تک رسائی نہیں کر پایا تھا۔

پھر آپ نے میری ہر خواہش کو دھتکار نے پر گویا مہر لگا دی تھی۔ مجھے میری پسند کا شعبہ آپ نے منتخب نہیں کرنے دیا۔ نہ میں فوج میں جا سکا' نہ میں پائلٹ بن سکا اور نہ ہی ڈاکٹر۔

بس آپ کی ایک ضد نے میری خواہشات کو کانٹوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ وقت آگے بڑھتا رہا۔ دن گزرتے رہے اور آپ پر کچھ انکشافات ہوئے۔ آپ کو پتا چلا کہ پاپا جی ایک بہت اہم مقدمہ جیت گئے ہیں اور ان کے موکل نے تین کروڑ کی مالیت کا پلاٹ انہیں تحفے میں دیا ہے۔ یوں آپ نے ایک اور پلاننگ ترتیب دے لی اور کچھ وقت اور مزید انتظار کرنے کے بعد ویرا کو میرے لیے مانگ لیا۔ ویرا کے ساتھ ہمیں بہت کچھ مل جاتا تھا۔ شہر میں بہترین بنگلہ' بینک بیلنس اور شان دار قسم کا پلاٹ' یہ سودا گھاٹے کا نہیں تھا' مگر گھاٹا ہمارے نصیب میں لکھا تھا۔" وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر عزیز نیازی نے اسے غصے کے عالم میں ٹوک دیا۔

"تمہاری اس بکواس کا آخر مقصد کیا ہے؟" آئینہ دیکھنا آسان نہیں ہوتا اور جب اپنی ہی اولاد اٹھ کر آئینہ دکھانے لگ جائے تو یہ کام اور بھی مشکل ترین ہو جاتا ہے۔

"مقصد ہی تو بتانا چاہ رہا ہوں۔" مبرم کا لہجہ بھی تلخ ترین ہو گیا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ دفع ہو جاؤ!" وہ چنگھاڑ کر بولے۔ مبرم زہر خند کے ساتھ باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

اس وقت کمرے میں وہ باپ' بیٹا ہی نہیں' اماں بھی موجود تھیں' مگر ان تین افراد کی موجودگی کے باوجود کمرے میں بلا کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے اور طوفانی خاموشی کو ابو جی کی آواز نے توڑا۔

"جمعہ کی شام کو تمہارا نکاح گوشی کے ساتھ ہے۔" انہوں نے گویا دھماکہ کرنا چاہا۔

"لیکن مجھے یہ نکاح نہیں کرنا' میں شادی کروں گا تو صرف اسی کے ساتھ' جو میرے نام کی مہندی لگائے بیٹھی ہے' جس کے ساتھ میری بات طے ہے۔"

"مبرم!" وہ گویا پھنکارتے' دھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔ "ابھی خود میرے سامنے تم نے کہا تھا کہ ویرا سے تم شادی نہیں کرو گے۔"

"ہاں' کہا تھا۔ مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ پاپا جی کے ناتواں دل پر کون سا ستم ڈھا کر آئے ہیں اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ لالچ نے آپ کی آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مبرم نیازی آپ کا بیٹا ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ آپ علیم نیازی کے بھائی ہیں۔ میں جمعہ کی شام کو نکاح ضرور کروں گا' مگر گوشی کے ساتھ نہیں ویرا نیازی کے ساتھ اور یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔"

"مبرم! تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ تم میرے بیٹے ہو' مجھے جھکانا چاہتے ہو کیا؟ یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔ محمود الحسن نیازی کی بیٹی بیاہ کر اس گھر میں کبھی نہیں آئے گی۔" وہ برابر چلائے جا رہے تھے۔

"یہ آپ کے لالچ کی شکست ہوگی۔ آپ کی خود غرضی کی ہار ہوگی۔ آپ نے رشتوں کے معاملے میں جوا کھیلا تھا' مگر آپ اس جوئے میں ہار گئے ہیں۔" مبرم نے تنفر بھری نظر سے انہیں دیکھا تھا اور

وہ اسی ایک نظر کے تیر سے گھائل ہو گئے تھے۔

"مبرم! میرا بچہ' میری جان! یہ سب جھوٹ ہے۔ تجھے غلط فہمی لاحق ہوئی ہے۔" وہ ہکلا کر رہ گئے تھے۔ پے در پے ذلت کے تھپڑوں نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ خود کو نظر اٹھانے کے قابل نہیں سمجھ رہے تھے۔

"جھوٹ نہیں' یہ سچ ہے اور سچ اب ہی تو کھلا ہے۔" وہ سر سے پیر تک سلگ رہا تھا۔

"اور میں تمہارے سامنے اپنی سچائی ثابت کر کے رہوں گا۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

جذباتیت' غصہ اور بیٹے کی آنکھوں میں اتری نفرت نے ان کے حواس معطل کر دیے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مبرم کو کیسے حقیقت کا علم ہوا ہے اور بیٹے کی نظر سے گرنے کی ذلت سہارنا ان کے لیے بہت مشکل امر تھا۔ اس ذلت سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ موت کے علاوہ بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ وہ مبرم کو آوازیں دے رہے تھے مگر وہ کانوں کو گویا بند کیے راستے میں آئی ہر شے کو ٹھوکروں سے اڑاتا باہر نکل رہا تھا۔

"مبرم چلا گیا ہے۔" وہ گویا پتھرا کر رہ گئے تھے۔ غم اور غصہ انتہا پر پہنچ جائے تو انسانی دماغ پر مختلف کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔

وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کے عمل کا شکار تھے اور یہی چیز ان کی منفی سوچوں سے ٹکرا ٹکرا کر انہیں اور بھی مشتعل کر رہی تھی۔

"نہیں بھائی جی! ہمیشہ ساری خوشیاں آپ کے نصیب میں تو نہیں لکھی جا سکتیں..... پہلے وجیہہ کی صورت میں آپ کو خوشی مل گئی تھی اور اب مبرم پر قبضہ جما لو گے۔ اپنا بیٹا تو ہے نہیں۔ ہماری رعایا پر تسلط جمانے کے خواب مت دیکھو۔"

وہ منفی سوچوں کے زیر اثر بہت اندھیرے میں جا رہے تھے۔ جہاں سے روشنی کی ننھی سی کرن کا ملنا بھی بہت مشکل تھا۔

انہوں نے بہت کوشش کے بعد ایک چھوٹا سا پلان ترتیب دیا تھا۔ یہ پلان بہت چھوٹا سا معمولی سا ہی تو تھا ان کے نزدیک۔

پھر انہوں نے پیغام بھیج کر میراں بیگم اور گوشی کو بلوا لیا تھا۔ ان دو خواتین میں ایک تو ان کی شریک حیات تھیں۔ بے حد اطاعت گزار' خدمت میں ہمہ وقت مشغول رہنے والی۔

اور دوسری گوشی تھی۔ ان کی شریک حیات کی سگی بھانجی۔ تمام عمران کے احسانوں تلے دبی ہوئی۔ ڈری سہمی' خوف زدہ..... وہ جانتے تھے کہ ان کے ذرا سے دھمکانے پر وہ ایک ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولے گی اور انہیں کبھی بھی کم از کم اس کے زبان کھولنے کا خدشہ نہیں ہو گا۔

"جب میں بھائی جی کے گھر گیا تو گوشی میرے ساتھ تھی۔" انہوں نے پلاننگ کے مطابق ایک ایک جملے کو ترتیب دیا تھا۔ میراں بیگم قطعاً" حیران نہیں ہوئی تھیں۔ یہ سچ تھا کہ کل شام کو گوشی ان کے ساتھ ہی شہر سے واپس آئی تھی۔

وہ اپنے ماما جی کے گھر مامی کے اصرار پر خالہ سے اجازت لینے کے بعد ہی گئی تھی اور خالو نے ہی اسے شہر ماما جی کے گھر بھجوا لیا تھا۔ البتہ واپسی پر خالو جی ہی اسے لے کر آئے تھے۔ مگر ٹھٹھکا دینے والی بات تو یہ تھی کہ وہ کب ان کے ساتھ نیازی ہاؤس گئی تھی۔ اسے خالو جی کی دماغی حالت پر کچھ شک سا ہوا تھا اسی لیے وہ گھبرا گئی تھی۔

"تم میرے ساتھ بھائی جی کے گھر گئی تھیں نا؟" وہ ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرا رہے تھے۔

"نہیں تو..... میں کب گئی تھی؟" گوشی ہکلا کر رہ گئی۔

"جو یہ کہہ رہے ہیں' تم وہ ہی بولو۔" اب کے وہ بھڑک اٹھے تھے۔ خالہ نے اس کا ہاتھ دبا کر نرمی سے کہا۔ "چپ کر کے سر ہلاتی جاؤ۔ خوامخواہ بات کو طول دے کر فساد مچائیں گے۔" خالہ متوقع جھگڑے سے بچنے کی خاطر دھیرے سے بولی تھیں۔

"جی خالو جی! میں آپ کے ساتھ وہاں گئی تھی۔"



اس نے کپکپاتی آواز میں کہہ دیا۔

"ہوں۔" وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئے۔

"تم نے وہاں کیا کیا سنا؟" اب وہ براہ راست اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گوشی اور بھی گھبرا اٹھی۔

"پتا نہیں۔" ظاہر ہے جب وہ گئی نہیں تھی تو اس نے بھلا کیا سنا ہو گا۔

"میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گا۔ تم نے وہ ہی کچھ سنا ہو گا ٹھیک ہے نا۔" ان کے لہجے میں عجیب سی سفاکی تھی۔ گوشی کا دل خوف کے مارے سکڑنے لگا۔

"ج، جی۔"

"دیکھو بیٹی! تم ہماری بیٹی ہو نا۔" اب انہوں نے اپنا انداز بدل لیا تھا۔

"جی۔" وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

"اور بیٹیاں والدین کی عزت، ناموس کو بچانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہیں۔"

"جی۔" اس نے سر جھکا لیا تھا۔ خوف کے مارے بری حالت تھی۔

"بیٹی! یوں سمجھ لو بھرے بازار میں میرے سر سے دستار اتر گئی ہے اور میری دستار کسی اور کے نہیں میرے اپنے بیٹے کے قدموں میں رکھی ہے۔ میری عزت کو بچا لو، میرے جھکے سر کی طرف دیکھو۔ میں مبرم کی نظر سے گر گیا ہوں اور ذلت کا احساس مجھے مار رہا ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میراں بیگم اور گوشی گھبرا اٹھیں۔ بھلا یہ پتھر کا دل رکھنے والا انسان بھی رو سکتا ہے؟

"چوہدری جی! آخر بات کیا ہے؟" میراں بیگم کا دل پسیج کر رہ گیا۔

"بات کچھ یوں ہے کہ میں بھائی جی کے گھر گیا تھا اور انہوں نے مبرم اور ویرا کی شادی کے متعلق کچھ شرائط میرے سامنے رکھ دی ہیں۔" وہ بہت تول تول کر بول رہے تھے۔

"کیسی شرائط؟" میراں بیگم اور گوشی بھی چونک گئیں۔

"بھائی جی نے کہا ہے۔ وہ ویرا کی شادی اس صورت میں مبرم کے ساتھ کریں گے، جب میں اپنی ساری زمین، گھر بار ویرا کے نام کر دوں۔ پچاس تولے سونا لے کر آؤں۔ حق مہر میں کم از کم تیس لاکھ تک رقم لکھ کر دوں.... اور سب سے بڑی اور اہم بات کہ ثمرہ کا رشتہ اویس کے ساتھ طے کر دوں۔" انہوں نے گویا بیک وقت میراں بیگم اور گوشی کے حواس اڑا دیے تھے۔

"ثمرہ اور اویس کا رشتہ۔" گوشی کا دماغ ایک دم سائیں سائیں کرنے لگا۔ ایسے بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے دل کے نجانے کتنے ہی حصے ہو گئے تھے۔

"بھائی جی کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ اپنے جیتے جی ساری جائیداد بہو کے نام کر دیں۔ یعنی ہاتھ کاٹ کر اپنی بہو کے ہاتھ میں پکڑا دیں تاکہ وہ ہمیں کان سے پکڑ کر گھر سے چلتا کر دے۔" میراں بیگم شوہر کی ہمدردی میں فوراً جیٹھ اور اس کی بیٹی کے خلاف بولنے لگی تھیں۔

"ثمرہ اور اویس کا رشتہ بھی بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ادھر تو گوشی کی بات طے ہے۔" میراں بیگم کا اشتعال ایک دم اٹھ آیا۔ "ہمارے بچوں کی زندگیوں کے فیصلے کرنے والے وہ کون ہوتے ہیں۔"

"یہی تو میں انہیں سمجھانا چاہ رہا تھا مگر وہ میری ہر بات کا الٹا مطلب نکالتے رہے۔" ان کی نظریں گوشی کے رنگ بدلتے چہرے پر گویا جم کر رہ گئیں۔ لوہا گرم بھی تھا اور نرم بھی۔ سو مزید چوٹ لگانے کی دیر تھی۔

"میں نے صاف لفظوں میں انہیں بتا دیا تھا کہ گوشی بھی ہماری بیٹی ہے۔ ہم اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے۔ مگر بھائی جی نے رشتہ ختم کر دیا۔"

"ختم کر دیا.... یعنی کہ بات ختم ہو گئی۔" میراں بیگم کو گویا یقین ہی نہ آیا۔ "تو اسی لیے آپ مبرم اور گوشی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے۔" ان کی آواز اب بالکل دب کر رہ گئی تھی۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے تھے۔ آواز حلق میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھی۔

"اگر ایسا ہو جائے تو کچھ غلط بھی نہیں۔ گوشی، اویس کے بجائے اس گھر میں راج کرے گی۔ اچھا ہوا،

جو بات ختم ہو گئی ہے خود بخود۔" وہ خوشگوار سوچوں کے زیر اثر پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ گوشی کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا ہے۔

"گوشی کی شادی وہیں ہو گی جہاں اس کی بات طے کر دی ہے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر لفظوں سے کھیل رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مبرم اور گوشی کے نکاح کا دن بھی مقرر کر چکے تھے مگر بات اور لفظ بدلنا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اس وقت گوشی کے حق میں بات کر کے اس کا پورا تعاون اور ساتھ چاہتے تھے۔ ادھر گوشی کی گویا جان میں جان آئی۔ اس کے سر پر لٹکی تلوار کا رخ بدل گیا تھا۔

"مبرم کو میری کسی بھی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ اسے یقین دلانے کے لیے ایک گواہ اور ثبوت کا ہونا ضروری ہے اور میری سچائی کی گواہی بھلا کون دے گا؟" ان کے چہرے پر بکھرتی عمارت کے ترخ جانے والے آثار نظر آنے لگے تھے۔

"یہ گوشی ہے نا۔ کل یہ آپ کے ساتھ ہی تو شہر سے آئی ہے۔ یہ گواہی دے گی۔" میراں بیگم نے اس کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے بڑے مان سے کہا تھا۔ گوشی کے پیروں کے نیچے کی زمین لمحہ بھر کے لیے تھرتھرا کر رہ گئی۔

"میں.... مگر میں کیسے۔"

"دیکھو بیٹی! تمہیں ہماری عزت کو بچانا ہو گا۔ ورنہ بھائی جی جو کہیں گے، مبرم مانتا چلا جائے گا۔ اور اگر مبرم ہمیں چھوڑ گیا تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔" انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"مگر، خالو جی! اگر مبرم بھایا آپ کا یقین نہیں کر رہے تو پھر میرا یقین کیسے کریں گے۔" گوشی گھبرا کر بول اٹھی۔

"تمہارے خالو جی کون سا جھوٹ بول رہے ہیں۔ تم بھی ان کی بتائی گئی من و عن سچائی اس تک پہنچا دینا۔" میراں بیگم نے اس کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اور بھی الجھ گئی۔

"پر میں نے اپنے کان سے تو نہیں کچھ سنا.... بھایا مجھے جھوٹا کہیں گے۔"

"تمہیں جو کچھ میں کہوں گا، تم وہ ہی کرو گی.... ورنہ میں وہ کچھ کر دوں گا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں ہو گا۔" ان کی دھمکی میں پھنکار نمایاں تھی۔

"چوہدری جی! آپ غصہ نہ کریں۔ گوشی کی بھلا کیا مجال جو آپ کے حکم سے سرتابی کرنے کی کوشش کرے۔ جو آپ کہیں گے۔ یہ وہ ہی کچھ بولے گی۔" میراں بیگم کا انداز فیصلہ کن تھا۔ گوشی لمحہ بھر میں گویا پسینہ پسینہ ہو گئی۔ وہ چلے گئے تو گوشی نے روتے ہوئے خالہ سے کہا۔

"میں اتنا بڑا جھوٹ بولوں مگر کیسے؟ کیا یہ گناہ نہیں ہو گا۔"

"گناہ کیسا؟" وہ بھڑک اٹھیں چوہدری صاحب کون سا جھوٹ بول رہے ہیں۔ تم بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی جانا۔"

"مگر خالہ!" وہ کس کشمکش کے عذاب میں جکڑی جا رہی تھی۔

"کوئی اگر مگر نہیں.... جو کہہ رہے ہیں، کرتی جاؤ۔ جانتی تو ہو، چوہدری صاحب کے غصے کو۔ کچھ ایسا ویسا کر دیا تو تمام عمر روتی رہنا۔"

وہ دل ہی دل میں جیٹھ اور شوہر کے جھگڑے سے بہت خوش تھیں۔ ان کے خیال میں سانپ بھی مر چکا تھا اور لاٹھی بھی بچ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم میری ضد میں ہمیشہ الٹ جاتے ہو۔ عاشی سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی، نوید مرزا کی بیٹی سے تمہاری بات طے کر آیا ہوں۔ مبرم! بھائی جی کی بیٹی اب اس گھر میں نہیں آئے گی۔ ایک بات تو طے ہے۔" وہ باپ بیٹا بیٹھک میں موجود تھے اور ان کی بلند ہوتی آوازیں میراں بیگم کا دل دہلائے دے رہی تھیں۔

”اور میں بھی آپ کو صاف لفظوں میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔“

”تو پھر یہ کہو نا کہ تمہیں اپنے باپ پر یقین نہیں۔ تم یہی سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ بھائی جی نے مجھے ذلیل کر کے گھر سے نکالا۔ مجھے برا بھلا کہتے رہے۔ حتیٰ کہ شادی کے کارڈ تک میرے سامنے پھاڑ دیے اور سارے رشتہ داروں کو میرے سامنے فون کر کے شادی روک دینے کی وجہ بتانے لگے۔ ہر کوئی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں کس کس کو جواب دوں۔“

”اور میں حیران ہوں کہ پاپا جی اس قدر لالچی کیسے ہو گئے ہیں۔“ وہ سچ مچ الجھن کا شکار تھا۔

”ابھی تو میں تم سے بہت ساری باتیں چھپائے ہوئے ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھائی جی سے متنفر ہو جاؤ۔“ انہوں نے مبرم کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا۔

”تاہم تمہیں یقین دلانے کے لیے بتا رہا ہوں۔ بھائی جی نے تمہاری ماں کو گالی دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ میں مبرم کو کیسے اپنی بیٹی دے دوں۔ مجھے تو شک ہے۔ وہ تمہاری اولاد ہے بھی یا نہیں۔ تمہاری بیوی تو گھر سے بھاگ کر آئی تھی اور بھاگی ہوئی عورت پر بھلا کون یقین کرے۔“

مبرم کی رگوں میں دوڑتا خون ایک لمحہ کو ایک دم ابلنے لگا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئی تھیں اور پورے وجود میں گویا چنگاریاں سلگنے لگیں۔

”پاپا جی نے میری ماں کو گالی دی۔“ وہ پھر بھی بے یقین تھا۔ ”میں نہیں مان سکتا۔“ اس کا سر نفی میں ہلنے لگا۔

”ہاں‘ انہوں نے تم کو بھی گالی دی۔“ نجانے وہ اپنی سطح سے کس حد تک گر جانا چاہتے تھے۔ ”یقین نہیں آتا تو گوشی کو بلوا کر پوچھ لو۔“ انہوں نے ترپ کا آخری پتہ بھی پھینک دیا۔

”گوشی کو کیسے خبر؟“ اب کہ وہ سچ مچ چونکا۔

”گوشی بیٹی کے سامنے انہوں نے مجھے ذلیل کیا تھا اور میں سر ہی اٹھا نہ پایا۔ ایسی ذلالت سے موت اچھی‘ جب سگی اولاد کو یقین دلانے کے لیے حلف اٹھانا پڑے۔“ وہ ٹوٹے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

اسی دم دروازہ کھول کر میراں بیگم آ گئی تھیں۔ ان کے ساتھ تھر تھر کانپتی گوشی بھی تھی۔

”آؤ‘ بیٹی!..... ذرا بتاؤ‘ مبرم کو کون جھوٹا ہے؟ کون سچا ہے؟“

”خالو جی سچ کہہ رہے ہیں مبرم بھایا۔“ گوشی کے سر پر گویا تلوار لٹک رہی تھی اور وہ یہ دو جملے بول کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

”تم ابو کے ساتھ گئی تھیں وہاں۔“ وہ خون آلود نظروں سے گوشی کو گھور رہا تھا۔ گوشی بے چاری کا دل گویا لرز کر رہ گیا۔

”جی۔“ اس نے سر جھکائے رکھا تھا۔

”مگر میں پھر بھی یقین نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی کوئی بات نہیں مان سکتا اور میں وہی کروں گا جو میرا دل کہے گا۔“

وہ ایک سلگتی نگاہ ان سب پر ڈالتا باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ جبکہ عزیز نیازی اس پلان کی ناکامی پر بری طرح تاؤ کھا کر رہ گئے تھے۔ تاہم ہار انہوں نے پھر بھی تسلیم نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

پاپا دل کے مریض تو تھے ہی۔ بھائی کی طرف سے ملنے والے اس جھٹکے سے سنبھل نہیں پا رہے تھے۔ ویرا انہیں ہسپتال تو لے آئی تھی مگر اس کے ہاتھ سے امید کا دامن بار بار چھوٹ جاتا تھا۔ ڈاکٹرز نے صاف لفظوں میں ان کی نازک حالت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ کسی بہت بڑے صدمے کا اثر ہے جو ان کا دل اس کیفیت کے اثر سے نکل نہیں پا رہا۔

ویرا کی ساری دعائیں اور ڈاکٹرز کی ساری کوششیں ناکام جا رہی تھیں۔ پاپا کو ہوش نہیں آ رہا تھا اور یہ بے ہوشی ان کے لیے کس قدر خطرناک ہو سکتی تھی‘ ویرا اس بات سے بہت اچھی طرح سے آگاہ تھی۔

پچھلے دو دن سے وہ ہسپتال کے کوریڈور میں تنہا اور اکیلی بس دعا کا دامن پکڑے بیٹھی تھی۔

وہ مبرم کے پرسنل نمبر پر اسے فون کر کر کے تھک چکی تھی اور جب یہاں سے مایوس ہو گئی تو اس نے اویس کے گھر میں اطلاع کر دی۔

اس وقت بھی وہ نماز ظہر ادا کر کے پاپا کی صحت یابی کے لیے تسبیح پڑھ رہی تھی جب مبرم اور اویس دونوں ہی سامنے سے آتے نظر آئے۔ ویرا مبرم کو دیکھ کر گویا ضبط کی طنابیں چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ چیخ چیخ کر مبرم کو اس کے باپ کی سنگ دلی کا قصہ سنا دے۔

تب ہی ایک نرس نے اطلاع پہنچائی۔

”آپ کے پیشنٹ ہوش میں آ چکے ہیں۔ جلدی آیئے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”میرے پاپا!“ ویرا تڑپ کر اٹھی تھی۔ مبرم اور اویس بھی اس کے پیچھے اندر آ گئے تھے۔ پاپا کی طبیعت واقعی بہت نازک تھی اور ویرا کو روتا دیکھ وہ اور بھی گھبرا رہے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں میری جان! کیوں پریشان ہوتی ہو۔“ وہ بول نہیں سکتے تھے مگر بمشکل بولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ جان چکے تھے کہ ان کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

”مبرم! میرے بچے! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ گویا چار لفظوں کا بوجھ بھی سہار نہیں پائے تھے۔ ان کی سانسیں بری طرح سے الجھ گئی تھیں۔

”پاپا! پلیز آپ بولیے مت..... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ مبرم نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا نرم سا دباؤ ڈالا۔

”مبرم! آج تک کبھی نہیں سوچا کہ تم میرے بیٹے نہیں‘ ہمیشہ یہی لگا کہ میرا سب کچھ تم ہی ہو۔“ ان کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ رہے تھے۔

”پاپا.....“ ویرا نے تڑپ کر ان کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر آنسوؤں کو سمیٹا۔ وہ ویرا کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

”میرے بچے! میری ایک بات مان لو۔“ وہ مبرم کے سامنے التجا کر رہے تھے۔

”جی پاپا! بولیے۔“ مبرم ان کے دونوں ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

”مبرم! میں دنیا سے مطمئن ہو کر جانا چاہتا ہوں بیٹا! میری ویرا تنہا ہو گی۔ یہ بات مرنے کے بعد بھی چین نہیں لینے دے گی..... میں چاہتا ہوں تم ابھی ویرا سے نکاح کر لو۔“

”ابھی.....“ وہ کچھ فکر مند ہو گیا تھا۔ ”پاپا! آپ ٹھیک ہو جایئے۔ ابھی تو۔“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جب انہوں نے اسے روک دیا۔

”وقت بہت کم ہے بیٹا!“

”مگر پاپا! یہاں کیسے؟“ وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ اویس نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”سب ہو جائے گا۔ تم انکل کو تسلی دو۔ میں کچھ انتظامات کرتا ہوں۔“

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پاپا!“ ویرا کو بالآخر بولنا پڑا۔ وہ ابھی تک گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

”یہ طبیعت اب نہیں ٹھیک ہونے والی۔“ نجانے کیوں وہ اس قدر مایوس تھے۔

”اللہ بہتر کرے گا انکل! آپ مطمئن رہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔“ اویس سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی تھی۔ تب ہی تو وہ مبرم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”مگر اویس!“ وہ اسے روکنا چاہ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

وہ بہت بے چین تھے۔ ان کی بے چینی‘ اصرار اور گھبراہٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر ویرا ڈاکٹر کو بلا لائی تھی۔ مگر پاپا بس ایک ہی لفظ کی تکرار کیے جا رہے تھے۔

”مجھے گھر لے چلو۔“

”آپ ان کی بات مان لیں۔“ ڈاکٹر پاپا کا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد بولا۔ ویرا ڈاکٹر کی بات سن کر پریشان ہو اٹھی۔

"مگر ڈاکٹر! ان کی کنڈیشن ٹھیک نہیں۔"

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" ڈاکٹر کچھ مبہم سے انداز میں بولا۔ "ابھی آپ کے ساتھ ایک نرس جائے گی۔ اگر ضرورت پیش آئی تو انہیں ہسپتال لے آئیے گا۔"

پاپا کی ضد' اصرار اور التجاؤں کے پیش نظر وہ انہیں گھر لے آئے تھے۔ ایک ڈاکٹر اور نرس ساتھ آئے تھے۔

ساری مشینوں کو وہ اچھی طرح سے سیٹ کر کے ہی گئے تھے۔ پاپا کی طبیعت گھر آنے کے بعد پہلے سے کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ ہسپتال کے کمرے' بیڈ اور اردگرد کے ماحول سے گھبرا گئے تھے۔ سو اس وقت وہ حیرت انگیز طور پر بہتر نظر آ رہے تھے اور ویرا اور مبرم کے نکاح میں شرکت کے لیے "فردا" فردا" اپنے سارے دوستوں کو فون کر کے بلوا رہے تھے۔ اویس نے بہت تھوڑے وقت میں مناسب انتظام کر لیا تھا۔

نکاح کے بعد جب مہمان رخصت ہو گئے تو وہ انہیں دعائیں دے کر اپنے کمرے میں گئے تھے ایک میل نرس کو ان کے ساتھ ہی کمرے میں رہنا تھا۔

اس وقت وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ اویس اپنے امی' ابو کو گھر چھوڑنے کے لیے گیا تھا۔ ویرا کو اردگرد بکھرے پھیلاوے سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ گلاس' پلیٹیں' چمچے سب میز پر بکھرے پڑے تھے۔ اویس مہمانوں کے لیے ہوٹل سے کھانا لایا تھا۔

سب سے پہلے اس نے صفائی ستھرائی کے لیے کمر کس لی تھی۔ لاؤنج اور ہال اچھی طرح سے صاف کرنے کے بعد اس نے ساری بکھری چیزیں ٹھکانے پر رکھیں۔ پھر کچن میں آ گئی۔ مبرم شاید پاپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد مبرم بھی کچن میں آ گیا۔

"کچھ ہیلپ کروا دوں؟" نکاح کے بعد مبرم کے رویے' لہجے اور انداز میں محسوس کی جانے والی تبدیلی در آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی تھی اور اس کے لبوں پر مسکان سج گئی تھی۔

"کیا ہیلپ کروانا چاہتے ہو؟" ویرا نے بغیر مڑے پوچھا۔ وہ سنک میں برتن جمع کیے دھونے میں مصروف تھی۔

"کچھ بھی....." وہ اس کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس کی گرم سانسیں اس کے گالوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ویرا کے بہت قریب کھڑا تھا۔ یوں کہ اگر وہ ذرا سا پلٹ کر اسے دیکھتی تو مبرم سے ٹکرا جاتی۔

"مبرم!" عجیب سی شرم نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"ہوں....." وہ اس کے رخسار پر جھک کر دھیرے سے بولا "کیا ہے؟"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو اپنے کمرے میں جاؤ؟"

"اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔" مبرم ایک سُرور بھری کیفیت میں بول رہا تھا۔ ایک عجیب سا نشہ اس پر طاری تھا۔ ویرا کے چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔

"کون سی محبت؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ "وہ ہی جو تم پچھلے دو سال سے طعنوں میں لپیٹ لپیٹ کر مار رہے تھے۔"

"وہ محبت ہی تو تھی۔" اس نے ایک بھرپور سی شرارت کر دی۔ "تم میرے دل میں چھپی محبت کو جانتی کہاں ہو۔"

"تم نے کبھی بتایا جو نہیں پھر میں کیسے جان سکتی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اور تم نے کبھی دو گھڑی ٹھہر کر سنا بھی تو نہیں۔" اس کے پاس بھی شکوے بے شمار تھے۔ "ہر وقت استانی بنی رہتی تھیں۔ پڑھانے کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا تمہیں۔"

"میری محنتوں کی بدولت تم پوزیشن ہولڈر بنے ہو ورنہ تو ہر دفعہ گول انڈا ہی پرائز میں ملتا تھا تمہیں۔"

"اپنی ان محنتوں کا صلہ چاہو گی؟" وہ ذرا سا اور جھک کر پوچھ رہا تھا۔ ٹونٹی کھلی تھی اور ویرا کے ہاتھ جھاگ سے بھرے تھے۔

"کیا دینا چاہتے ہو؟" اس نے جھاگ کو دونوں ہاتھوں سے مسلا اور پھر ہاتھ ٹونٹی کے نیچے کر دیے۔

"جو تم مانگو۔"

"بغیر مانگے کیا دو گے؟" وہ ہتھیلی پھیلائے کھڑی تھی۔

"صرف محبت۔" وہ اس کی سماعتوں میں امرت اتار رہا تھا۔

"اور مجھے صرف محبت ہی چاہیے۔ چلو پھر ایک معاہدہ کرو۔"

"بھلا کیا معاہدہ؟" مبرم نے اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔

"محبت سے کبھی بدگمان نہیں ہو گے۔"

"منظور ہے۔" مبرم نے اپنا سر ہولے سے اس کے سر سے ٹکرایا۔ "ویسے تم جانتی تو ہو۔ بدگمان میں صرف ایک بندے کے علاوہ کسی اور سے نہیں ہوتا۔" اس کا اشارہ اپنے باپ کی طرف تھا۔

"مجھے کچھ بتانا ہے تمہیں۔" ویرا کو ایک دم بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ پاپا کی صحت بگڑنے کی سب سے بڑی اور تکلیف دہ وجہ وہ اسے چاچو کے رویے کے اجنبی پن کے بارے میں تفصیل سے بتانا چاہتی تھی۔

"آج صرف میری سن لو۔" وہ دیا التجا کر رہا تھا۔

"چلو سناؤ۔" ویرا نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا۔

"پتا ہے ایک لڑکا تھا بہت اکھڑ اکھڑ سا... انا اس کی ناک پر دھری رہتی تھی۔ انکار سننا اسے گوارا نہیں تھا اور محبت کرنے کا اسے سلیقہ نہیں آتا تھا۔

بس ایک شام وہ اپنے باپ کے ساتھ شہر چلا آیا۔ اس اکھڑ اکھڑ لڑکے کو ایسی ٹھوکر لگی کہ ابھی تک زخم تازہ ہے۔ جانتی ہو ویرا! پہلی محبت ایک زخم کی طرح ہوتی ہے۔ یہ ایسا زخم ہوتا ہے جو نہ سلتا ہے نہ مٹتا ہے۔

اس لڑکے کو بھی محبت ہو گئی تھی۔ بڑی ہی نامناسب سی عمر میں اور جب اس نے اپنے باپ سے اظہار کر دیا تو اس لڑکے کا باپ غصہ سے بھڑک اٹھا اور پھر ہاتھ میں ہنٹر پکڑے اسے مارتا رہا۔ مارتا رہا یہاں تک کہ اس لڑکے کو محبت کی اس حماقت پر غصہ آگیا اور اس غصہ نے اس کو ضد دلا دی۔ اس لڑکے نے خود سے قسم کھائی کہ وہ اس لڑکی کو کبھی نہیں اپنائے گا اور پھر بار بار وہ اپنی محبت کو جھٹلاتا رہا تھا مگر جیت آخر کس کی ہوئی؟" وہ ویرا کی روشن آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"محبت کی۔" ویرا گویا سراپا آسودگی کی لہر میں نہا گئی۔

"کیا مجھے اپنے گزشتہ رویے کے لیے سوری کرنا پڑے گا؟" اب وہ بلا کی معصومیت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

"سوری بھلا کیسے کرو گے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ایسے۔" مبرم نے اس کے رخسار پر مہر محبت ثبت کی "اور پھر ایسے" اور ہمیشہ ہی ایسے۔" وہ تو رفتار ہی پکڑ چکا تھا۔ ویرا شرم سے جھینپ گئی تھی۔

"بس کرو نا۔" وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیل رہی تھی۔

"ابھی اس لڑکے کی کہانی ختم تو نہیں ہوئی۔" مبرم کھل کر مسکرا دیا۔

"جانتی ہوں میں اس لڑکے کی ساری کہانی کو ضد انا اور ہٹ دھرمی کے باعث اپنا نقصان کرنے سے بھی باز نہیں آیا... ویسے ایک بات تو ٹھیک ہوئی۔ چاچو جی اگر رشتہ ختم کر کے نہ جاتے تو تم نے کہاں آج میرے ہاتھ آنا تھا۔" اس کا انداز بھرپور شرارت لیے ہوئے تھا۔

"تو کیا ابو رشتہ ختم کر کے یہاں سے گئے تھے؟" مبرم کچھ چونک گیا۔

"یہی بات تو بتانا چاہ رہی تھی مگر تم سنتے کہاں ہو۔" ویرا نے ناراضی سے کہا تھا پھر من و عن تمام قصہ سنا دیا۔ مبرم خاموشی سے سنتا رہا تھا، پھر جب بات ختم ہو گئی تو وہ دھیرے سے بولا تھا۔

"کیا تم میری خاطر ابو کو معاف کر سکتی ہو۔"

"ان کی وجہ سے پاپا کا دل دکھا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ چاچو جی نے لالچ کی انتہا کر دی۔ کوئی اس طرح بھی کرتا ہے۔" ویرا کی پلکیں نم ہو گئیں۔

"ابو نے جو کیا غلط کیا۔ میں مانتا ہوں۔ مگر وہ پھر بھی ہمارے بڑے ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں ایسے سخت الفاظ نہیں بولنے چاہئیں۔" حالانکہ ابو نے اسے پاپا اور ویرا سے متنفر کرنے کے لیے بہت سے جھوٹ سنائے تھے مگر وہ پھر بھی ابو کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں سن سکتا تھا۔

"اور وہ تو جیسے تمہارے اس گناہ کو معاف کر دیں گے۔" ویرا نے سچ ہی تو کہا تھا۔

"کرنا تو پڑے گا۔ آفٹر آل میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ویسے جس طرح جانوروں سے بھی بدتر میرے ساتھ ابو رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ لگتا تو نہیں میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔" اس کے انداز میں بھرپور شرارت بھی تھی۔

"شاید اس لیے کہ تم بگڑ نہ جاؤ۔ لاڈوں اور نخروں میں تمہارا ستیاناس نہ ہو جائے۔ ویسے نخرے باز تو تم اب بھی بہت ہو۔"

"ظاہر ہے نخرے اٹھانے والے بھی تو بہت ہیں۔" وہ ایک دفعہ پھر اسے بازوؤں کے حصار میں لے چکا تھا۔

"مجھ سے ایسی امید مت رکھنا۔" اس کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔

"نخرے ہی تو اٹھاتی ہو تم ورنہ کب کا میں کسی ہاسٹل میں جا چکا ہوتا۔ تمہارے لاڈ اٹھانے کے انداز مجھے بہت بھاتے ہیں۔" وہ اس کے بالوں سے اٹھتی بھینی بھینی مہک نتھنوں کے راستے محسوس کر رہا تھا۔ دل میں اتار رہا تھا۔

"کچھ کام کرنے دو گے کیا؟" اس کے لاڈ کچھ طویل ہو رہے تھے۔ تب ہی ویرا کو گزرتے وقت کا احساس ہونے لگا۔

"نہیں۔" مبرم نے جھک کر گستاخی کی۔

"پیچھے ہٹو۔" وہ چیخی۔

"اب پیچھے ہٹنا مشکل ہے۔" مبرم نے ڈائیلاگ بھاڑا۔

"میں دھکا بھی دے سکتی ہوں۔" وہ اپنے تئیں اسے دھمکا رہی تھی۔

"آج ہماری شب عروسی ہے اور تم برتن مانجھ رہی ہو۔"

"یہ انوکھی شب عروسی ہے اس لیے۔" وہ پھر سے برتن دھونے لگی۔ مبرم دل مسوس کر رہ گیا تھا۔

"یہ نہ تھی ہماری قسمت۔" وہ ٹیبل بجا بجا کر اس کا ناک میں دم کیے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ویرا نے تمام برتن سنک میں جھونکے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی اور مبرم کے دل کی مراد بر آئی۔



"کیا ہمیں ہنی مون پر جانا چاہیے؟" وہ بیڈ پر اس کے برابر لیٹا ہوا پوچھ رہا تھا۔ ویرا کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھی۔ رات کو کچھ نہ کچھ پڑھ کر سونا اس کی عادت میں شامل تھا۔

"یہ اتنی موٹی کتاب کیسے پڑھ لیتی ہو؟" وہ فی الفور موضوع سے ہٹ کر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"جیسے تم ٹی وی دیکھ لیتے ہو۔"

"اچھا! اسے اب بند کرو۔ میں تم سے کچھ بات کر رہا ہوں۔"

"صرف چند ایک صفحات رہ گئے ہیں۔ اگر درمیان میں چھوڑ دیا تو مزا کرکرا ہو جائے گا۔" اس نے التجائیہ کہا تھا۔

"ان کتابوں کو چاٹنے سے بھلا کیا فائدہ۔" وہ ہر صورت اس کے ہاتھ سے کتاب رکھوانا چاہتا تھا۔

"یہ ایک سفرنامہ ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے نجانے کس کس ملک کی سیر ہو جاتی ہے۔" ویرا نے اسے کتاب پڑھنے کے فوائد بتانے چاہے۔

"گھر بیٹھ کر سیر کرنے سے کیا حاصل چلو کہیں تفریح کے لیے چلتے ہیں۔" مبرم سنجیدہ تھا۔

"پاپا کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔" ویرا بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ہم کون سا پیرس جا رہے ہیں۔ اپنے ملک کی تو بات ہے۔ ناردرن ایریاز سے ہو کر آجائیں گے۔"

"مگر گھر سے تو دور رہیں گے نا۔ کم از کم ہفتہ بھر تو لگ جائے گا۔" ویرا کا انداز پر سوچ قسم کا تھا۔

"میں پاپا سے بات کروں؟"
"کس قدر بے چینی ہے، تمہیں لور لور پھرنے کی۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے جاب لگے ہوئے اور محترم چھٹی کی پلاننگ بنا رہے ہیں۔" ویرا نے اسے بری طرح ڈپٹا۔
"جاب کون سا ڈپٹی کمشنر کی ہے۔ اس فضول سی سیٹ کے لیے میں ہنی مون کی قربانی نہیں دے سکتا۔"
"کفران نعمت نہیں کرتے۔ کبھی اس سے اچھی جاب بھی مل جائے گی۔ تم اگر مقابلے کا امتحان پاس کر لو گے تو۔" ویرا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"تو پھر پروگرام ڈن سمجھوں؟"
"بالکل نہیں۔" اس نے سختی سے انکار کر دیا۔
"پلیز ویرا صرف تین دن کی تو بات ہے۔" وہ ہفتے بھر سے تین دن پر آگیا تھا۔
"تین دن بھی گھر سے باہر رہنا مشکل ہے۔ میں پاپا کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"
پاپا کو اس حالت میں تنہا چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔
"تم بھی نا..... بس دل توڑتی رہا کرو۔ میں تم سے خفا ہوں۔" مبرم برا مان گیا۔
"میں تمہیں منا لوں گی۔"
"تو پھر مناؤ۔" وہ مزے سے بولا۔
"صبح دیکھا جائے گا۔" اس نے جان بوجھ کر سستی دکھائی۔ مبرم نے اس کا بازو کھینچ کر سیدھا کیا۔ "ابھی مناؤ۔"
"ابھی موڈ نہیں۔" وہ اسے تپا رہی تھی تاکہ وہ رات بھر روٹھا ہی رہے۔ ایسا ہونا اگرچہ ناممکن تھا۔
"اور میں ناراض بھی نہیں۔" مبرم بھی اس کی ہر نبض سے واقف تھا۔
"اور تم کم از کم رات کے وقت استانی مت بنا کرو۔" مبرم نے بھی ناک چڑھا کر ڈپٹا۔ "اب اس رقیب کو ایک طرف رکھ دو۔" وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ اور ساتھ ہی ویرا کے ہاتھ سے کتاب جھپٹ لی تھی۔
"تھوڑی دیر کے لیے دے دو پلیز۔"
"ہرگز بھی نہیں۔ چلو اب سوتے ہیں۔"
"مگر۔"
وہ اس کے کان میں سرگوشیانہ کچھ بولا تھا اور پھر خود ہی بتی بھی بجھا دی۔

✡ ✡ ✡

"کیا بات ہے بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پاپا نے کوئی تیسری مرتبہ یہی سوال دہرایا تھا۔ وہ بھلا پاپا کو اس بات کا کیا جواب دیتی۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک تھی مگر دل ٹھیک نہیں تھا۔ بے حد گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ مبرم صبح اس سے خفا ہو کر دفتر گیا تھا اور مبرم کی خفگی کا خیال اسے سخت بے چینی میں مبتلا کر چکا تھا۔ پورا دن اس سے کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہوا اور جب مبرم کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو اس کا ضبط بھی جواب دے گیا تھا۔ اس نے جھٹ سے موبائل اٹھایا اور باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر آ کے بیٹھ گئی۔
"کہاں ہو؟" ویرا نے مبرم کے نمبر پر میسج سینڈ کیا تھا۔
"تمہارے دل میں۔" اس کا جواب "فوراً" آیا تھا۔ جناب بھی شاید سیل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔
"دل میں تو ہو..... اور یہاں سے کہیں اور جانے بھی نہیں دوں گی۔ اس وقت بتاؤ کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟"
"ابھی ایک گھنٹہ آف میں باقی ہے۔" مبرم نے گویا جتا دیا تھا۔
"مگر تم تو دو گھنٹے پہلے ہی آجاتے ہو۔"
"آج بدنصیبی سے میرا گھونچو باس بھی گھر نہیں جا رہا۔ لگتا ہے بیوی سے ناراض ہو کر آیا ہے۔" ایک اور میسج "فوراً" ہی آیا۔
"اور تم بھی تو ناراض ہو کر گئے ہو بیوی سے۔" ویرا مطلب کی بات پر آگئی۔
"میں اپنی بیوی سے ناراض نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا۔" ویرا گویا کھل اٹھی۔ "بھلا کیوں؟" اس نے "فوراً" میسج لکھا۔
"بیوی ناراض ہو تو فریج کو لاک لگا دیتی ہے۔ ناشتے میں صرف لسی ملتی ہے اور ڈنر میں ابلے چاول اور دال۔ ایسی صورت حال میں بھلا بیوی سے ناراض ہوا جا سکتا ہے۔ جبکہ آپ کا والٹ بھی خالی ہو۔" مبرم نے اسے سر تا پا جلا کر رکھ دیا۔
"بہت کمینے ہو تم۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔
"وہ تو میں ہوں۔" وہ کہاں چوکتا تھا۔
"اللہ کرے آج تمہارا باس گھر ہی نہ جائے اور نہ ہی تم لوگوں کو جانے دے۔ دفتر میں بیٹھے سڑتے رہنا۔" وہ بددعاؤں پر اتر آئی تھی۔ پھر تڑپ کر پوچھنے لگی۔ "بتاؤ نا گھر کب آؤ گے؟" اس کی نظریں کلاک پر [illegible] ہیں۔
"دال چاول کھلاؤ گی۔ پھر تو نہیں آؤں گا۔"
"اس ڈش کے علاوہ بہت کچھ ہے۔"
"تو پھر میں اڑتے ہوئے آیا۔" اس کا ایک اور میسج آیا۔
"آرام سے انسانوں کی طرح آنا..... اڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کر کیا رہے تھے؟" جواب میں دیر نہیں ہو رہی تھی۔ اسی حساب سے اس نے پوچھا تھا۔
"دعا کر رہا تھا۔ یہ باس گھونچو جلدی اٹھے تاکہ میں بھی دوڑ لگا دوں۔"
"موبائل ہاتھ میں پکڑ کر کیا کر رہے تھے؟" ایک اور سوال۔
"گھر آکر بتاؤں گا۔"
"مگر ابھی کیوں نہیں۔" وہ شکی ہوئی۔
"تمہیں کال کرنے لگا تھا۔"
"کیا سچ۔" وہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔ "تم روٹھا نہ کرو، مجھے منانا نہیں آتا۔"
"تمہیں منانا نہیں آتا اور مجھے روٹھنا بھی نہیں آتا۔" اس دفعہ میسج نہیں آیا تھا، بلکہ وہ خود دبے پاؤں گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا اور عین اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ویرا نے موبائل اسکرین سے نظر ہٹا کر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔
اور جب فریش ہو کر واپس آیا تو ویرا کھانا لگا چکی تھی۔ اپنی پسند کا مینیو دیکھ کر مبرم کا دل خوش ہو گیا۔
"پاپا کہاں ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"ڈرائنگ روم میں..... وکیل انکل آئے ہیں۔"
"اوہ..... تو کیا انہوں نے کھانا کھا لیا ہے؟"
"وکیل انکل بغیر کھانا کھائے اتنی دیر بیٹھ سکتے ہیں۔" ویرا اس کی پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی۔
"ویسے ایک بات میں اکثر سوچتی ہوں مبرم!" ویرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔
"ایسی کیا بات ہے؟" مبرم بھی چونکا۔
"بات کچھ یوں ہے کہ کبھی کبھی چاچو جی کے تلخ ترین رویے کے باوجود بھی ان پر کچھ ٹوٹ کے پیار آجاتا ہے اور دل چاہتا ہے، ان کی ساری کڑوی کسیلی باتوں کو بھول جاؤں۔" وہ فروٹ سلاد کھاتے ہوئے مزے سے بولی۔
"اچھا..... " وہ حیران ہوا۔ "ایسا کون سا کارنامہ چاچو جی نے سر انجام دیا ہے؟"
"میرا اور تمہارا رشتہ توڑ کر انہوں نے بہت اچھا کیا۔ ان ہی کی ضد میں تو آج تم میرے فرماں بردار شوہر بنے ہو۔ ورنہ تو دھمکیاں دے دے کر میرا ناک میں دم کر دیتے تھے کہ کسی طریقے سے میں خود ہی پاپا کے سامنے انکار کر دوں۔"
"اور تم نے کون سا میری بات مانی تھی۔" مبرم بھی کچھ گزری باتوں کو سوچ کر مسکرا دیا۔
"اور اگر میں بھی ضد میں آجاتی؟"
"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا جو محبت کرتے ہیں، وہ انا کی دیواریں نہیں اٹھاتے۔"
"تو پھر تم کیوں اٹھا لیتے ہو، محبت میں انا اور ضد کی دیوار کو؟"
"کیونکہ ضد دلانے والے ذہن کو منتشر کر دیتے ہیں۔" وہ خالی گلاس کی طرف اشارہ کر رہا تھا تاکہ ویرا گلاس میں پانی ڈال دے۔
"تم نے چاچا جی سے ابھی تک ناراضی ختم نہیں

کی۔ حالانکہ وہ والی بات تو خاصی پرانی ہو گئی ہے۔" ویرا فریج میں سے ٹھنڈی بوتل نکال لائی۔

"میں ان سے ناراضی ختم نہیں کر سکتا۔ انہوں نے ہمیشہ میرے ہر شوق اور تمنا کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کی ہے۔ مجھے فوج میں کمیشن مل سکتا تھا مگر ان کی ہٹ دھرمی کے باعث میرا خواب ٹوٹ گیا اور اگر وہ لالچ میں آکر میرا اور تمہارا رشتہ ختم نہ کرتے۔ تمہیں ہی بہو بنانے پر بضد رہتے تو اللہ کی قسم میں نے ان کی ضد کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی محبت کو قربان کر دینا تھا۔" اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"جہاں تک بھی بھاگتے...... آنا تو ہماری طرف ہی تھا نا...... تمہارے ہر راستے' ہر موڑ پر ویرا نیازی ہی تو کھڑی تھی۔"

"اس میں تو شک نہیں۔" مبرم نے تسلیم کر لیا۔ اسی پل وکیل انکل اور پاپا بھی آگئے تھے۔ ویرا ان کے لیے چائے بنانے اٹھ گئی تھی جبکہ مبرم اویس سے ملاقات کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ دن میں ایک دفعہ یہ دونوں اگر ایک دوسرے سے نہ ملتے تو رات گزارنا ان کے لیے حد درجہ مشکل تھا۔ پھر موبائل چیٹ شروع ہو جاتی تھی جو ویرا کو سخت ناپسند تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے بہت سارے دن ویرا کے مصروفیت میں گزر گئے تھے۔ کالج سے تو اس نے ریزائن کر دیا تھا۔ تاہم پاپا کی تیمارداری میں اور ان کی عیادت کے سلسلے میں آنے والے مہمانوں کی وجہ سے بہت سے کام جمع ہو گئے تھے۔ خصوصاً" کپڑوں کا ایک ڈھیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ اوپر سے مبرم دھلے ہوئے کپڑوں کا بھی ایک ڈھیر اٹھا لایا۔

"ویرا! ان کپڑوں کو کلف کیوں نہیں لگائی۔"

"مجھ سے نہیں کلف لگائی جاتی۔ پھر کپڑوں کی استری مشکل ہو جاتی ہے۔" وہ مشین میں پائپ لگا کر پانی ڈال رہی تھی۔

"میں کلف لگے کپڑے پہننا پسند کرتا ہوں۔ یہ ایسے جر مرے سے مجھے نہیں پسند۔"

"گاؤں لے جاؤ۔ گوشی سے کلف لگوا لینا۔" وہ صاف صاف کپڑے اٹھا کر مشین میں ڈالنے لگی۔

"پلیز ویرا جی! کر دیں نا۔" اب وہ منتوں پر اتر آیا۔ اس کے مزاج کی تبدیلیاں ویرا کو اکثر حیران کر دیتی تھیں۔ کہاں تو وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ذرا سا کوئی اس کی بات سے اختلاف کر دیتا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا۔ اور اب اپنے چھوٹے سے ذاتی کام کے لیے کیسے چہرے پر مسکینیت طاری کر رکھی تھی۔

"مبرم! دیکھ نہیں رہے۔ میں کام کر رہی ہوں اور تم یہ گٹھڑ اٹھا کر لے آئے ہو۔"

"میں ابھی کیا پہنوں گا؟"

"تم نے کسی کا ولیمہ اٹینڈ کرنا ہے۔ رکھ دو' استری اسٹینڈ کے اوپر اس کام سے فارغ ہو لوں گی کر دوں گی۔" ویرا نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"او تھینک یو ویری مچ' میری جان!" وہ فرط مسرت سے آگے بڑھا۔

"پلیز مبرم! کام کرنے دو مجھے۔ سوا نیزے پر سورج پہنچ رہا ہے۔" ویرا اس کی بڑھتی پیش قدمی کو دیکھ کر چڑ کر بولی۔

"میرے رومانٹک موڈ کا ستیاناس مار دیا کرو۔" وہ دل مسوس کر رہ گیا۔

"ہونہہ۔ میں تو بھر آئی تمہارے اس رومانٹک موڈ سے جو کہ دن دیکھتا ہے نہ رات۔" ویرا نے تپ کر کہا۔

"میں کالج جا رہا ہوں' ذرا آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے۔ تمہاری سڑی ہوئی صورت دیکھ کر آنکھوں میں ریت چبھنے لگی ہے۔" وہ بھی حساب برابر کرتا اسے جان بوجھ کر چڑاتا' کپڑوں کا ڈھیر پھلانگ کر سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ ویرا اسے پکارتی ہی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دن گرمی میں بہت ہی شدت تھی۔ ویرا صبح صبح پاپا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ تب مبرم سو رہا تھا۔ سو ویرا نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ جب وہ پاپا کا چیک اپ کروا کر واپس آئی تو پورچ میں کھڑی چاچو جی کی گاڑی دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"کون آسکتا ہے؟" اتنا تو اسے یقین تھا کہ چاچو جی کم از کم اب یہاں نہیں آسکتے' مگر لاؤنج میں آکر اسے جھٹکا لگا تھا۔ سامنے صوفے پر چاچو اور چاچی بیٹھے تھے۔ بہت رنجیدہ بھی اور شرمندہ بھی۔

"بھائی جی! مجھے معاف کر دیں۔" پاپا کو دیکھتے ساتھ ہی چاچو اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور پاپا سے گلے لگ کر رونے لگے۔

"مجھے معاف کر دیں بھائی جی! میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ میں غلط تھا۔ کس قدر سطحی اور گھٹیا حرکت کی ہے میں نے۔ خود سے بھی نظر نہیں ملا سکتا۔ مجھے معاف کر دیں بھائی جی! میرے ضمیر پر بڑا بوجھ دھرا ہے۔ کسی پل چین نہیں آتا۔ میں مر جاؤں گا بھائی جی! مجھے اگر آپ نے اور میری بیٹی نے معاف نہ کیا تو۔" وہ بری طرح سے سسک رہے تھے۔ میراں چاچی بھی روئے جا رہی تھیں۔ سو ویرا کا دل بھی پسیج گیا تھا۔

"پلیز چاچو جی! بس کریں پاپا کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"بھائی جی! معاف کر دیں نا...... پھر ہی میرے دل کو چین آئے گا۔" انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"بس کر عزیز!" پاپا کب تک کٹھور بنے رہتے۔ بالآخر وہ بھی اپنی اور اپنی بیٹی کی توہین اور کی جانے والی بے عزتی کو بھول گئے تھے۔ بھائی کو نہ صرف معاف کیا بلکہ صاف دل کے ساتھ گلے بھی لگا لیا تھا۔ ویرا کی آنکھیں اس ملاپ پر نم ہو گئی تھیں۔

"کہاں ہے ہمارا نافرمان بیٹا۔" چاچو مبرم کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ویرا انہیں کولڈ ڈرنکس سرو کر کے مبرم کو جگانے کی غرض سے کمرے میں آگئی تھی۔

اس کی توقع کے عین مطابق مبرم ابھی سو رہا تھا۔ لائٹس آف تھیں اور گلاس ونڈوز کو بھاری پردے نے چھپا رکھا تھا۔ ویرا نے کھٹا کھٹ لائٹس آن کر کے پردہ سمیٹنے کے بعد مبرم کا انگوٹھا ہلایا۔ ساتھ ہی اے سی کا ریموٹ پکڑ کر آف کا بٹن بھی دبا دیا تھا۔

"مبرم!" وہ ایک دفعہ پھر اسے ہلا رہی تھی۔ "اٹھ جاؤ مبرم! باہر دیکھو کون آیا ہے؟"

"تم خود دیکھ لو۔ اب میں نیند سے اٹھ کر باہر دیکھنے جاؤں۔ کوئی فقیر ہو گا۔ بیل آف کر دیا کرو۔" مبرم نے سوئی سوئی آواز میں بیزاری سے کہا۔

"پلیز مبرم!" وہ زچ ہو اٹھی۔ "میرا مطلب ہے تم ایک دفعہ اٹھو تو سہی۔" ویرا نے اس کے بال کھینچ کر غصے سے کہا۔

"صبح صبح تشدد پر اتر آیا کرو بس۔" مبرم چیخ کر بولا "نجانے کون آگیا ہے' عذاب بن کر۔"

"فضول مت بولو۔ تمہارے اپنے ہیں۔" وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی۔

"کون؟ کیا اویس آیا ہے؟" مبرم نے چونک کر پوچھا۔

"خود جا کر دیکھو۔" وہ بھی ہوا نہیں لگنے دے رہی تھی کہ کون آیا ہے۔

"میں نہیں جا رہا۔" اس نے بھرپور قسم کی انگڑائی لی۔ "جس نے مجھ سے ملنا ہے۔ خود آکر ملے۔" انداز میں کافی شاہانہ پن تھا۔ ویرا تپ کر رہ گئی۔

"تم نہ جانے کس پر چلے گئے ہو۔ ہمارے خاندان میں تو تمہارے جیسا کوئی نہیں تھا۔"

"کیا پتا میں تمہارے نیک خاندان میں سے نہ ہوں۔" وہ مذاقاً" بولا تھا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ یقیناً" چاچو جی نے تمہیں ایڈاپٹ کیا ہو گا۔"

"بالکل' بجا فرمایا آپ نے۔" مبرم کہاں چوکتا تھا۔

"اب اٹھ بھی چکو' باہر چاچی اور چاچو۔" ویرا کے لبوں میں بات رہ گئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی اور پھر چاچی اندر آگئیں۔ مبرم ماں کو دیکھ کر اچھل کر اٹھ پڑا۔

"اماں! میری پیاری اماں۔" وہ بے ساختہ بچوں کی طرح ان سے لپٹ گیا۔

"چل ہٹ پرے..... بڑا اماں کا خیال آتا ہے تجھے۔ یہ نہیں کہ بوڑھی ماں کو اپنا چہرہ دکھا دے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اور میرے دل کو کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ گئی ہوں۔" چاچی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کئی دفعہ چوما۔

"اماں! آئی ریئلی مس یو..... سچ کہہ رہا ہوں اماں! میں نے بھی آپ کو بہت مس کیا۔"

"مس کرتے تو ملنے آجاتے۔" اب وہ ویرا کو پیار کر رہی تھیں۔ "کیا کیا نہ سوچا تھا۔ خیر جیسے اللہ کی مرضی۔" وہ جلد ہی راضی بہ رضا ہو جانے والوں میں تھیں۔ کچھ دیر کڑھنے کے بعد مطلع خود بخود صاف ہو جاتا تھا۔

"اماں! آپ کے ارمان تو دل میں ہی رہ گئے ہیں۔" وہ قدرے افسوس سے بولا۔

"ارمان تو پورے ہو گئے نا۔ ہم اسی میں خوش ہیں۔" انہوں نے پھر سے اس کے سر کو چوما۔

"آپ کے شوہر کا ارادہ تو نہیں تھا۔ یہ تو میں نے زبردستی پورے کروائے ہیں۔ ویسے اماں! کبھی کبھی مجھے اپنے ابو جانی نجانے کیوں سوتیلے سوتیلے لگتے ہیں۔" وہ مذاق کر رہا تھا۔ میراں بیگم کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"اول فول نہیں بولتے پتر!" وہ منہ پر آیا نادیدہ پسینہ پونچھ کر بولیں۔ ادھر مبرم خوامخواہ ویرا پر چڑھ دوڑا۔

"میری اماں کو دیکھ کر اے سی بند کر دیا۔ بن گئیں نا فوراً "ظالم بہو۔"

"توبہ ہے مبرم! اے سی تو میں نے اسی لیے بند کیا تھا تاکہ تم اٹھ جاؤ۔" وہ جھینپ کر اے سی آن کرنے لگی۔ ابھی وہ دوبارہ چاچی کے پاس بیٹھنے لگی تھی جب مبرم نے پھر سے اسے اٹھا دیا۔

"میری اماں آئی ہیں۔ کچھ خاطر تواضع تو کرو۔ پھر سے اے سی کی ہوا لینے بیٹھ گئی ہو۔"

"مبرم!" وہ اسے آنکھیں دکھا کر رہ گئی۔ "کچھ دیر تو بیٹھنے دو چاچی کے پاس..... ویسے بھی سب تیار ہے۔"

"اٹھ بھی جاؤ کچھ لے آؤ کیا باتیں کھلاؤ گی۔" مبرم کو شاید خود کو بھی بھوک لگی تھی۔

"وہ تمہیں کیا تکلیف ہے؟" ویرا نے تنک کر پوچھا۔ "میں نہ چاچی سے دو باتیں کروں۔"

"نہ بیٹا! تحمل سے بولا کرو۔ شوہر ہے تمہارا۔" چاچی بے اختیار ٹوک گئی تھیں۔ خود تو وہ آج تک شوہر کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتی تھیں۔ ان کے خیال میں مردوں سے منہ ماری نہیں کرنا چاہیے تھی۔

"ذرا سمجھا کر جائیے گا اماں! ذرا بھی میری عزت نہیں کرتی۔" مبرم کی تو من کی مراد بر آئی۔ فوراً شکایتیں لگانے لگ گیا تھا۔

"تم بھی عزت سے پیش آیا کرو۔ استانی بھی ہے تمہاری۔" اماں نے مبرم کو بھی ڈپٹا۔ اس کا منہ اتر گیا تھا۔

"اٹھ کر اپنے ابو سے بھی مل آؤ۔" اچانک انہیں خیال آیا تو بولیں۔

"وہ بھی آئے ہیں؟" مبرم چونکا۔

"ہاں بھائی جی سے ملنے۔ ان سے معافی مانگنے۔" اماں نے دبی آواز میں بتایا۔

"او..... اچھا۔" مبرم نے معنی خیزی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کوئی نئی سیاست کا سوچ کر آئے ہوں گے۔ ویسے ہمارے والد محترم سیاست دانوں والے سارے جراثیم رکھتے ہیں۔"

"اٹھو شاباش ملو ان سے۔ دل میں کدورت نہیں رکھتے۔ باپ ہیں تمہارے۔" اماں نے اسے پچکارا۔

"نجانے لگتا کیوں نہیں۔ کبھی باپ جیسی گرمی اور محبت محسوس بھی نہیں ہوئی۔ شاید ان کی روکھی طبیعت کی وجہ سے۔" وہ بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

"مبرم! اٹھ جاؤ پہلے فریش ہو لو کیا پوستیوں کی طرح بیٹھے ہو۔" ویرا الماری میں سے اس کے کپڑے نکال لائی۔

وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میراں بیگم ویرا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"مبرم تمہارے ساتھ ٹھیک ہے؟" وہ اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ظاہر ہے، منگنی کے وقت کے سارے ہنگامے انہیں یاد تھے۔

مبرم کس طرح سے طوفان اٹھائے ہوئے تھا۔

"جی..... ایک دم ٹھیک ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ گویا پرسکون ہو گئی تھیں۔

"ہمارے ساتھ گاؤں چلو گی؟" ثمرہ اور سمانہ بڑا اصرار کر رہی تھیں کہ ویرا باجی کو لے کر آنا۔"

"ابھی فی الحال تو نہیں جا سکتی۔ پاپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔" ویرا نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا تاکہ انہیں برا بھی نہ لگے۔

"بھائی جی کی طبیعت سنبھل گئی تو ضرور چکر لگانا اور بی بی! تم سے ایک بات کہنا تھی۔" وہ اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے بولیں۔ لہجے میں کچھ جھجک نمایاں تھی۔

"جی کہیے۔"

"بی بی! مبرم کو سمجھایا کرو۔ اپنے باپ سے ضد نہ باندھے۔ جوان کا مزاج ہے وہ بس میں ہی سمجھ سکتی ہوں۔ اپنی توہین اور ذلت ان سے برداشت نہیں ہوتی۔" وہ گویا ٹھٹک کر بولیں۔

"چاچی جی! ایک بات میں بھی کہہ لوں؟" ویرا ان کی بات سمجھ چکی تھی۔ سو اسی لیے اجازت طلب کر رہی ہوں ہے انہیں دیکھتی رہی۔

"کہو بیٹی!"

"معذرت کے ساتھ کہتی ہوں..... آج تک میں نے بھی ایک چیز ہمیشہ نوٹ کی ہے کہ چاچو کا رویہ مبرم کے ساتھ آقا اور غلام جیسا ہوتا ہے۔ وہ اسے بات بے بات ڈی گریڈ کرتے ہیں۔ وہ اکلوتا بیٹا ہے۔ اس حساب سے چاچو نے کبھی مبرم کو کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں دی۔ اگر مبرم کو زمین داری کا شوق ہے تو اس کا یہ شوق کوئی غلط تو نہیں زمین سے محبت تو ہر کسان کو وراثت میں ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے ہر شوق کی راہ میں رکاوٹ بنے ہیں۔ اگر میں صاف لفظوں میں کہوں تو بات یہ ہے کہ چاچا، مبرم کی شخصیت کو مسخ کر دینا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ مبرم ایک روبوٹ کی طرح ان کے اشاروں پر آنکھیں بند کر کے چلتا رہے۔

ایک باپ ہونے کے ناتے کیا ان کی ایسی سوچ درست ہے؟"

اس نے اپنی بات کے اختتام پر چاچی کے زرد چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر چپ سی کر گئی۔ نجانے کیوں لمحہ بھر کے لیے اسے محسوس ہوا تھا گویا چاچی ایک ٹوٹی پھوٹی سی شکستہ عمارت کا روپ دھار گئی ہیں۔

"آپ کو میری بات بری لگی ہے؟"

"بری کیوں لگے گی۔ مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ محترمہ مجھے اس حد تک سمجھتی ہیں۔ کمال ہے استانی جی! آپ نے تو میرا دل ہی جیت لیا۔ میں کبھی بھی اتنے اچھے طریقے سے اماں تک یہ بات نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ محترمہ ویرا مبرم نیازی صاحبہ!" وہ نجانے کب سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ گیلا تولیہ اس کے منہ پر پھینکتا وہ اس کے قریب چلا آیا۔

"میری جان! تم تو سچ کمال کی چیز ہو۔ اور میں کیسا نادان تھا۔ ابو سے ضد میں اپنا ہی نقصان کرنے والا تھا۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے جو ابو، پاپا کو جواب دے گئے تھے ورنہ میں تو مفت میں مارا جاتا۔" اماں کے سامنے اس کے لاڈ کا عملی مظاہرہ شروع ہونے کے قریب قریب تھا، اس لیے تو ویرا چیخ پڑی۔

"کبھی تو لحاظ کر لیا کرو۔"

"تم ہی کبھی میرا خیال کر لیا کرو۔" وہ دوبدو بولا۔

"ابھی تمہارا خیال نہیں رکھتی میں۔ پچھلے دو اڑھائی سال سے میرے سر پر ہی سوار ہو۔ اب تو خیر مستقل سوار ہو چکے ہو، مگر شکوے تمہارے پھر بھی ختم نہیں ہوتے۔"

"تو تم شکووں کو ٹھیک طرح سے ختم کرو نا..... کیوں اماں! دیکھیں میں کتنا پیلا پھٹک ہو رہا ہوں۔ تو ناشتہ بھی ٹائم پر نہیں دیتی۔" وہ اپنے سرخ و سفید چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ویرا اس سفید جھوٹ پر تلملا اٹھی۔

"چاچی! اس ہٹے کٹے کے جھوٹ پر دھیان نہ دیں اور رہی ناشتے کی بات تو جب چھٹی والے روز بارہ بجے اٹھنا ہو تو ناشتہ اس کے منہ میں بھلا کیسے ٹھونسا جائے۔"

"ارے، کیا تم بچوں کی طرح لڑتے ہو۔" چاچی ہنس پڑیں۔ مبرم کو خوش دیکھ کر ان کے دل کا تمام تر بوجھ خود بخود ہٹ گیا تھا۔ ویرا کے لیے جو دل میں تھوڑی بہت کدورت تھی۔ خود بخود ختم ہوگئی۔ ادھر اب وہ زبردستی مبرم کو اٹھا کر باہر لے گئی تھیں تاکہ باپ، بیٹے میں صلح کروا سکیں۔ مبرم نے ماں کی بات کا مان رکھ لیا تھا۔

ویرا گویا پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ کھانا کافی خوشگوار ماحول میں کھایا جا رہا تھا جب مبرم نے اچانک گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

"اس دفعہ فصل اٹھانے کے بعد آپ منشی اسلم کو گندم کی فصل کا مزارعہ رکھیں گے۔"

"منشی اسلم کو؟" عزیز نیازی ایک دم چونک گئے۔

"تم کیسے منشی اسلم کو جانتے ہو؟" ان کا حیران ہونا فطری تھا۔ آج سے پہلے مبرم نے کبھی اس آدمی کا نام نہیں لیا تھا کیونکہ وہ منشی اسلم سے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ گاؤں سے وہ اسے ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ رنگ رنگ کے لوگوں سے وہ کبھی مل ہی نہ پائے۔

"ایک دفعہ شہر میں ہی ملا تھا مجھے۔ کچہری بازار میں۔" مبرم نے مختصر سا بتایا۔

"کیا کہا تھا اس نے؟" وہ کھانا چھوڑ چکے تھے۔

"بس یہی کہ وہ ہماری ٹاہلی والی زمین کا مزارع رہنا چاہتا ہے۔ آدھی فصل اس کی ہوگی اور آدھی ہماری۔ سارا خرچا وہ ہی کرے گا۔ ڈیزل، تیل، بیج، کھاد...... ٹوٹل خرچہ اس کا اور زمین ہماری، آپ اسے فصل بیچنے دیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بہت سال پہلے بھی وہ ہمارا مزارع رہ چکا ہے۔" مبرم نے تفصیلاً بتا دیا تھا۔ عزیز نیازی نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ان کی تو گویا بھوک ختم ہوگئی تھی۔

"میں منشی اسلم کو زمین نہیں دوں گا۔" انہوں نے دو ٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مبرم کچھ بے چین سا ہو گیا۔

"مگر ابو! میں وعدہ کرچکا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی ہے۔ عہد سے پلٹنا مجھے سخت ناپسند ہے۔"

"تم مجھ سے پوچھ تو لیتے۔"

"میں جانتا تھا کہ گندم کی فصل اٹھا کر آپ نئے مزارع پر رکھیں گے سو اسی لیے میں نے منشی اسلم کو ہاں میں جواب دے دیا تھا۔"

"اسی لیے تو میں تم سے کہتا ہوں۔ زمین کے معاملوں سے دور رہا کرو۔ تم کچھ نہیں جانتے زمین داری حساب کتاب کو۔" انہیں حسب معمول غصہ آ گیا تھا۔

"میں جاننا ہی تو چاہتا ہوں۔ اسی لیے دلچسپی لے رہا ہوں۔" وہ اطمینان سے کھانا کھاتا رہا۔

"تمہاری دلچسپی شہر تک محدود رہنا چاہیے۔ آرام سے جاب کرو۔ شادی تو ہو چکی ہے۔ بیوی کو ساتھ لے کر یورپ چلے جاؤ۔ پڑھنا چاہو تو وہاں جا کر پڑھتے رہنا۔ کماؤ، کھاؤ۔ جو مرضی کرو، ہر طرح کی آزادی ہے تمہیں۔"

"میں یو کے نہیں جانا چاہتا۔"

"تو اور کیا چوہدری جی! میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ کیسے نظروں سے اوجھل کردوں۔" کب سے خاموش بیٹھی میراں چاچی بھی بول پڑیں۔

"اس کے روشن مستقبل کے لیے ہی تو کہہ رہا ہوں۔ کیوں بھائی جی!" انہوں نے پاپا کو بھی اپنا ہمنوا بنانا چاہا۔

"مستقبل میرا یہاں بہت روشن ہے۔ زیادہ روشن کرنے کی مجھے خواہش بھی نہیں۔ اتنی روشنی آنکھوں کو کہاں بھاتی ہے۔ مجھے اندھا ہو کر کیا ملے گا۔ دراصل میں اپنی ہی مٹی پر چلنا چاہتا ہوں۔ کوئی اور ملک مجھے صرف روپیہ دے گا۔ پہچان نہیں۔" مبرم کا انداز بھی فیصلہ کن تھا۔

"آج کل ہر کوئی یورپ بھاگ رہا ہے، مگر ایک ہمارے صاحبزادے ہیں۔ جو ہمیشہ کنویں کا مینڈک بنے رہنا چاہتے ہیں۔" وہ سخت تاؤ کھا کر بولے۔

مبرم کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ویرا نے اس کے پاؤں پر اپنے پاؤں کا ٹھوکا دے کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"چاچو جی! یہاں رہ کر بھی تو ترقی کی جا سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ ہمارے ملک کی زمین سونا ہے سونا۔ مبرم کا ارادہ یہاں فروٹ اور سبزیاں اسٹور کرنے کے لیے کولڈ اسٹور بنانے کا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ خود سوچیے، چھوٹے پیمانے پر فصل اور سبزی، فروٹ کا کاروبار کرنے والے کسان کافی حد تک خوشحال ہو جائیں گے ـــــ ان کے پھل اور سبزی ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔ کولڈ اسٹور کے لیے ملازمین کی ضرورت ہوگی اور ہمارے اپنے علاقے کے لوگ صاحب روزگار ہو جائیں گے۔ جب اچھا ذہن رکھنے والے سارے لوگ باہر کی طرف بھاگ جائیں گے تو ہمارے ملک کو ترقی کون دے گا؟"

مبرم کے بولنے سے پہلے ہی ویرا نے بہت ہی شستہ رواں لہجے میں اپنی بات بہت اچھی طرح سے چاچا جی تک پہنچا دی تھی اور وہ نجانے کس طرح غصے کو قابو کرکے بمشکل بولے۔

"بیٹی! یہ عورتوں کے معاملات نہیں ہیں۔" دوسرے لفظوں میں انہوں نے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔

"ویرا ٹھیک کہہ رہی ہے ابو! میں کچھ دنوں تک تعمیراتی کام شروع کروانے والا ہوں۔" اس نے کمال اطمینان سے انہیں بے اطمینان کردیا تھا۔

"کیا مطلب؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔ کیا میری اتنی بھی اہمیت نہیں۔" وہ گویا چیخ پڑے۔

"دیکھ رہی ہو اپنے نافرمان بیٹے کو۔ مجھ سے مشورہ لینا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ کب سے اتنا خود مختار ہوگیا ہے۔" وہ میراں چاچی پر چڑھ دوڑے تھے، جو کہ گم صم سی بس ان کے غصیلے چہرے کو دیکھتی جا رہی تھیں۔

"ہانڈی کے نیچے آگ سلگائے رکھیں تو ایک دن وہ ابل ہی پڑتی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے ویرا کے پیچھے ہی ڈائننگ روم سے باہر نکل گئی تھیں جبکہ عزیز نیازی گویا خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئے۔

"اس مبرم کو لگتا ہے، دوسرے طریقے سے ہی سمجھ آئے گی۔ رسی کے سارے بل نکالنا مجھے آتے ہیں۔" وہ زہرخند سے سوچ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

مبرم ان دنوں بہت مصروف تھا۔ کولڈ اسٹور کا تعمیراتی کام شروع ہو چکا تھا۔ بینک میں سے رقم بھی نکلنے لگی تھی، جس کی وجہ سے عزیز نیازی آگ بگولا ہوئے جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا اگر کمی کمین خوشحال ہوگئے تو ان کے کام بھلا کون کرے گا۔

بہت دنوں بعد مبرم کا شہر کی طرف چکر لگا تھا۔ سو ویرا پاپا کے مجبور کرنے پر گاؤں جانے پر رضامند ہو گئی تھی۔

مبرم نے کچھ مشینری اور بجلی کا سامان خریدنا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ویرا کو لینے آگیا تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی۔ پاپا کے لیے دو تین سالن بھی بنا دیے تھے۔ ویسے وہ زیادہ جوس اور فروٹ ہی کھاتے تھے۔ سو ویرا کچھ مطمئن تھی۔

شام تک وہ لوگ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ اس دفعہ پہلے سے بھی اچھا استقبال کیا گیا تھا۔ ثمرہ، سمانہ اور سمن خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔ گوشی کچن میں جا گھسی تھی۔ نجانے کیوں وہ مبرم سے چھپنا چاہتی تھی۔ شاید اسے یہ بھی خوف لاحق تھا کہ اس کا جھوٹ کھل نہ گیا ہو۔ وہ ویرا کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہی تھی، مگر ویرا خود ہی اسے ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آگئی۔

"تم کہاں چھپ گئی ہو؟"

"ویرا باجی! آپ......" وہ جو سبزی کاٹنے میں خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔ ایک دم بھنڈی کی ٹوکری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"ارے، تمہیں کیا ہوا؟ اس قدر کیوں گھبرا رہی ہو۔" ویرا حیران سی اسے تھام کر بولی تھی۔ وہ بے اختیار ویرا سے لپٹ کر رونے لگی۔

"مجھے معاف کردیں ویرا باجی! میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے تو خالو جی نے مجبور کیا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ ظاہر ہے، میں آپ کے گھر گئی نہیں تھی پھر سنتی کہاں سے۔ مگر خالو جی کے خوف سے۔"

وہ بے ربط سی بولے جا رہی تھی اور ویرا تو کچھ بھی نہیں سمجھ پائی تب ہی مبرم بھی کچن میں آگیا تھا۔ وہ مزدوروں کے لیے میٹھا پانی بنوانے کے لیے آیا تھا، مگر اس جذباتی سین کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"گوشی! یہ کیا بچپنا ہے؟" مبرم کو بالآخر بولنا پڑا

"اس میں تمہارا کیا قصور۔" وہ حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ مبرم نے مختصر الفاظ میں سارا قصہ اسے بھی سنا دیا تھا۔

"چاچو جی نجانے کس قسم کی سوچ رکھتے ہیں۔" ویرا کو ایک دم جھرجھری سی آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں مبرم تعمیراتی کام زور و شور سے ختم کروا رہا تھا، جب پاپا اچھے بھلے گاؤں آئے اور ایک رات معمولی سے درد کو نہ سہتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس صدمے نے کئی دن تک ویرا کو ہوش و حواس سے عاری رکھا۔

پاپا کی دائمی جدائی کے دکھ نے اسے بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کئی دن تک ہسپتال میں ایڈمٹ رہی تھی۔ گوشی اور سمانہ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ اب وہ رات کو واک کے لیے بھی جانے لگی تھی، پھر بھی اسے افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے اصرار پر مبرم اسے گاؤں لے آیا تھا۔

آج پھر وہ گوشی کے ہمراہ آم کے باغ کی سیر کرنے نکل آئی تھی۔ آم کا پھل تو اتارا جا چکا تھا۔ تاہم گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھایا کے نیچے ٹہلنا ویرا کو بہت پسند تھا۔ نجانے کہاں سے مبرم بھی ادھر آنکلا تھا۔ انہیں چہل قدمی کرتے دیکھ کر اس نے کسی کو آواز دے کر چارپائی بھی منگوالی تھی۔

"یہاں آکر بیٹھو... تھک جاؤ گی۔"

"آج میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں اور مجھے آم کے یہ درخت بہت پسند ہیں۔" بہت دنوں بعد وہ کافی فریش موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔

"ویرا! کیا ہم شہر نہ چلیں... یہاں تم بہت بجھ کر رہ گئی ہو۔"

"مجھے لگتا ہے۔ گاؤں مجھے راس نہیں آیا۔ شہر واپس جانا پڑے گا۔" وہ آزردگی سے بولی۔

"تو کیا آج شام کو واپس چلیں۔"

"اتنی جلدی..." گوشی بے ساختہ بولی۔ "ہم کیا کریں گے ویرا باجی! ابھی کچھ دن اور رہ لیں، ویسے بھی آپ کی صحت اتنی بھی اچھی نہیں ہوئی۔ شہر میں آپ کا خیال کون رکھے گا۔"

"تو تم ہمارے ساتھ چلو نا... باجی کا خیال بھی رکھ لینا۔" مبرم نے اچانک کہا تھا۔ ویرا کو یہ آئیڈیا خاصا پسند آیا۔

"میں... مگر کیسے؟" گوشی کچھ گھبرا گئی۔

"کیا مطلب کیسے ہمارے ساتھ چلو گی۔" ویرا بگڑی۔

"مگر خالوجی۔" اصل خوف خالوجی کی طرف سے لاحق تھا۔

"خالوجی کا ہوا سر پر سوار کر رکھا ہے۔ اب ایسے بھی وہ جنگجو نہیں ہیں۔" ویرا نے خفگی سے کہا۔

"ویرا باجی! آپ جانتی نہیں ہیں۔ خالوجی تو ہمیں کہیں بھی نہیں جانے دیتے۔"

"خالوجی تو سانس بھی نہ لینے دیتے اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو۔" مبرم نے تلخی سے کہا تھا۔ اب وہ اٹھ کر کچے راستے سے ہوتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

واپسی پر مبرم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ دونوں اب پکی سڑک کی طرف جا رہی تھیں۔ کچھ ہی دور گھر کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے چاچو جی کی گاڑی کھڑی تھی۔ گوشی تو گاڑی دیکھ کر ہی گھبرا گئی۔

"لگتا ہے... خالوجی گھر آگئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"ویرا باجی! ہم پچھلے دروازے سے اندر چلے جاتے ہیں۔" وہ بے ساختہ اس کا بازو تھام کر اسے بھی روک چکی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر داخلی دروازے سے اندر آگئی تھی۔ جوں ہی انہوں نے برآمدے میں قدم رکھا تھا۔ چاچو جی کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"کہاں تھیں تم دونوں؟"

"ذرا باغ میں نکل گئے تھے۔" ویرا اطمینان سے بولتی ہوئی اندر آگئی۔ جبکہ گوشی وہیں جمی رہی۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ ویرا پلٹ کر اس تک آئی تھی اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر آگئی۔

"تم نے اگر یہاں رہنا ہے تو پرانے طور طریقے بھول جاؤ۔ ہماری لڑکیاں یوں آزادانہ نہیں گھومتیں۔" وہ ترخ کر بولے تھے۔ ویرا کے سوال جواب انہیں ہرگز بھی پسند نہیں آتے تھے۔ اس کے جرح کرنے والے انداز سے تو انہیں اور بھی چڑ تھی۔

"تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔ مبرم ہمارے ساتھ تھا۔" ویرا نے نرمی سے وضاحت کی۔ وہ ایک ہفتہ سے پھر ہلکا ہلکا بخار محسوس کر رہی تھی۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ سے حرارت ہو گئی تھی۔

"مبرم کو بھی میں دیکھ لوں گا۔ یوں آزادی دے رکھی ہے۔ اگر شتر بے مہار پھرنا ہے تو پھر گاؤں آنے کی ضرورت نہیں۔ شہر میں ہی رہو دونوں۔"

"اگر آپ کو برا لگا ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔" وہ بات کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

"گوشی کیوں گئی تھی میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر۔" انہوں نے دھاڑ کر پوچھا تھا۔ یوں کہ سمانہ اور ثمرہ سہم کر ماں کی اوٹ میں ہو گئیں۔

"خالو جی! مجھے معاف کر دیں۔" وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔

"کیا ملاقات کرنے گئی تھیں اس خبیث سے۔" انہوں نے اویس کو ایک موٹی سی گالی دی۔

"نہیں... نہیں، کبھی نہیں مم، میں تو ویرا باجی کے ساتھ گئی تھی۔" گوشی خوف کے مارے سرد ہو گئی۔

"جھوٹ مت بولو۔" انہوں نے آگے بڑھ کر گوشی کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ وہ لہرا کر فرش پر جا گری تھی۔

"چاچو جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" ویرا گویا وحشت زدہ رہ گئی۔

"تم بیچ میں مت بولو۔" وہ چلا اٹھے تھے۔ یقیناً انہیں گوشی کی غداری کی خبر بھی ہو گئی تھی کہ اس نے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہے۔

"آپ کو ذرا احساس نہیں کہ ایک بیٹی پر ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔" ویرا بھلا خاموش رہ سکتی تھی۔

"ہماری بیٹیوں کو زبان درازی کا سبق مت دو۔" غصے سے ان کی آنکھیں انگارہ ہو گئی تھیں۔ ویرا بھی گویا ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہی تھی۔

"میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کا خون ہوں چاچو جی! آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں مجھ سے۔"

"ایسی بے حیا اور بد زبان ہماری بیٹی نہیں ہو سکتی۔" ان کے لہجے میں تنفر ہی تنفر تھا۔ اب وہ میراں چاچی کی طرف رخ کیے بول رہے تھے۔

"تمہارے بیٹے نے بیاہ کیا ہے ایک ٹٹ پونجیے وکیل کی بیٹی سے۔ اگر نواب مرزا کی بیٹی بیاہ لاتا تو تین مربع زمین بھی مل جاتا تھی اور اگر تمہاری اس بھانجی سے شادی کر لیتا تو آٹھ ایکڑ زمین بھی اسی لاکھ کی مالیت کی تھی۔ اس سے بیاہ رچایا ہے جو خالی ہاتھ اٹھ آئی ہے۔ نہ زمین نہ جائیداد۔ اس کے عیاش باپ نے تو ساری زندگی کچھ بنایا ہی نہیں۔ جو کچھ لوگوں نے اسے دیا، وہ بھی بانٹتا رہا۔ ہونہہ، ہم نے ایسے سخی نہیں دیکھے آج تک۔"

"چاچو جی! میرے باپ کو گالی مت دیجیے۔" ویرا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ "ایسا نہ ہو رشتوں سے میرا اعتماد اٹھ جائے۔ پھر کوئی بھتیجی کسی چچا کو باپ بھلا کیسے مانے گی؟"

"یہ جذباتی باتیں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں۔ سامان سمیٹو اور شوہر کے ساتھ چلتی بنو۔ اگر اتنا ہی مجھے باپ مانتی ہو تو... تو پھر میری بیٹی بن کر دکھاؤ۔ میری عزت اور مان کو واپس لوٹاؤ۔" وہ گویا ایک دم پینترا بدل گئے

تھے۔

"کیا مطلب؟" ویرا ٹھٹک کر رہ گئی۔

"مبرم نے مجھے ذلیل کرنے اور مجھے بھائی جی کی نظر میں گرانے کے لیے آنا "فانا" تم سے نکاح کیا تھا۔ اگر میری بیٹی ہو تو مبرم کو اس نیچ حرکت پر جھکانے کے لیے میرا ساتھ دو۔" اب وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئے تھے۔

"آپ کا ساتھ مگر کیسے؟"

"مبرم کو چھوڑ کے۔ ابھی میرا اور اس کا جھگڑا ہوا ہے۔ وہ ڈیرے پر ہے اور تمہیں لینے کے لیے آ رہا ہے۔ تم یہاں رہو میرے پاس اس کے ساتھ مت جانا۔ میں اسے جھکانا چاہتا ہوں۔ تم میری بیٹی ہو۔ تمہیں میرا مان بننا ہے۔ اسے جواب دے دینا۔ آخر کتنے دن باہر دھکے کھائے گا۔ سات ہزار ماہوار تنخواہ میں ایک کمرہ بھی کرائے کا نہیں ملے گا اور جو تمہارا گھر ہے۔ وہ تو مالک مکان نے خالی کروا لیا ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر ذلیل کرے گا۔ نہ اس کے پاس کوئی ٹھکانا ہے۔ نہ جیب میں پیسہ۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے گویا التجا کر رہے تھے۔

"مالک مکان نے گھر خالی کروا لیا؟" ویرا کو دھچکا لگا تھا گویا۔

"بھائی جی کی وفات کے آٹھ دن بعد ہی تو کروا لیا تھا۔ کیا تمہیں مبرم نے نہیں بتایا۔" اب وہ معصوم بنے پوچھ رہے تھے۔

"نہیں تو۔" اس کا بے اختیار نفی میں سر ہل گیا۔

"نجانے یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ گویا چکرا کر رہ گئی تھی۔

"مبرم بھلا کیوں بتائے گا۔" وہ تنفر سے بولے۔

"بہت اکڑ ہے اس میں چار دن گھر سے باہر رہے گا تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔ سارا نخرا بھول جائے گا۔ بس تم ثابت قدم رہنا۔"

"مجھے مبرم کے ساتھ جانا ہے۔" ویرا کے مضبوط لہجے نے ان کے یقین کو ڈگمگا دیا تھا۔

"جذباتیت میں فیصلہ نہ کرو بیٹی! خوب سوچ سمجھ لو۔ مبرم کے ساتھ دھکے کھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، جب تک چاہے رہو۔ مبرم بھی ذلیل و خوار ہو کر واپس ہی آئے گا۔ تم فکر مت کرنا۔"

"مجھے ہر صورت میں مبرم کے ساتھ ہی جانا ہے۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔" ویرا تڑخ کر بولی۔

"تو پھر واپسی کے راستوں کو بھول جانا۔ یہاں تمہارے باپ کی قبر ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے بھی قبرستان نہیں جانے دوں گا۔" وہ پھر سے سفاک ہو گئے تھے۔

"میں اس گاؤں کے سارے راستوں کو بھول کر ہی جاؤں گی۔"

"ویرا بیٹی! بس کرو۔ غصہ نہ کرو ان باپ بیٹے کی جنگ تو یوں ہی چلتی رہے گی۔ بھلا اس میں ہمارا تمہارا کیا قصور ہے۔" میراں چاچی جو نجانے کب سے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھیں، ایک دم بھرائی آواز میں بول پڑیں۔

"چاچی! قصور نہ جانے کس کا ہے۔ میں تو ابھی تک ایک ہی الجھن کا شکار ہوں اور مجھے آج تک اس الجھن کا کوئی سرا نہیں ملا۔" وہ گویا تھک کر رہ گئی تھی۔ ادھر چاچو جی اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلے گئے تھے۔

گوشی ابھی تک سسک رہی تھی۔ ویرا نے جھک کر اسے اٹھایا۔ ثمرہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی جسے اس نے منہ تک نہیں لگایا تھا۔

"ویرا باجی! مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ میں بھی اس قید خانے سے تنگ آ چکی ہوں۔" گوشی سسکتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔ میراں چاچی منہ پر کپڑا رکھ کر رونے لگیں۔

"میری یتیم بچی! مجھے معاف کر دینا۔ میں تیرا ساتھ نہیں دے پاتی۔"

"آپ کا بھلا کیا قصور، قسمت تو میری خراب ہے۔"

"قسمت تو ہم سب کی خراب ہے۔ کوئی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ ہر وقت ایک دھڑکا لگا رہتا ہے۔

اللہ ہمارے بھائی کو سلامت رکھے۔" سمانہ بھی بری طرح سے رو دی تھی۔

"ویرا باجی! مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔" گوشی کا ذہن ایک نقطے پر اٹک گیا تھا۔

"تم سچ مچ ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ گویا اس زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔

"اور چاچو جی، وہ کیا کہیں گے؟ کیا وہ مان جائیں گے؟"

"ان کو اللہ ہی سمجھے۔ بس تم گوشی کو اپنے ساتھ لے جانا۔" چاچی نے بھی گویا التجا کی تھی۔ "اور پھر میرے بھائی کو بلوا کر اویس کے ساتھ سادگی سے اسے رخصت کر دینا بیٹی! یہی شاید ہم سب کے حق میں بہتر ہو گا۔"

"نکاح۔" ویرا چونک گئی۔

"ہاں۔ بس یہی کام جتنی جلدی ہو سکے جلدی سے کر دینا۔" وہ خود بھی بہت خوف زدہ تھیں۔

"مگر اتنی جلدی کیسے؟"

"یہ جو تمہارا چاچا ہے نا۔ اب کوئی نیا چن چڑھائے گا۔" وہ زخمی لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب؟"

"گوشی کی کہیں اور بات چلانے لگے ہیں۔" سمانہ نے دبی آواز میں بتایا۔

"مگر کیوں۔ چاچو ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیوں جذبات و احساسات سے کھیل کر انہیں تسکین محسوس ہوتی ہے۔" ویرا گویا تھک گئی۔

"یہ ہم بھی نہیں جانتے۔ نجانے ان کے ذہن میں کیسی کیسی الجھنیں ہیں، جو وہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی الجھا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔" ثمرہ کا لہجہ زہر زہر تھا۔

کچھ دیر بعد مبرم آ گیا۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ نجانے باپ بیٹے میں کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ مبرم نے آتے ہی اس سے کہا۔

"ویرا! اپنا ضروری سامان رکھ لو۔ ہمیں ابھی نکلنا ہے اور گوشی کا سامان بھی تیار کر دو۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

"مبرم! ایک دفعہ میری بات سن لو!" میراں چاچی اس کے بے حد سرخ چہرے اور سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ابھی وقت نہیں۔ پھر سہی۔" مبرم نے عجیب سے رکھائی بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ ایک دم بے قرار ہو گئیں۔

"میری بات تو سنو۔ تم یوں مجھ سے بدگمان ہو کر نہ جاؤ بیٹا!" وہ گویا التجا کر رہی تھیں۔ "ایک دفعہ اپنے ابو سے مل لو۔ وہ بڑے ہیں، اگر کچھ کہہ دیا تو درگزر کر دو۔"

"آج تک درگزر ہی کرتا رہا ہوں۔ اب ان سے ایک ہی ملاقات کروں گا۔ یہ ملاقات آخری ہو گی۔ یعنی کورٹ میں۔" وہ سر سے لے کر پیر تک سلگ رہا تھا۔ میراں چاچی کا چہرہ فق ہو گیا۔

"عدالت میں گھسیٹو گے اس عمر میں انہیں۔"

"انہوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کیا کروں کہ یہ میری مجبوری ہے اور میں اپنا حق کسی بھی طرح چھوڑوں گا نہیں۔ میرے حصے کا رزق کیوں کسی اور کے پیٹ میں جائے۔ کبھی کبھی سچائی ظاہر ہونے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں مزید کٹھ پتلی نہیں بنا۔" مبرم اپنے ضروری کاغذات سمیٹ رہا تھا۔ میراں چاچی مسلسل رو رہی تھیں۔ سمانہ اور ثمرہ اداس نظروں سے انہیں جاتا دیکھنے لگیں۔ مبرم گاڑی میں سامان رکھوا کر پلٹ آیا۔

"تم تینوں میری بہنیں ہو اور میں بہت جلد تم تینوں کو بھی یہاں سے لے جاؤں گا۔" اس نے فردا" فردا" تینوں کے سروں پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر ذرا دور بیٹھی میراں چاچی کے پاس چلا آیا۔

"اماں! آپ کو بھی میرے ساتھ جانا ہو گا۔"

"نہیں، میں اس بڑھاپے میں اپنا گھر بار اور شوہر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"چاہے آپ کا شوہر خود آپ کو یہاں سے نکال دے۔" مبرم کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کریں گے۔" بہت چاہنے کے باوجود بھی ان کا لہجہ مضبوط نہیں بن سکا۔

"وہ ایسا ضرور کریں گے۔ وہ آدمی آپ کو چین سے نہیں رہنے دے گا۔ پلیز اماں! میری بات مان جائیے۔ میں آپ کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"وہ آدمی میرا شوہر ہے۔" وہ چیخ پڑی تھیں۔

"صرف آپ کا ہی نہیں۔ نگینہ بائی کا بھی شوہر ہے۔ اس کی بھی تین بیٹیوں کا باپ ہے۔" مبرم نے گویا دھماکا کیا تھا۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ویرا بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو مبرم!" بالآخر ویرا نے ہی سنبھل کر پوچھا تھا۔ وہ سب تو گویا پتھر کے وجود میں ڈھل گئی تھیں۔

"یہی سچ ہے پچھلے سترہ سال سے یہ آدمی میری ماں کو دھوکا دے رہا ہے۔ نجانے کتنے چہرے ہیں اس آدمی کے نجانے کتنے نقاب چڑھا رکھے ہیں۔ اگر مجھے منشی اسلم نہ بتاتا تو مجھے ہمیشہ بے خبر ہی رہنا تھا اور اس نے تو مجھے کچھ اور بھی بتایا ہے اماں! ابھی مجھ میں حوصلہ نہیں۔ قیامت کا صبر اور ضبط لاؤں گا۔ تب ہی آپ سے چند ایک سوال پوچھنے کی جرأت کر پاؤں گا۔ ہوسکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میری وجہ سے آپ کو کچھ دکھ پہنچا ہو تو۔ اماں! میری ذات ریت کے ذروں کی مانند بکھر گئی ہے۔ مجھے خود کو سمیٹ کر ایک جنگ کے لیے تیار کرنا ہے۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔"

وہ ماں کے سامنے جھک گیا تھا۔ میراں چاچی نے، اس کا چہرہ ہاتھ کے پیالے میں تھام کر چوما۔

"تجھے اللہ کی امان میں دیا۔ پر بچہ! مجھ سے کوئی سوال جواب مت پوچھنا۔ میں تیرے کسی سوال کا سامنا نہیں کر پاؤں گی۔" وہ گویا سسک رہی تھیں۔

عزیز نیازی ان کے لیے تو کبھی بھی کچھ بھی نہیں تھے۔ مگر پھر بھی دل تھا کہ اس صدمے کو سہار نہیں پا رہا تھا۔ اوپر سے بیٹے کی جدائی کا دکھ۔ جدائی کا یہ دردناک منظر ہر آنکھ کو نم کر گیا تھا۔ میراں بیگم جانتی تھیں، مبرم کبھی نہ لوٹنے کے لیے جا رہا ہے۔ وہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ان کی آنکھیں اس کے انتظار میں تھک جائیں گی۔

وہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے اپنے پردیسی بچوں کو دیکھ رہی تھیں، جو دھیرے دھیرے ان کی نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

"ارباب! میرے ساتھ دیہاڑی پر چلو گے؟" بڑی شرمندگی کے عالم میں اپنے کھردرے پھٹی پھٹی جلد والے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے نظر جھکائے مستری اقبال نے کہا تھا۔ بڑی دقتوں کے بعد یہ الفاظ ان کے منہ سے برآمد ہوئے تھے۔ تین ساڑھے تین ماہ کے بیمار مہمان کو جس کے پیر اور بازو کے زخم بھی کچے تھے۔ جو ابھی ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا تھا، اسے کام کے لیے کہنا مستری اقبال جیسے نرم دل، ہمدرد اور مخلص آدمی کے لیے بہت مشکل کام تھا۔

"ہاں..." ارباب نے ان ہی کے انداز میں سر جھکا کر جواب دیا۔ "میں آپ کے ساتھ کام پر چلوں گا۔" وہ جانتا تھا۔ مستری اقبال بہت غریب آدمی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے بھائی کے بیٹے کی کفالت بھی ان ہی کے ذمے ہیں۔ اوپر سے یہ دونوں باپ بیٹی بلا کے مہمان نواز بھی تھے۔

مستری اقبال جب بھی دیہاڑی لگا کر واپس آتے تو ہاتھ میں دو تین شاپرز پکڑے ہوتے تھے۔ وہ سیدھا باورچی خانے میں چلے جاتے تھے۔ اور ارباب بغیر سنے بھی جانتا تھا۔ مستری اقبال بیٹی سے کہہ رہے ہوں گے۔ "یہ مہمان کے لیے پھل اور گوشت... ارباب کو قیمہ پکا کر دو۔ اس کے کچے ٹانکے اور زخم جلدی بھرنے لگیں گے۔"

"جی اچھا ابا!" ماہ کامل باپ سے بھی بڑھ کر مہمان نواز تھی۔ فوراً لہسن اور پیاز چھیلنے بیٹھ جاتی۔ اس وقت بھی وہ باپ اور ارباب کے سامنے ناشتہ رکھ رہی تھی جب باپ کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ سن کر ٹھٹک گئی۔

"ابا! یہ دیہاڑی پر کیسے جائے گا۔ یہ تو بیمار ہے۔ فاتح بھی تو امتحان کے بعد فارغ ہو گیا ہے۔ کیا آج کے دن آپ کے ساتھ دیہاڑی پر نہیں جا سکتا۔"

ماہ کامل نے کافی کٹیلے لہجے میں کہا تھا۔

"بات تو ٹھیک ہے پر فاتح کو آج شہر جانا ہے اور میں اکیلا نواب صاحب کا کام نہیں کر پاؤں گا۔ دوسرے لڑکے بھی آج چھٹی پر ہیں۔ انیٹیں، مسالہ (سیمنٹ اور ریت کا مکسچر) کون بنوائے گا۔" وہ بے حد لاچار تھے۔ ظاہر ہے تنہا آدمی اتنا کام تو نہیں کر سکتا اور معمار، راج تو صرف تعمیراتی کام کرتے تھے اوپر کا کام تو مزدوروں کو کرنا ہوتا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا چاچا!" ارباب نے کہا۔

"تم نہیں جاؤ گے۔" ماہ کامل کا انداز دوٹوک تھا۔ عجیب سی تمکنت اور وقار اس کی شخصیت میں جھلکتا تھا۔ اسی پل فاتح گھر میں داخل ہوا تھا۔

"چاچا! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ارباب کے زخم ابھی ٹھیک نہیں۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں کر سکے گا۔"

"پر تم نے تو شہر جانا ہے۔" وہ کچھ تذبذب کا شکار تھے۔ فاتح کے لیے بھی وہ اسی طرح سے حساس تھے۔ اس کی تعلیم اور نوکری کے حصول تک کا یہ عرصہ ایک پل صراط کی مانند تھا۔ بڑا صبر آزما انتظار کیا تھا انہوں نے فاتح کے جوان ہونے تک۔ انہیں گویا یقین تھا کہ فاتح کی نوکری لگنے کے بعد ان کے دن پھر جائیں گے اور اس کے بعد فاتح اور ماہ کامل کی شادی۔ کتنے خوش رنگ اور سنہرے خواب تھے جن کی تعبیر صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔

"چاچا! اب تو نوکری کا سندیسہ گھر آ جائے گا۔ ہمارا کام ہو چکا ہے۔" وہ بے حد مطمئن تھا۔

"چلو، پھر چلتے ہیں۔" وہ دونوں آگے پیچھے گھر سے باہر نکل گئے تھے۔ ماہ کامل گھر کے کام کاج میں مصروف ہو چکی تھی، مگر گاہے بگاہے وہ مٹی کے اونچے سے ٹیلے پر بیٹھے ارباب کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ گھر کے ایک طرف مٹی کی اونچی سی پہاڑی بنائی گئی تھی، جس کے اطراف میں گلاب اور موتیا کے پھول ایک ترتیب سے لگائے گئے تھے۔ یہ جگہ ماہ کامل کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اور آج کل اسی ٹیلے پر ارباب نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ماہ برتن دھو کر ایک ٹوکری میں سبزی اٹھائے سیدھی اسی پھولوں کی پھلواری کے قریب آ گئی تھی۔

"ارباب!" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ماہ کامل کی آواز سن کر چونکا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" وہ وہیں پھسکڑا مارے بیٹھ گئی تھی۔

"سوچتا ہوں۔ کب واپسی کے لیے رخت سفر باندھوں گا؟" ارباب گہری سانس کھینچتا بول رہا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں ارباب!" وہ چھری اور پیاز ٹوکری میں رکھ کر گویا اپنی ہمتیں مجتمع کر رہی تھی۔

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔" وہ جانتا تھا کہ ماہ کامل کون سے درد کی کہانیاں سنانا شروع ہو جائے گی۔ وہ اس درد کا پہلے سے ہی آشنا تھا۔

"اگر تم مان جاؤ تو ابا میری محبت میں فاتح کو بھی جواب دے دیں گے۔ وہ میری خوشی اور میرے دل کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگر تم مان جاؤ تو میں تمہارے دل کے ہر زخم کی مسیحائی کروں گی۔" وہ گویا سسک پڑی اور طاق میں رکھی محبت کے چراغ نے بھی کوئی درد بھرا نوحہ پڑھا تھا۔

"جن راستوں کی خبر نہ ہو۔ اس سفر پر نکلنے سے پہلے سوچ تو لیتے ہیں۔" ارباب نے ایک نازک سی مرجھائی کلی کو کچی زمین سے اٹھا کر سونگھا۔

"دل سوچ سمجھ کر محبت کے اسباق نہیں پڑھاتا۔"

"لاحاصل سفر کے لیے خود کو تھکانے والے ایک دن ہار جاتے ہیں۔"

"تم مجھے ٹھکرا رہے ہو ارباب!" ماہ نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"نہیں... میری یہ مجال کہاں، میں تو ایک حقیر سا انسان ہوں اور زخم خوردہ بھی... میری زندگی کا صرف

ایک مقصد ہے ماہ! اگر اس مقصد میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو میں بھسم ہو جاؤں گا۔ آگ تو ہر وقت میرے سینے میں بھڑکتی رہتی ہے۔" اس کے لہجے میں عجیب سا زہر بھر گیا تھا۔

"کیا کسی اور کے اسیر ہو؟"

"ہاں!"

"کون تھی وہ؟ کہاں گئی؟"

"مجھے چھوڑ گئی۔"

"جس نے چھوڑ دیا اس کی خاطر جوگ لو گے کیا؟ جو منتظر ہے اسے کیوں نہیں اپنا لیتے۔" اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

"خود کو روگ لگانے اور جوگ لینے کی منزل سے بہت آگے نکل چکا ہوں میں۔ اب صرف انتقام کی آگ ہے میرے دل میں۔"

"ارباب! ایک بات تو بتاؤ؟"

"ہاں پوچھو۔" وہ گویا اس کے موضوع بدلنے پر ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

ماہ کامل کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر جب بولی تو لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"تم نے اس سے محبت کیوں کی؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"کی کہاں تھی۔ وہ تو خود بخود ہو گئی تھی۔" ارباب گویا اسے لاجواب کرنا چاہتا تھا۔

"محبت ہمیشہ خود بخود ہی ہو جاتی ہے جب میں نے تمہیں نہر کے کنارے زخمی حالت میں پڑا دیکھا تھا۔ تم اجنبی تھے میں جانتی تھی، پردیسی تھے یہ بھی جانتی تھی، مجھے خبر تھی، تم نے پلٹ جانا ہے، مگر اس دل پر اختیار نہیں تھا۔"

وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں تھی بلکہ تیزی سے اٹھ کر باورچی خانے میں جا گھسی، جبکہ ارباب گویا پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا اس کے وجود میں جان تک باقی نہیں۔

بانسری کی آواز اسے اپنے کمرے سے باہر لے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر فاتح نے بانسری رکھ دی تھی۔

"رک کیوں گئے؟ بجاؤ نا۔"

"تمہیں بانسری پسند ہے؟"

"بہت۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔" اس نے فاتح کے کمرے پر نظر دوڑائی۔ موسیقی کے کئی آلات ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ سارنگی، دف، ترمہی، بیلا، جانجھ اور ہارمونیم بھی تھا۔

"یہ سارا موسیقی کا سامان تمہارا ہے؟"

"نہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ "یہاں ایک باباجی ہوا کرتے تھے، میراثی تھے پتا نہیں کہاں سے آئے تھے۔ یہ سارا سامان ان ہی کا تھا۔ میں نے بانسری بجانا ان ہی سے سیکھی تھی۔ جب وہ وفات پا گئے تو میں ان کا واحد شاگرد تھا اس سارے سامان پر اپنا حق سمجھ کر لے آیا۔" فاتح نے بڑے مزے سے ساری بات بتائی تھی۔

"تم بانسری بہت اچھی بجاتے ہو؟"

"شکریہ جناب کا، کچھ لوگوں کو تو میری بانسری سے شدید قسم کی چڑ ہے۔" ماہ کامل کو اندر آتے دیکھ کر فاتح شرارتی انداز سے بولا۔

"ڈھنگ کی بجانی جو نہیں آتی۔" وہ ان کے لیے قہوہ بنا کر لائی تھی۔ سبز الائچی والا مزے دار سا قہوہ ارباب کو بھی بہت پسند تھا۔

☼ ☼ ☼

فاتح کی نوکری کیا لگی، مستری اقبال کے گھر گویا خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

فاتح ان دنوں ہواؤں میں اڑتا پھر رہا تھا اور ماہ کامل اس کی کامیابی پر دل سے خوش ہونے کے باوجود بھی بجھی بجھی سی تھی۔

فاتح کی پہلی تقرری کسی اور ڈسٹرکٹ میں تھی اور وہ اسی سلسلے میں آج کل تیاریاں بھی کر رہا تھا۔ روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے اس نے ارباب سے کہا۔

"کل تمہارا چیک اپ ہو گا اور جو تمہیں پاؤں میں معمولی سی تکلیف ہے اس کے لیے بھی میں نے ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔ سو تم ضرور وقت پر پہنچ جانا۔"

ارباب کبھی کبھی ان اجنبی اور غیر لوگوں کے خلوص

کو دیکھ کر عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس گھر کے یہ تین افراد اس کے لیے بھلا کیا تھے۔ انسان یا انسان کی شکل میں فرشتے۔

اس کے علاج معالجے پر ایک بھاری رقم خرچ کرنے کے باوجود آج تک انہوں نے اظہار نہیں کیا تھا۔ کبھی جتانے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اس کے ماضی، حال حتی کہ خاندان تک کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔

ان دنوں وہ کافی ٹھیک تھا۔ پہلے کی طرح چل پھر سکتا تھا۔ اس کے زخم بھی بھرنے کے قریب قریب تھے۔ بس کبھی کبھی پاؤں میں معمولی سی تکلیف ہوتی تھی جو چیک اپ اور دوائیوں کے بعد ٹھیک ہو رہی تھی۔

اس کے باوجود وہ ابھی واپسی کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے ابھی کچھ اور وقت درکار تھا۔ بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا تھا۔ بہت ذہانت سے لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔

اس دن ارباب گھر کے پچھواڑے مستری اقبال کی دوکان میں چلا آیا تھا۔ مستری جی لوہے کا کام بھی جانتے تھے۔ فارغ اوقات میں اس دوکان پر بیٹھتے تھے۔ اکثر زمین داروں کے ہل کے پھلکوں، درانتی وغیرہ کو ٹانکا لگا دیتے تھے اور درانتی تیز کر کے دیتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑی مہارت تھی۔

شام تک وہ ساتھ رہا تھا، چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی مدد کرتا رہا، مغرب کی اذان کے بعد وہ سیدھا مسجد چلے جاتے تھے۔ ارباب بھی انہیں دکان بند کرتا دیکھ کر اٹھ گیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا تھا۔ واپسی پر وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھ گئے تھے جبکہ ارباب سست روی سے چلتا ہوا گھر آ گیا۔

"کہاں تھے تم؟" وہ تھانیدارنی بنی برآمدے میں نتھنے پھلائے کھڑی تھی۔

"کیوں بھئی۔" ارباب صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ شام کے وقت کمروں میں بہت گھٹن ہو جاتی تھی، سو اسی لیے ماہ کامل سر شام ہی چارپائیاں بچھا کر پنکھا بھی نکال کر لگا دیتی تھی۔

"بس چکر لگائے ہیں۔ چھت کے اوپر آ جا کر میری ٹانگیں دکھ گئی ہیں۔" وہ بھنا کر چلتی ہوئی صحن میں آ گئی۔

"میں نے ادھر ہی تو واپس آنا تھا ناں۔ چاہے جتنی مرضی بھی باہر رہتا۔" ارباب کا لہجہ سادہ سا تھا۔ تاہم وہ اپنی مرضی کے معنی میں خود بخود بات کو بدل گئی۔

"وہ تو مجھے یقین ہے۔ تم لوٹ کر ادھر ہی آؤ گے۔ تمہاری دوائی کا ٹائم ہو گیا ہے۔" وہ گولیاں اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"پلیز ماہے! مجھے یہ رنگ برنگی گولیاں نہیں کھانا" وہ بدک کر دور ہٹ گیا۔ اب تو دوائیوں کی خوشبو دماغ میں سما گئی تھی۔ نام سنتے ہی ابکائی آنے لگتی۔

"آرام سے دوائی کھا لو۔ ورنہ آج بھوکا رہنا پڑے گا۔" وہ تو اپنے ہی دھیان میں گم تھی جب ارباب ایک دم پھر سے گویا ٹھٹک گیا۔ چہرے کی رنگت یک لخت متغیر ہوئی تھی۔ ایک بازگشت ہوا کے دوش پر لہرائی پھر سے سنائی دی تھی۔ وہ بمشکل سوچوں اور خیالوں سے پیچھا چھڑاتا ہوا بولا۔

"مجھے بھوکا رکھ کر کیوں گناہ گار ہوتی ہو۔ کیا تمہیں مہمانوں کے حقوق کے بارے میں نہیں پتا؟ ساری رات میری انتڑیاں تمہیں بد دعائیں دیں گی۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مہمان صرف تین دن کا ہوتا ہے۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

"اور تین دن کے بعد بلائے جان بن جاتا ہے۔" ارباب خوامخواہ اداس ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔

"جی نہیں، بلائے جان کیوں؟ اگر کوئی مہمان زیادہ عرصہ رہے تو وہ گھر کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ جیسے کہ تم!" اس نے فوراً اسے ٹوک دیا تھا۔ "اگر دل کا مہمان بن جائے تو پھر بھلا کیا بنتا ہے؟" ماہے کی آنکھیں ایک دم چمکنے لگیں۔

"تم....." وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

"تم ماہے! کیوں مجھے سب کی نظر میں گرا دینا چاہتی ہو؟ کیوں مجھے رسوا کرنا چاہتی ہو؟ اللہ کا واسطہ ہے نہیں۔ میں ایک زخمی دل کا مالک ہوں۔ مجھے مزید زخم نہ کرو۔" وہ گویا تھک کر رہ گیا۔

"مجھے تمہارا دل ہر حال میں قبول ہے۔"

"ماہے!" ارباب وحشت زدہ رہ گیا تھا۔ "تم فاتح کا دل دکھاؤ گی؟"

نجانے کتنا وقت ہو چکا تھا۔ باتوں کے دوران انہیں خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ رات آنگن میں اتر آئی تھی اور ماہے ابھی تک چھوٹی سی کاغذ کی پڑیا کو ہاتھ میں دبائے بیٹھی تھی۔ یوں ہی بے سبب نظر دروازے کی طرف اٹھی تھی۔ ارباب نے بھی اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ بس لمحہ بھر کو یوں محسوس ہوا تھا، گویا ایک سایہ ہو، جو چپکے سے دروازے کا کواڑ کھول کر باہر نکل گیا ہو۔

"گھر میں کوئی آیا تھا؟" ارباب اب ماہ کامل سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں مسافر تھا پلٹ گیا ہے۔" وہ مطمئن اور پرسکون تھی۔

"مگر کیوں؟" ارباب کچھ بے چین ہوا تھا۔

"یہ جگہ اس مسافر کی منزل نہیں تھی۔ وہ کسی اور کی منزل پر کیوں آ کر ٹھہرتا۔"

"میری ماں نے مجھے زہریلا دودھ نہیں پلایا تھا جو میں کسی مخلص کی محبت کو ڈس لوں۔ اپنے جذبوں کو لگام دو ماہ کامل! اپنے قدموں کو اسی مقام پر روک لو۔"

"ارباب! میری محبت کو یوں بے مول نہ کرو۔" وہ سسک اٹھی۔

ارباب کا دل چاہا، وہ یہاں سے دور بہت دور بھاگ جائے۔ یا اس آدم خور نہر میں چھلانگ لگا کر جان دے دے، جس نہر کا لقمہ بننے سے فاتح نے اسے بچا لیا تھا۔

"میں کیا کروں ارباب!" ماہ کامل جیسے ہار کر بولی۔ اس نے دل پر اترتی قیامت کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ پل صراط پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"مجھے بھول جاؤ۔ میں کسی کی بھی منزل نہیں بن سکتا، یہ سوچ کر صبر کر لینا کہ کسی ارباب کا کبھی تمہارے گھر کی دہلیز پر سے گزر نہیں ہوا تھا۔ اپنی زندگی کا آغاز کرنا۔ دل کی ہر چوٹ بھلا کر۔"

وہ گہری شام کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام ماہ کامل کے دل پر اتر آئی تھی۔

✡ ✡ ✡

رات بھر ہونے والی بارش نے موسم کی شدت کو کم کر دیا تھا۔ اب دھوپ میں اس قدر تپش نہیں رہی تھی۔ پرندے بھی خاصے خوشگوار موڈ میں گنگناتے پھر رہے تھے۔ آج پھر ایک کٹھ پھوڑا اپنی تیز دھار چونچ سے درخت کے تنے میں سوراخ کرنے کی کوشش میں بے حال ہو رہا تھا۔ تیتر اور بٹیر ایک ہی پنجرے میں رہائش پذیر تھے — آج کل دونوں میں پکی صلح چل رہی تھی۔

انار کی شاخوں کے ڈھیروں نازک پتے چڑیوں کے پھدکنے کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ کیاریوں میں بے شمار پھل اور پھول پتوں کا ڈھیر لگ چکا تھا۔

ماہ کامل نے سویرے سویرے چاٹی میں مدھانی لگا کر جھاڑو اٹھائی تھی۔ بے حد سلیقے سے پورا صحن صاف ہوتا جا رہا تھا۔

وہ جھاڑو اٹھا کر پتے سمیٹنے لگی تھی، جب دروازہ کھول کر نجانے کون چپکے سے اندر داخل ہوا تھا۔ ماہ کامل نے مڑ کر دیکھا تو پھر ٹھٹک کر رہ گئی۔

"تم..... اچانک بغیر بتائے؟" وہ بے ساختہ امڈنے والی خوشی کو چھپا کر بولی تھی۔

"میرا گھر ہے۔ جب چاہے آؤں۔ تمہیں اس سے کیا۔" فاتح کا لہجہ سخت کٹیلا اور اجنبی اجنبی سا تھا۔ وہ کچھ چونک کر فاتح کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں نے کب کہا، یہ تمہارا گھر نہیں۔" وہ بھی برا مان کر بولی تھی۔ "اتنی سویرے سویرے پہنچ گئے ہو نا۔ اسی لیے کچھ پوچھ لیا۔" اس نے گویا وضاحت کی تھی۔

"سویرے پہنچوں یا شام ڈھلے، تمہیں اس سے کیا غرض۔" فاتح کس قدر روکھا بول رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ بھلا آج تک فاتح نے کبھی اس سے

اتنے کٹھورپن سے بات ۔۔۔۔۔ کی تھی؟

"کیوں غرض نہیں۔" ہمیشہ کی طرح ماہ کامل بھڑک اٹھی۔ "کیا آج سے پہلے کبھی تمہارے لیے تردد نہیں کیا۔ ساری ساری رات جاگ جاگ کر پڑھتے تھے تم' اور ہر دس منٹ بعد تمہاری چائے کے لیے پکار اٹھتی تھی۔ بھلا اس وقت کون تردد کرتا تھا؟"

"تب تم صرف میری ماہے تھیں۔ مگر اب میری نہیں رہیں۔ اب تم مکمل چاند ہو ماہے!"

"فاتح....." ماہ کامل کا دل گویا اتھاہ گہرائیوں میں گرنے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فاتح اوائل عمر سے ہی اس کی محبت میں مبتلا رہا ہے اور صرف تین چار ماہ پہلے تک وہ بھی تو فاتح کی محبت پر دل ہی دل میں مسرور اور مغرور رہتی تھی۔

فاتح عتیق' جو اس کے پورے خاندان میں سب سے الگ اور سب سے جدا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر لڑکیاں ماہ کامل کے نصیب پر رشک کرتی تھیں۔ اگر بیچ میں ارباب نامی وہ اجنبی نہ آتا تو آج اس کی خوشیاں ہر لحاظ سے مکمل ہو جاتی تھیں۔

فاتح دو دن کی چھٹی کے لیے آیا تھا مگر سارا سارا دن گھر سے باہر ہی رہتا یا پھر ابا کے پاس دوکان میں بیٹھ جاتا تھا۔ ابا اور فاتح کے درمیان آج کل لمبی لمبی بحثیں ہو رہی تھیں۔ وہ دراصل ان دونوں کو لینے کے لیے آیا تھا مگر ابا تھے کہ مان ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ فاتح اور ماہ کامل کی شادی کر دیں' پھر ماہ کو بے شک فاتح اپنے ساتھ لے جائے۔

"پتر! ایک تناور درخت کی جڑوں کو کاٹ دیا جائے تو وہ کب تک ہرا بھرا رہ سکے گا۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ میں اپنے لوگوں میں مطمئن ہوں۔" وہ ہل کے پھلکے کو جوڑ لگانے میں مصروف تھے۔

"اور میں بھی تو شہر میں غیر مطمئن ہوں نا..... ہر وقت آپ کی اور ماہے کی فکر لگی رہتی ہے۔" عجیب سا اضطراب اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

"تو پتر! اپنی اس فکر کو دور کر لو نا۔" اب وہ پیچ کس سے زنگ آلود بھاری پیچ کو پورے زور کے ساتھ فٹ کر کے لگا رہے تھے۔ ان کا پورا وجود پسینہ پسینہ تھا۔

"بھلا کیسے کر لوں؟ آپ مانتے بھی تو نہیں۔" وہ کچی زمین کو جوتے کی ٹوہ سے کھرچ رہا تھا۔ وہ شہر جانے کے لیے رضامند نہیں تھے۔ سو وہ اسی حساب سے کہہ رہا تھا۔

"نہ ماننے والی بھلا کیا بات ہوئی۔" ان کی آنکھوں میں بڑے مشفق سے رنگ ابھرے۔ "نئے چاند کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" فاتح کچھ حیران ہوا۔

"میں تمہارا چاچا ہی نہیں' باپ بھی تو ہوں۔ لڑکے کی طرف کے معاملات بھی تو خود ہی دیکھتے ہیں۔" انہوں نے مونڈھے پر رکھے صافے سے چہرہ اور ہاتھ پونچھے۔

"چاچا جی! ایک بات کہنا تھی۔" وہ ایک دم سے بے قرار سا ہو گیا۔

"بولو پتر.....!" وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر لوہے کے پایوں والے پیڑھے پر بیٹھ گئے تھے۔

"چاچا! اگر آپ ایک دفعہ پھر سے ماہے سے پوچھ لیں تو کیا یہ بہتر نہیں؟" اس نے بہت جھجکتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

"ماہے سے کیا پوچھنا..... بات تو طے ہے۔ بس سادگی سے نکاح کریں گے۔" وہ گویا سب کچھ طے کر چکے تھے۔ وہ جو چائے کی پیالیاں اٹھائے دوکان کی طرف آ رہی تھی' ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

"پھر بھی چاچا جی! ایک دفعہ آپ پوچھ تو لیں..... کیا پتا' اسے میرا ساتھ منظور نہ ہو۔" فاتح نے عجیب سے سلگتے لہجے میں کہا تھا۔ ماہے کا پورا وجود گویا سنسنا اٹھا۔

"نہ پتر! ہماری اولاد نافرمان نہیں ہے۔ تم اور ماہے تو میرا مان ہو۔ تمہیں کیا ماہے کی طرف سے کوئی غلط فہمی لاحق ہوئی ہے؟" ان کی زیرک نظریں فاتح کے اردگرد گھوم رہی تھیں۔ فاتح اپنے اندرونی تاثرات چھپا گیا تھا۔

"ایسی بات نہیں۔" وہ بھلا ان سے کس انداز میں اپنے خدشات کا اظہار کر سکتا تھا۔

اور ادھر ماہ کامل گویا سن کھڑی رہ گئی تھی۔

"تم اور ماہے میرا مان ہو اور مجھے یقین ہے کہ میرے بچے میرا مان ہرگز نہیں توڑیں گے۔" ابا کی آواز اس کے کانوں میں ہی نہیں' اس کے دل و دماغ میں گویا کھب کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گلابی سی سلونی سلونی شام کا منظر تھا۔ ماہ کامل صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد چارپائیاں بچھا رہی تھی۔ جب ارباب کمرے سے باہر نکلا۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ ماہ کامل اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے غیر ارادتاً" ہی پوچھ لیا تھا۔

"واپس۔" وہ مختصر بولا۔

"اتنی جلدی؟" آن کی آن میں مایوسیوں کے بادل اس کے اردگرد چھا گئے تھے۔ "واپس آ جاؤ گے؟"

"نہیں۔" اس کا انداز اجڑا اجڑا عجیب قسم کا تھا۔

"میری محبت کی خاطر بھی نہیں؟"

"محبت۔" وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ "محبت۔ بھلا کیسی محبت! وقتی انسیت یا ہمدردی کو محبت کا نام مت دو۔ محبت دھیرے دھیرے' لمحہ بہ لمحہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ پانی کے اوپر موجود جھاگ جیسی محبت' محبت نہیں' بلکہ وقتی کشش ہوتی ہے۔"

"تو پھر تم ہی بتا دو' محبت کیا ہے؟" وہ سلگ کر بول اٹھی۔

"محبت وہ ہے' جو فاتح عتیق نے تم سے کی ہے بے لوث' بغیر کسی صلے کے۔ یاد رکھنا ماہ کامل! جو ہاتھ آئی نعمت کو ٹھکرا دیتا ہے' وہ کبھی بامراد نہیں ہو سکتا۔"

"محبت نے تمہیں بامراد کیوں نہیں کیا؟" اس کے چہرے کا کرب ماہ کامل کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

"محبت نے تو مجھے بامراد کیا تھا' مجھے میرے اپنوں نے نامراد کیا ہے۔ مگر وہ اپنے تھے کہاں؟" اس کے اندر گویا آگ کے بھانبھڑ جل اٹھے۔

"تم کون ہو ارباب!" اب وہ بہت نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ شاید پانی کے اوپر اٹھی جھاگ منتشر ہو کر بیٹھنے کے قریب تھی یا پھر وہ اس کے چلے جانے کی حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی۔ مگر جو بھی تھا۔ دل عجیب سی خاموشی کی بکل میں دبک کر رہ گیا تھا۔

"میں مبرم ارباب نیازی ہوں..... ایک زخم خوردہ انسان۔ جتنے زخم میرے وجود پر دیکھ کر تمہیں مجھ سے ہمدردی نما محبت ہو گئی تھی۔ اتنے ہی گھاؤ میرے دل پر لگے ہیں۔ میرے ہر زخم کے پیچھے ایک داستان ہے۔ مگر ایسے تم بات کو کیسے سمجھو گی۔ چلو' تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔ ایک تھا مبرم اور ایک تھی ویرا۔ مبرم اور ویرا کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تھی۔ پھر پتا ہے کیا ہوا؟"

وہ دھیرے دھیرے ایک ایک پرت کو کھول رہا تھا۔ ماہ کامل ہمہ تن گوش تھی۔ اس داستان کو سننے کے لیے تو وہ کب سے بے چین تھی۔ منتظر تھی۔

"میں یعنی مبرم ارباب نجانے کب سے ویرا کا اسیر تھا۔ شاید اس وقت سے جب پہلے پہل میں نے ویرا کو بابا جی کے گھر میں دیکھا تھا..... اس کی ذہانت' اس کا اعتماد مجھے ہمیشہ متاثر کرتا تھا اور میں اس کے متاثرین میں سر فہرست تھا۔"

مبرم نے اسے اپنی اور ویرا کی ساری کہانی سنائی تھی اور کہانی کے اس موڑ پر اس کی آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے۔

"ویرا نے میری زندگی کو ہر رنگ سے سجا دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی ہمراہی میں بہت خوش تھے۔ مگر کچھ لوگ ہمیں خوش دیکھ کر خوش نہیں تھے۔ بابا جی کی وفات کے بعد پتا چلا کہ وہ ویرا کے نام کیا کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔

بابا جی کا وہ گھر جسے وہ ہمیشہ کرائے کا گھر کہتے رہے تھے۔ کروڑوں کی مالیت کا تھا۔ بے شمار بینک بیلنس اور زیورات تھے' مگر ویرا ان باتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔

پھر ایک رات اماں نے مجھے بتایا تھا کہ ابو گوشی کی شادی کہیں اور طے کر رہے ہیں۔ اماں نے مجھ سے

کہا۔ میں گھر چھوڑ دوں اور گوشی کو بھی ساتھ لے جاؤں۔

میں ویرا اور گوشی... ہم رات کے اندھیرے میں گھر چھوڑ آئے تھے۔ ہمارا پہلا ٹھکانہ ماموں کا گھر تھا۔ یہیں گوشی اور اویس کا نکاح بھی ہو گیا تھا اور اس سے تین ماہ بعد مجھے خبر ملی کہ میری بہنیں ثمرہ اور ثمن، سمانہ کے بھی نکاح ہو گئے ہیں۔ ابو نے "آناً فاناً" انہیں رخصت کر دیا تھا۔

اماں بھی شاید بیٹیوں کی رخصتی تک کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایک رات گھر میں اچانک آگ لگنے سے وہ بری طرح جھلس کر ختم ہو گئیں۔ ان کا چہرہ، جسم خاک ہو گیا تھا۔

ابو نے مجھے اماں کی چارپائی کو کاندھا بھی نہیں دینے دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجھے نماز جنازہ بھی نہیں پڑھنے دی۔

ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ غم کی شدت سے میرا دل پھٹ جائے گا۔ اگر ویرا نہ ہوتی تو شاید میں مر ہی جاتا۔ یہ ویرا کا حوصلہ اور ہمت تھی کہ وہ بھری پنچائیت اور فاتحہ کی مجلس میں ابو کے گریبان تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے کئی برادریوں کے لوگوں کے سامنے ابو کے چہرے کو بے نقاب کر دیا تھا۔

"یہ باپ نہیں ایک ناگ ہے۔ جو اپنی اولاد کو خود پیدا کرتا ہے اور خود ہی ڈس لیتا ہے۔ میں نہیں مانتی کہ یہ مبرم کا باپ ہو سکتا ہے۔ کوئی باپ اتنا ظالم اور خود غرض نہیں ہو سکتا کہ اپنی "میں" کو بچانے کی خاطر اولاد کے سینے کو چھلنی کر دے۔ یہ آدم خور ہے۔ یہ ظالم اور جابر ہے یہ آدمی خود غرض اور لالچی ہے۔ پہلے اپنے سگے بھائی کو نگل گیا، پھر بیوی اور اب اکلوتے بیٹے کو مار دینے کے چکر میں ہے۔"

ویرا کے الفاظ نے ایک نہ ختم ہونے والی اور نہ بجھنے والی آگ کو بھڑکا دیا تھا اوپر سے ویرا کا ایک اور فیصلہ۔

"ہم اسی گھر میں رہیں گے۔ اس گھر میں میرا بھی حصہ ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" وہ ابو کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بے خوف اور نڈر تھی۔

ابو کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر سمانہ نے ویرا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تم بھایا کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ ویرا! تم دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔ تم ابو کو نہیں جانتیں۔ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے وہ ہر حد سے گزر جائیں گے۔"

"بزدلوں کی طرح کیوں بھاگ جائیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ ابھی تو منشی اور پٹواری کو بلوایا ہے میں نے... پرانی فائلیں اور کاغذ کھلیں گے۔ دادا جی کی وصیت بھی پڑھوں گی تاکہ مجھے بھی پتا چل سکے کہ میرے اور مبرم کے نام کیا کچھ ہے؟" اس کا فیصلہ گویا اٹل تھا اور میں بھی اگرچہ اس کا ہمنوا ضرور تھا مگر فی الحال اس گھٹن سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر ویرا میری کوئی بات نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تم کولڈ سٹور کے لیے جو مشینری لے کر آنا چاہتے ہو۔ لے آؤ میں اتنے دن تک یہیں رہوں گی۔" مجھے کراچی تو جانا ہی تھا۔ سو میں اگلے دن ہی چلا بھی گیا۔ اسی رات ڈیڑھ بجے ویرا نے مجھے بتایا تھا کہ ابو اپنی دوسری بیوی اور بچوں کو گھر لے آئے ہیں۔

یہاں سے ایک اور تلخ ترین دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ ویرا اور نگینہ دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پائی تھیں۔ نگینہ نے آتے کے ساتھ ہی پورے گھر پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔

سمانہ اور ثمرہ کے میکے آنے پر پابندی لگ گئی تھی۔ نگینہ نہیں چاہتی تھی کہ ویرا کے ساتھ کسی کا بھی کوئی تعلق قائم ہو سکے اور نہ ہی کوئی ویرا سے مل پائے۔

پھر ایک دن منشی اسلم نے نجانے کیسے اور کس طرح سے ویرا کو پیغام دے کر گھر سے باہر ملنے کے لیے کہا تھا۔ منشی اسلم اسے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ کوئی خاص بات یا راز۔

یہاں ویرا نے ایک غلطی کی تھی۔ وہ بغیر مجھے بتائے یا میرا انتظار کیے، منشی اسلم کی بات سننے چلی گئی تھی اور پھر کبھی واپس نہیں آئی۔"

مبرم کی آنکھ سے کئی ستارے ٹوٹ کے بکھر گئے تھے۔ وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ تبھی تو ماہ کامل بے چین ہو کر بول اٹھی۔

"پھر کیا ہوا ارباب!"

اس کے دکھ نے ماہے کے دل پر گویا پنجہ مار دیا تھا۔ ایک دم ویرا اور مبرم کی جدائی نے اسے سراپا آنسو بنا دیا۔ اس کے دل میں وہ ہی ہمدردی ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی جسے وہ محبت کا نام دے چکی تھی مگر وہ سچ مچ ہمدردی تھی۔ انسانیت کے درد میں لپٹی محبت۔ وہ جو تیتر اور بٹیر کو زخمی حالت میں دیکھ کر سینے سے لگائے گھر لے آتی تھی۔

"ویرا کی گمشدگی کی اطلاع سنتے ہی میں واپس آ گیا۔ بار بار اسے ڈھونڈتا رہا۔ ہر جگہ، ہر سو پاگلوں کی طرح۔ مگر کہیں اس کا نشان نہیں ملا تھا اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا۔ پورے گاؤں میں ویرا کے بھاگ جانے کی خبر نشر ہو گئی تھی۔" وہ گویا تھک کر ٹوٹ گیا تھا۔

"مگر وہ بھاگی کس کے ساتھ؟ یہ تو سراسر ایک جھوٹی کہانی لگتی ہے۔ تم نے تحقیق کیوں نہیں کی اور وہ منشی اسلم کہاں گیا؟" مبرم کے خاموش ہوتے ہی ماہ کامل بے قراری سے گویا ہوئی۔

"پورے نو مہینے ہو چکے ہیں۔ جگہ جگہ اسے ڈھونڈ رہا ہوں مگر منشی اسلم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ منشی اسلم اسی گاؤں میں رہائش پذیر ہے۔ میرا انتقام مجھے یہاں لے آیا تھا۔ مگر یہاں آنا بھی بے سود رہا ہے۔ میں منشی اسلم کو کتے کی موت مارنا چاہتا تھا...."

"بے سود نہیں، میرے دوست! منشی اسلم کے بارے میں تمہیں میں بتاتا ہوں۔" فاتح نجانے کب اس کے برابر آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کا دباؤ مبرم نے اپنے کندھے پر محسوس کر کے ذرا سا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"تم کیسے جانتے ہو منشی اسلم کو؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ یہاں ایک بابا جی ہوا کرتے تھے۔ ذات کے میراثی تھے۔ شادی بیاہ میں گیت گاتے اور دف بجاتے تھے۔ ان ہی سے میں نے بانسری بجانا سیکھی تھی۔ وہ بابا جی منشی اسلم کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بہت عرصہ نیاز پور کے زمیندار ارباب نیازی کی زمینوں کے منشی رہے تھے۔ پھر ان کے مر جانے کے بعد واپس اپنے آبائی گاؤں یعنی یہاں آ گئے تھے۔" فاتح نے مبرم کو حیران ہی تو کر دیا تھا۔

"ارباب نیازی؟" وہ الجھ کر رہ گیا۔

"نیاز پور کے ایک جاگیردار تھے۔" فاتح شاید ارباب نیازی کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا۔

"منشی اسلم اگر مر چکے ہیں تو پھر ویرا کا بھلا کیسے پتا چلے گا۔ میں نے جو منشی کو ڈھونڈنے کے لیے اتنی ریاضت کی تھی، سب رائیگاں چلی گئی؟" مبرم کو یوں محسوس ہونے لگا تھا۔ گویا وہ کسی بھاری بوجھ کے نیچے دبا کر رہ گیا ہے۔

"ویرا کا پتا چل گیا ہے میرے دوست! تم فکر مت کرو۔ جس کام میں فاتح عقیق ہاتھ ڈال لے اسے پورا کر کے ہی دم لیتا ہے۔" اس کا ہاتھ ابھی تک مبرم کے کندھے پر تھا۔ مبرم اب کے پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"تم ان دنوں کہاں تعینات ہو؟"

"میں تمہارے علاقے کی تحصیل کا ایس پی ہوں۔ یہ چند دن پہلے کی بات ہے۔ جب مجھے ایک فون کال موصول ہوئی تھی۔ یہ کال نیاز پور کے کھاتے پیتے گھرانے کی ایک عورت نے کی تھی۔ اس عورت کا نام نگینہ تھا اور وہ اپنے شوہر پر کچھ الزامات لگا رہی تھی۔ نگینہ نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ذہنی مریض ہے۔ وہ اس کی بیٹیوں پر شدید قسم کا تشدد کرتا ہے اور نگینہ کو بھی زدوکوب کیا جاتا ہے۔ سو وہ قانون سے تحفظ چاہتی تھی کہ اس کی جان کو شدید قسم کا خطرہ لاحق تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس عورت نے دوبارہ کال کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس گھر میں وہ قیام پذیر ہے، اس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ بنایا گیا ہے، جہاں

سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔ یہ تہہ خانہ بہت قدیم دور کا بنا ہوا ہے اور اس کے دروازے بہت بھاری اور دیمک زدہ ہیں۔ میں نے فوری ایکشن لے کر وہاں چھاپہ مارا تھا۔ وہاں ایک نہیں دو عورتیں قید تھیں۔"

فاتح جو بتا رہا تھا۔ مبرم کا دماغ گویا بھک سے اڑ گیا۔

"دو عورتیں؟" اس کے لبوں سے سرسراہٹ نما آواز نکلی۔

"ہاں' دو عورتیں..... ایک تمہاری ماں میراں بیگم اور دوسری عورت تمہاری بیوی۔"

☼ ☼ ☼

پورے نو ماہ بعد وہ اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ مبرم کا دل گویا بھر بھر آرہا تھا اور ویرا کے آنسوؤں کا سیلاب اسے بہائے لے جا رہا تھا۔

"بس کرو' میری جان!" مبرم نے بمشکل اسے چپ کروایا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ماموں کے گھر میں تھا۔ اویس اور گوشی اماں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی ذہنی حالت بھی بے حد ابتر تھی۔ پورے نو ماہ ایک تاریک کمرے کی قید میں گزارے تھے۔ ابھی تک تو وہ چہروں اور آوازوں سے بھی مانوس نہیں ہو پا رہی تھیں۔ بس روئے چلی جا رہی تھیں۔

"اگر ویرا نہ ہوتی میرے ساتھ تو میری لاش تک گل سڑ جاتی تھی۔ گھٹ گھٹ کر مر جاتا تھا میں نے۔ ویرا کے حوصلے اور ہمت نے مجھے زندگی بخشی ہوئی تھی۔ ورنہ میں کب کی آنکھیں موند چکی ہوتی۔"

گوشی اور اویس انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اب قدرے ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔

ویرا اور مبرم اس وقت تنہا تھے۔ وہ تنہائی میں مبرم کو بہت کچھ بتانا چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ جو منشی اسلم نے اسے بتا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے قید میں ڈال دیا گیا..... اور منشی کو دھمکیاں دے کر اس کا منہ بند کروا دیا گیا۔ وہ مبرم کے بازو پر سر رکھے بولنے لگی۔

"میں کبھی بھی اس راز سے پردہ نہ اٹھاتی جسے آج تک چاچی بھی تمہیں بتانے کا حوصلہ نہیں پا سکیں۔"

وہ بہت سوچ سوچ کر اور تول تول کر بول رہی تھی۔

"ایسی کیا بات ہے۔"

"پاپا اور چاچا جی سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے۔ شاید یہ فرق تعلیم کی وجہ سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ چاچو ان پڑھ تھے اور پاپا اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دیکھا جائے تو پاپا کی پرسنالٹی چاچو کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی ہر کوئی پاپا کا شیدائی تھا۔

انہی میں میری امی وجیہہ بھی شامل تھیں۔ چونکہ پاپا اور امی دونوں آپس میں کزنز بھی تھے۔ سو ان کے درمیان خاصی بے تکلفی بھی قائم ہو گئی تھی۔ پاپا اور امی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ چاچا کی بھی خواہش تھی کہ وہ امی سے شادی کر لیں مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ امی اور پاپا کی شادی ہو گئی تھی اور شادی کے بعد پاپا کی پریکٹس بھی خوب چل پڑی۔ یوں سمجھو پاپا کے لیے کامیابیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔

پاپا کی خوشحال زندگی چاچو کو ہمیشہ حسد میں مبتلا کر دیتی تھی۔ چاچو پاپا کی برابری کرنا چاہتے تھے مگر ایسا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

بعض لوگ فطرتاً" حاسد ہوتے ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں تک سے جلنے لگتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ چیز کو چھین لینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ چاچو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ تھا۔ وہ خوب صورت تھے اور بچپن میں والدین سے بے تحاشا محبت وصول کرتے رہے تھے۔ چاچو کے مقابلے میں پاپا کو ذرا کم ہی اہمیت ملتی تھی۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ پاپا اپنی اچھی عادت اور ذہانت کی وجہ سے سب کے دلوں کو تسخیر کرتے رہے۔ جبکہ چاچو کہیں پس پردہ چلے گئے۔ یہیں سے ان کی ذہنی تباہی کی ابتدا ہوئی تھی۔

پاپا کی شادی کے بعد چاچو اور بھی ان سے متنفر ہو گئے تھے۔ مگر اپنی منافقانہ فطرت کی وجہ سے انہوں نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

چاچو کے پاس تعلیم تو تھی نہیں اور پیسہ بھی خاص



کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے حصے کی زمین بیچ کر کاروبار شروع کیا مگر کاروبار میں سارا پیسہ ضائع ہو گیا۔

مالی حالات جب بے حد خراب ہو گئے تب دادا نے اپنے بھتیجے ارباب کی بیوہ سے ان کی مرضی کے بغیر ہی چاچا کی شادی کر دی۔ وہ میراں بیگم سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر باپ کے سامنے بے بس ہو گئے۔

میراں بیگم اپنے ساتھ جہیز میں اپنے پہلے شوہر کی بے شمار جائیداد کے ساتھ ایک بیٹا بھی لائی تھیں۔

ان جاگیروں اور زمینوں کو حاصل کر کے وقتی طور پر چاچو بہل گئے تھے مگر دل ہی دل میں نفرت کا ناسور پلتا رہا تھا۔

بابا اور امی سے نفرت، چاچی سے نفرت، اپنی تینوں بیٹیوں سے بیزاری کے ساتھ ساتھ مبرم ارباب نیازی سے بھی ان کی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

وہ ہر صورت میں تمہیں دبائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ کبھی بھی تم جان نہ سکو کہ یہ تمام جائیداد تمہارے حقیقی باپ کی ہے۔ وہ تمہاری خواہشوں اور تمناؤں کو کچل کر اپنے جیسا بنا دینا چاہتے تھے۔ نجانے یہ انتقام کی کون سی قسم تھی۔ مگر جب ان کی پلاننگ ناکام ہو گئی۔ بابا نے ہمارا نکاح کر دیا تو وہ مزید مشتعل ہو گئے۔ جس حکمرانی کی انہیں عادت ہو چکی تھی اور جس رعایا پر وہ حکومت کر رہے تھے۔ اس کی بغاوت نے انہیں بہت گہری چوٹ لگا دی تھی۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ تمہاری نہ تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی گوشی سے۔ ان کا بنیادی مقصد صرف میری اور گوشی کی جائیداد حاصل کرنا تھا۔

بابا کے بعد میری جائیداد کے سارے کاغذات ان کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب وہ اپنی دوسری پلاننگ پر غور کر رہے تھے، یعنی تمہاری دوسری شادی گوشی سے کروانا چاہتے تھے۔ یہاں پھر سے انہیں مات ہوئی تھی۔ گوشی کا نکاح تمہارے توسط سے اویس سے کیا ہوا، ان کے اندر شعلے بھڑک اٹھے۔ وہ ہر صورت تم سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔

چاچو کو جب میراں چاچی سے خدشہ لاحق ہو گیا کہ یہ تمہیں کچھ بتا نہ دیں تو انہوں نے چاچی کو تہہ خانے میں ڈال دیا۔ اور ان کے کمرے میں آگ لگا کر ان کی موت کی خبر پھیلا دی۔ نہ جانے کون بدنصیب تھی جوان کے اس ظلم کا نشانہ بنی۔ اسی دوران میرا منشی سے رابطہ ہو گیا تھا۔ منشی نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ تمہاری زمین، جائیداد اور اثاثے...... میرے اندر اس دھوکے اور فریب کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میری جلد بازی چاچو کو چوکنا کر گئی۔ انہوں نے چاچی کو لوگوں کی نظروں میں مار دینے کے بعد مجھے بھی قید خانے میں ڈال کر ہر طرف نشر کروا دیا کہ میں بھاگ گئی ہوں۔

ان نو مہینوں میں بے تحاشا غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ چاچا ذہنی بیماری کا شکار تھے۔ حسد کے جذبے نے کبھی انہیں مطمئن نہیں رہنے دیا تھا۔ دوسروں کی خوشیوں سے جل جل کر وہ اپنے گھر کو آگ لگاتے رہے تھے۔

دوسری شادی بھی انہیں آسودہ حال نہیں کر سکی تھی۔ دراصل وہ مطمئن ہو جانے والے لوگوں میں سے تھے ہی نہیں۔ حسد، بغض اور نفرت نے انہیں اپنے تمام اپنوں سے دور کر دیا ہے۔

آج عزیز نیازی ڈیرے کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ نگینہ ان کی ذہنی حالت کے پیش نظر گھر کے دروازے ان کے لیے کبھی نہیں کھولتی۔ ملازمین ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ چھ بچوں میں سے کسی کے پاس فرصت نہیں ہے کہ وہ دو گھڑی کے لیے ہی سہی باپ کو دیکھ آئیں۔"

"اس تمام داستان میں قابل غور اور باعث مسرت چیز، تمہیں پتا ہے کیا ہے؟" وہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو چوم رہا تھا۔

"نہیں پتا۔" وہ اس کی پیش قدمی پر قدرے بدکی۔ اتنی سنجیدہ گفتگو کے اختتام پر مبرم کے موڈ کی شگفتگی ویرا کو مصنوعی ناراضی کے اظہار پر مجبور کر گئی۔

"ہمارا ملن...... یوں لگتا ہے۔ آج ہی شب عروس ہے۔ دیکھو تو ستاروں کی بارات اتر آئی ہے۔ گیتوں کی دھنیں سنائی دے رہی ہیں...... اور کہیں دور بہت دور ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھت پر بیٹھا فاتح عتیق بانسری بجا رہا ہے اور اس کے قریب ماہ کامل کھڑی ہے۔ کچھ روٹھی روٹھی سی۔ بانسری کی آواز نے اسے کچی نیند سے جگا دیا ہے نا...... مگر فاتح عتیق آج ماہ کامل کی بات پر توجہ نہیں دے رہا۔ آج وہ ہم دونوں کے لیے ملن کا کوئی سر، کوئی گیت، کوئی دھن چھیڑ رہا ہے۔ دیکھو تو ویرا! خوشبو کی کلیاں جابجا بکھر گئی ہیں۔ سرخ گلابوں کے موسم خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ گلابی شامیں سایہ فگن ہیں۔ آؤ، دریچہ کھول کر جدائیوں کی اس گھٹن کو باہر نکال دیتے ہیں اور کیا آج ہم پر لازم نہیں کہ سجدہ شکر بجا لائیں۔"

وہ اس کے ہاتھ تھامے کھڑا ہو گیا تھا۔ ویرا نے اس کی تقلید میں قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ سجدہ شکر تو ان پر واجب تھا ہی اور اپنے ملن کی خوشیوں میں وہ کسی اور کے ملن کی دعا کرنا نہیں بھولے تھے۔ کیونکہ خلوص، ایثار، پیار اور محبت کا یہی تقاضا تھا۔ ماہ کامل کی خدمت، مہربانی اور ہمدردی میں لپٹی وہ محبت اور فاتح عتیق کے خلوص اور ایثار نے مبرم ارباب کو خلوص اور محبت کی ایک مالا میں پرو دیا تھا۔

اور آج پورے تین مہینے بعد وہ سب ماہ کامل اور فاتح عتیق کی شادی میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے۔

میراں بیگم، اویس، گوشی اور اس کی تینوں بہنیں...... اور جب مبرم نے ایک خوب صورت موتیوں کی تھیلی کے منہ کو کھول کر ماہ کامل کی جھولی میں کچھ ڈالنا شروع کیا تو وہ دلہناپے کی پروا کیے بغیر چیخ اٹھی۔

"ارباب! یہ چیٹنگ ہے۔ ہماری محبت اور خلوص کو واپس لوٹانا چاہتے ہو۔ وہ نہ قرض تھا نہ ادھار۔" اس کی ناراضی کے جواب میں مبرم مسکرا دیا تھا۔

"یہ نہ قرض ہے نا ادھار۔" اس نے ساری تھیلی کو اس کی جھولی میں الٹ دیا۔

"اس میں شامل ہے ہمارا ڈھیر سارا پیار۔ اس بے حد پیاری لڑکی کے لیے، جسے ہر زخمی انسان سے محبت ہو جاتی ہے۔" ویرا اس کے برابر بیٹھ رہی تھی۔

"اور اس محبت کا خمیازہ مجھ مسکین کو بھگتنا پڑتا ہے۔" فاتح نے چہرے پر مصنوعی مسکینی طاری کر کے دہائی دی اور پوری محفل میں گویا ہنسی کے شگوفے کھل اٹھے تھے۔ رنگ و نور کی اس محفل میں ویرا اور مبرم نے ان دونوں کے لیے ڈھیر ساری خوشیوں کی دعا کی تھی اور آسمان کے سب سے روشن ستارے نے گویا ان کی ہاں میں ہاں ملا کر صدق دل سے آمین کہا۔

✡ ✡ ✡

ادھر مبرم ارباب نیاز پور کی زمینوں پر ہمیشہ کی طرح مضبوط قدموں سے چلتا تھا۔ مگر اس کی چال میں اور قدموں کی دھمک میں تکبر کی جھلک تک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ عام لوگوں کی بیٹھک میں بیٹھ کر ان کے مسائل سنتا تھا۔ ان کی پریشانیوں کو حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان کے لیے روزگار مہیا کرنے کے لیے ایک اور فروٹ فارم تعمیر کروا رہا تھا۔

وہ چاہتا تو بڑے طریقے کے ساتھ ان کی ہر زیادتی کا بدلہ عزیز نیازی کی حقیقی اولاد سے لے سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

وہ چاہتا تو نگینہ اور اس کے بچوں کو جائیداد سے بھی بے دخل کر سکتا تھا۔ یہی سمجھتے ہوئے کہ عزیز نیازی ان پر جو کچھ لٹا چکے ہیں، بس وہ ہی کافی ہے، مگر اس کے باوجود اس نے تحمل، صبر اور رحم کو دل سے جانے نہیں دیا۔

اپنے ذاتی اثاثوں کی تقسیم کی اور عزیز نیازی کی اولادوں کو بھی زمین کے کچھ حصے کا حق دار بنایا۔

مبرم نے عزیز نیازی کو نہ معاف کیا تھا نہ سزا سنائی۔ ان کے لیے یہی سزا کافی تھی کہ وہ اپنوں کے سامنے بے نقاب ہو گئے تھے اور اس سزا کا کوئی اختتام بھی نہیں تھا۔

ویرا اور اس نے اپنے لیے محبت بھرے ایک گھر کی بنیاد رکھی تھی۔

اپنی جنت میں مگن وہ کبھی کبھی نیاز پور کے اس حاکم کے بارے میں بے اختیار سوچنے لگتا تھا، جسے ایک گھر اور ایک نسل کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ بنایا گیا تھا، مگر اس نے وقتی لالچ اور خود غرضی کی بنا پر اپنے لیے ان دیکھی آگ خریدی تھی۔

✡

طوُرسینا

دُکھ کا آہنگ

اسے ساحل سمندر پر چلتی کھلے بالوں والی لڑکی، لڑکی اور مجھے اشوک کا درخت لگ رہی تھی، جس کی نمایاں قامت پر ہوا اس کے بالوں سے ایسے ہی کھیل رہی تھی جیسے وہ اشوک کے پتے ہوں۔

"کتنی خوب صورت لڑکی ہے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہوں۔" اس نے ہوں پر ہی اکتفا کیا۔ یوں بھی علی امیر کو بولنے کا شوق نہ تھا۔ وہ اکثر پڑھنے میں ہی مگن رہتا تھا۔ کتابیں، چہرے، رویے اور نظریات۔

"کتنا خشک مزاج دوست ہے میرا۔" مجھے اپنے آپ سے ہمدردی ہونے لگی۔

واپسی پر گاڑی میں نے اس گاڑی کے راستے پر ڈال دی، جس میں وہ لڑکی تھی۔ بے شک یہ ایک غیر شریفانہ فعل تھا، مگر ستائیس سالہ زندگی میں، پہلی لڑکی تھی، جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا اور اس کا پیچھا کرنے پر علی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اس لیے کہ اسے اطمینان تھا کہ وہ لڑکی اکیلی نہیں تھی۔ کامیاب تعاقب کے بعد علی امیر کو اس کے گھر چھوڑ کر میں اپنے گھر آگیا۔

چند ماہ بعد ہی اشوک لڑکی جس کا نام غزل تھا، میری بیوی بن کر میرے گھر آگئی اور دو سال بعد نین غزالی کی ماں بھی بن گئی۔

پھر چھوٹے چھوٹے اختلافات، جھگڑوں اور نفرتوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگے، جن سے اماں مجھے آگاہ کرتی رہتی تھیں، جبکہ غزل ہمیشہ چپ سادھے رہتی۔ شاید یہ میری اس دھمکی کا نتیجہ تھا جو میں نے اسے انتہائی اقدام کی دے رکھی تھی۔ محبت کا خمار وقت کی گرد سے ڈھک گیا تو آخر میں نے انتہائی قدم اٹھا لیا۔

"علی! میں نے ٹھیک کیا؟" غزل ماں کی طبیعت خرابی کے باعث میکے میں تھی، میں طلاق کے کاغذات اسے بھیج کر علی کے پاس چلا آیا تھا۔

"غزالی! تم کیا چاہتے ہو؟" علی امیر کے لباس کی طرح اس کی پیشانی بھی پر شکن ہو گئی۔ "میرے خیال میں اس سے زیادہ برا نہیں کیا جا سکتا کسی کے ساتھ۔"

"وہ روز اماں سے لڑتی تھی، روز گالی گلوچ، اس نے ان پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔" میں صفائی دے رہا تھا، وہ سن رہا تھا۔

"یہ کام اگر اماں اس کے ساتھ کرتیں تو پھر تم کیا کرتے؟" وہ پہلی بار سوال جواب کر رہا تھا۔ "تم نے غزل سے کچھ پوچھا تھا کبھی؟ کیا وہ ایسا کرتی ہے؟ یا کرتی ہے تو کیوں کرتی ہے؟" اس کے استفسار پر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیسے مرد ہو تم؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "چار جھگڑوں کی وجہ سے طلاق دے دی، جبکہ تم جانتے بھی نہیں کہ قصور کس کا تھا۔"

"پھر میں کیا کرتا؟"

"غزل سے پوچھتے۔ اماں سے بات کرتے۔ ایسے مسئلہ حل نہ ہوتا تو دونوں کی سننا چھوڑ دیتے، خود ہی مسئلہ حل ہو جاتا۔" اس کا لہجہ ملامتی تھا۔

"اماں پر ظلم ہونے دیتا؟"

"یہ ظلم نہیں ہوتا، تمہیں زنانہ سیاست کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ بھی تو تمہاری بیٹی کی ماں تھی۔ رشتے بن جائیں تو ان کو توڑا نہیں جاتا، ان کے لیے جھکا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔" پہلی بار وہ اتنا بولا تھا۔

"اگر وہ غلط بھی تھی تو انسانیت کے ناتے اس سلوک کی مستحق نہیں تھی اور اگر تمہاری اماں غلط ہوتیں تو وہ بھی گھر سے نکالے جانے کی مستحق نہ ہوتیں۔ تم رشتوں میں توازن رکھتے، غلط صحیح کے فیصلے نہ دیتے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں متذبذب ہی لوٹ آیا۔

میرے اس قدم سے اماں کے دل پر بہت بوجھ آگیا۔ تب ہی انہوں نے اپنے قصور وار ہونے اور دروغ گوئی کا اقرار کر کے مجھ سے معافی مانگ لی۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، وہ اشوک لڑکی میری زندگی سے نکل چکی تھی۔

پھر میرا تبادلہ بیرون ملک ہو گیا، جہاں ایک برس قیام کے بعد میں واپس وطن پہنچا تو علی امیر اور غزل کی شادی کی خبر میری منتظر تھی۔ وہ علی امیر جو میرے ساتھ محلے میں کھیلا کرتا تھا اور جس کے اندر گہری چپ اتری ہوئی تھی۔

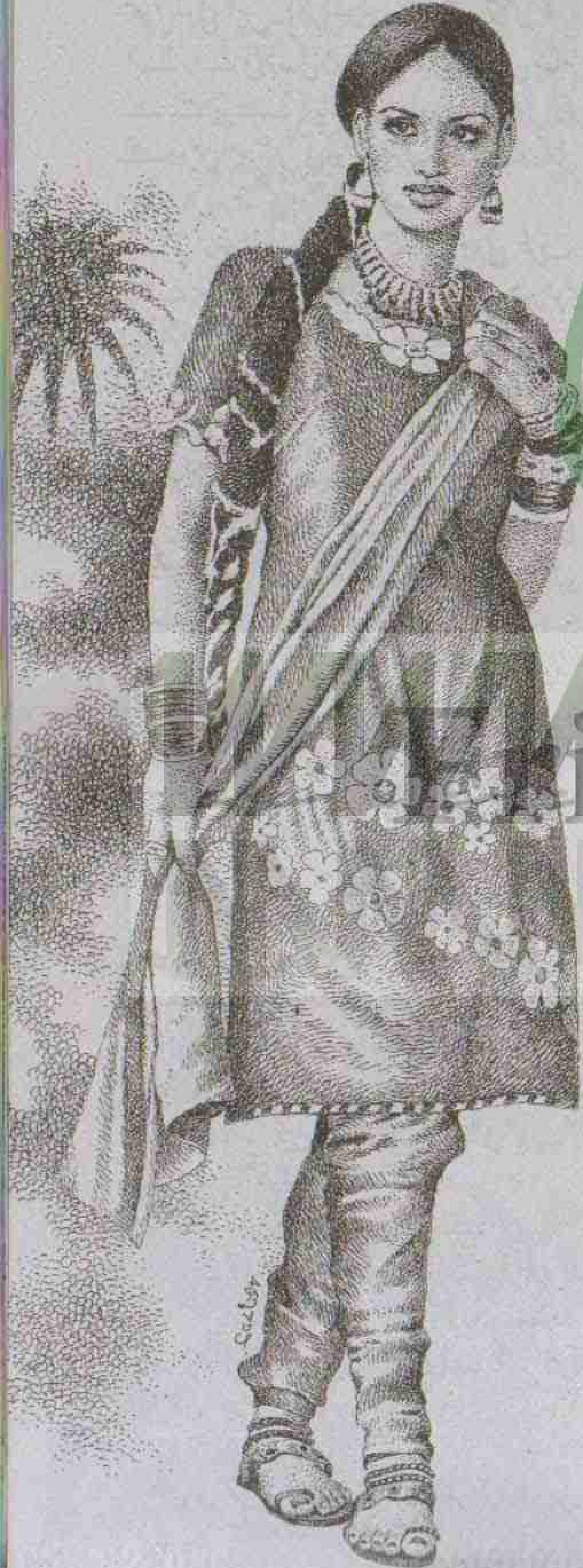
"شاید میرا کفارہ ادا کیا ہے علی نے۔" میرے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔

نین غزالی صحن میں پانی سے بھرے ٹب میں کاغذ کی کشتیاں چلا رہی تھی اور میں بیٹھک سے ملحقہ مطالعہ گاہ میں بیٹھا تھا، نچلے خانے سے سید قطب شہید کی "اسلام میں عدل اجتماعی" نامی کتاب دیکھ رہا تھا کہ میری نظر یکایک چار، پانچ بوسیدہ ڈائریوں پر پڑی۔ میں نے ایک ڈائری کھولی۔

"غزل نے پہلی پوزیشن لی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر ہمیشہ مہربان رہے۔"

"غزل آج بیماری کی وجہ سے کالج نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہر تکلیف سے بچائے۔"

ڈائری کے صفحات پر نیک خواہشات اور دعائیں



بکھری ہوئی تھیں۔ ڈائری سے صاف ظاہر تھا کہ تحریر کرنے والے کی زندگی میں غزل کا ایک خاص مقام ہے۔ مجھے حیرت نے آلیا۔ علی امیر اور غزل اسکول فیلو تھے۔ وہ علی امیر جس کی دوستی صرف مجھ سے اور اپنی مرحومہ ماں سے تھی وہ کتنا تنہا تھا۔

"یہ لو غزالی! چائے پیو۔" کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے اس کی نظر ڈائری پر پڑی، لیکن چہرہ ہنوز بے تاثر ہی تھا۔

"یہ سب کیا ہے علی؟" میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"کیا؟" وہ سادگی سے بولا۔

"یہ شادی، ڈائری اور تم۔۔۔۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے اور۔۔۔" میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا کہوں اس سے۔

"تم جانتے ہو میں ٹوٹے ہوئے خاندان کا بچہ ہوں۔ تمہاری اماں میرے ابو کی دوسری بیوی تھیں۔ ابو نے میری امی کو چھوڑ دیا تھا یا صرف علیحدگی تھی، اس کا مجھے نہیں پتا، لیکن میں نے محرومی دیکھی ہے غزالی! اس لیے مجھے ذرا، ذرا سے جھگڑوں پر تعلق ختم کرنا دکھ دیتا ہے۔"

یہ ایک اور انکشاف تھا۔ مجھے اب پتا چلا کہ وہ کبھی میرے گھر آنے پر رضامند کیوں نہیں ہوتا تھا۔

"تم غزل سے محبت کرتے تھے؟" میرے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

"ہاں کرتا تھا، بچپن میں پھر لڑکپن میں بھی، پھر۔۔۔" وہ بے بسی سے مسکرایا۔

"تو مجھے شادی کیوں کرنے دی اس سے؟"

"کیونکہ کوئی میری ضمانت نہ لیتا۔ میں مالی طور پر مستحکم نہیں تھا۔ میرا خاندان نہیں تھا اور تم جانتے ہو کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں سے رشتہ نہیں جوڑا جاتا۔" وہ حقیقت ہی بیان کر رہا تھا۔

"پھر اب؟ اب کیوں کی؟"

"کیونکہ تم نے اسے طلاق کا داغ لگا دیا تھا۔ اب وہ اپنے ماں، باپ کے پاس استحقاق سے نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کی بیٹی کا کیا ہوتا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ اسے مجھ سے بہتر کوئی شخص مل جائے گا تو میں اب بھی نہ کرتا۔ تم نے طلاق دی تو میں اس کے لیے یہ ہی کر سکتا تھا۔ مجھے ڈر تھا وہ تم سے دوبارہ بدتر آدمی سے نہ بیاہ دی جائے۔ مجھے لگا کہ نین غزالی، علی امیر کی جگہ کھڑی ہے۔ معاشرے کی طلاق یافتہ دھتکاری ہوئی عورت کی اولاد۔" وہ بے رحمی سے بولا۔

"غزل تمہیں جانتی تھی؟" میں اب تک حیران تھا۔

"شاید نہیں۔۔۔۔ یا تمہارا دوست ہونے کے ناتے جانتی ہو شاید۔"

"اور ابو؟" میں نے پھر سوال داغا۔

"انہوں نے میری امی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی بس پھر میں نہیں رہا۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کرکے امی نے کپڑے سی کر ٹیوشن پڑھا کر مجھے پالا اور جب میں کسی قابل ہوا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

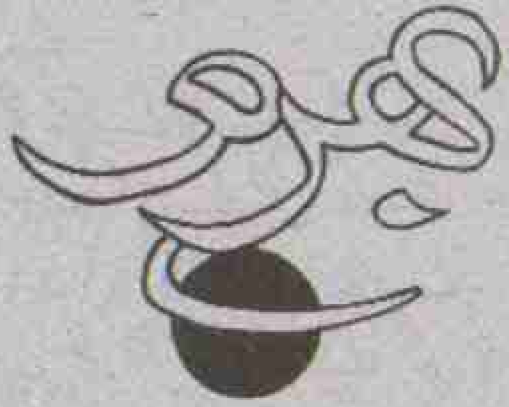
"اور ابو سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی پھر؟"

"بس محلے میں ہی ان کو دیکھتا تھا، تم ان کے ساتھ آتے جاتے تھے۔"

میں ٹھنڈی ہوتی چائے، سید قطب کی کتاب اور حیرت وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا اور ایک سبق جو میرے پیارے دوست اور بھائی علی امیر کی زندگی کا حاصل تھا، اپنی گرہ سے باندھ لایا کہ تعلق اور رشتہ وجود میں آجائے تو اسے بنائے رکھنا جوڑے رکھنا ضروری ہے، ورنہ علی امیر اور نین غزالی جیسے دکھ جنم لیتے ہیں اور غزل اور آمنہ آنٹی (علی کی امی) جیسی ہستیاں دنیا کی نظر میں بے مایہ ہو کر ہمیں گناہ گار کر جاتی ہیں۔



شاہدہ ملکہ



سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی کافی دیر سے جاری تھی۔ جیت ابر آلود موسم کی ہوئی اور سورج اپنا منہ بادلوں میں چھپا گیا۔ میں دودھ کا گلاس فہد کو دے کر اپنا چائے کا کپ لے کر برآمدے میں آبیٹھی اور اس خوب صورت موسم کو انجوائے کرتے ہوئے چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ تب ہی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا اور فرزانہ کا گڈو اندر داخل ہوا۔

"آنٹی! امی کہہ رہی ہیں، باہر آجائیں۔"

"اچھا، ابھی آرہی ہوں۔" میں نے چائے کا کپ دھو کر شیلف پر رکھا اور کمرے میں آکر بچوں پر نظر ڈالی۔ فہد ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا، جبکہ احمد اطمینان سے سو رہا تھا۔

"بیٹا! بھائی جاگ جائے تو مجھے بتا دینا۔"

فہد کو ہدایت کرکے میں باہر آگئی جہاں فرزانہ اور نیلم میرے گھر کے دروازے سے جڑی سیمنٹ کی روش پر دنیا جہاں کے موضوعات چھیڑے بیٹھی تھیں۔ قریب ہی ان کے بچے کھیل رہے تھے۔ میں بھی اسی منظر کا حصہ بن گئی جو ہمیشہ میرا پسندیدہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں شمشاد بھی بھنی ہوئی مکئی کا ایک شاپر لیے موجود تھی۔

پرانے لالہ زار کے اس منظر کو انجوائے کرتے ہوئے میں کچھ اداس تھی۔ آمنے سامنے ایک ہی طرز پر بنے ہوئے کوارٹر ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر تھے۔ سیمنٹ کی وسیع گلی اور ہر کوارٹر کے دروازے تک جانے کے لیے بنی ہوئی روش کے اردگرد گھاس کے قطعات پر ہماری محفلیں جمتی تھیں۔

"کچھ دن کے بعد میں ان محفلوں کا حصہ نہیں رہوں گی۔" کیونکہ جاوید کو یہ کوارٹر صرف چھ ماہ کے لیے الاٹ ہوا تھا اور اس مدت کے ختم ہونے میں صرف پندرہ دن تھے۔

اب مجھے بچوں کے ساتھ خیرپور واپس جانا تھا، جہاں سسرال کی وہی چخ چخ۔ اگرچہ وہاں بھی گھر کے ایک حصے میں علیحدہ رہتی تھی، مگر اس کے باوجود ساس اور نندوں کی میرے معمولات میں بھرپور دخل اندازی جاری رہتی۔ البتہ جاوید مناسب حد تک تعاون کرنے والے شوہر تھے۔ جگالی اور باتیں کرتے ہوئے خاصی دیر گزری تو فہد موبائل ہاتھ میں پکڑے باہر آیا۔

"امی! نانو کا فون ہے۔" میں ذرا فاصلے پر ہو کر اماں سے باتیں کرنے لگی۔

"میری چھوٹی بہن شہناز کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اماں کا فون بھی اسی سلسلے میں تھا۔ اگرچہ بہت خوشی کا موقع تھا مگر اماں کچھ پریشان بھی تھیں۔ اس موقع پر منے کے ننھیال سے کیا کچھ آئے گا، اس کی دادی کئی مرتبہ گنوا چکی تھیں۔ ان کی ڈیمانڈ مکمل طور پر پورا کرنا



مشکل تھا، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا اور یہ اب میری ذمہ داری تھی کہ شہناز کے میکے کا بھرم سسرال میں قائم رہے۔

"ہاں تو بچے کے دو ریڈی میڈ سوٹ خرید لیتے ہیں اور کچھ کھلونے بھی لے لیں گے۔ شام کو میں نے جاوید سے بات کی تو وہ اطمینان سے بولے۔

"جاوید! مگر شہناز کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔"

"شازیہ! تم جانتی ہو کہ اس مہینے ہاتھ بہت تنگ ہے' اتنا خرچا ہم کس طرح افورڈ کر سکتے ہیں؟"

"شہناز کے سسرال کا معاملہ ہے اور آپ کو پتا ہے' اگر ایک سوٹ اس کے لیے۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے' ایک سوٹ بھی لے لینا۔" جاوید نے بے چارگی سے کہا تو میں کچھ مطمئن ہوئی تھی۔

جاوید سے جو کچھ میں نے منوایا تھا۔ وہ بھی میرے نزدیک کافی نہیں تھا۔

آخر میری بہن کی سسرال کا معاملہ تھا۔

بازار جانے سے پہلے میں نے فرزانہ سے بات کی تو اس نے کورا جواب دے دیا۔ رہ گئی نسیم تو وہ مہینے کی سات' آٹھ تاریخ کو چٹخارہ بھر کر کہتی تھی "وسیم نزدیک ہے تنخواہ ملے گی تو دل کھول کر شاپنگ کروں گی۔" اکثر اوقات میاں کے بیٹ مین کی بھی سو پچاس کی مقروض رہتی تھی۔

اب میں کیا کروں؟ سامنے والے کوارٹر میں کوڈو سے ایم ٹی جے سی او کی مرنجان مرنج بیوی زلیخا ہم سب سے زیادہ امیر تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بے حد کنجوس تھی' دوسری بات یہ کہ اس فیملی نے کینٹ ایریا کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دو بھینسیں پال رکھی تھیں' جن کا دودھ تمام کوارٹروں کو سپلائی ہوتا تھا۔ یوں یہ ان کی اضافی آمدن تھی' جس کی بدولت وہ آڑے وقت سب کے کام آتی تھی۔ سو میں نے بھی اسی سے مدد لی تھی۔ چند سو روپے کی اپنی بچت اور پانچ سو روپے ادھار کے ملا کر شہناز کی ساس اور نند کے لیے بھی ایک ایک سوٹ خرید لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم کس کے کپڑے سلائی کر رہی ہو؟" آج ہمیں یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے میں بار بار سلائی مشین پر جا بیٹھتی تو جاوید تنگ کر بولے۔

"یہ اوپر والی باجی مجھے کافی دنوں پہل دے کر گئی تھیں' بس ابھی مکمل ہونے ہی والا ہے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"یہ اس وقت تمہیں مفت کا وبال گلے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ ٹھیک چار بجے سامان گاڑی میں لوڈ کرنا ہے۔"

"مفت کا وبال نہ ہو تو میں زلیخا کا ادھار کیسے چکاؤں گی۔" دل ہی دل میں سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔

"سامنے والوں سے دودھ کا حساب تو لے آؤ' ان کی ادائیگی تو کر دیں۔" وہ کچھ حساب کتاب لگا رہے تھے۔

"فہد بیٹا! سامنے آنٹی کے گھر جا کر ان سے کہو' دودھ کا جو حساب بنتا ہے وہ کاغذ پر لکھ کر دے دیں۔" میں نے فہد کو ان کی طرف دوڑایا اور تھوڑی دیر میں ہی وہ کاغذ لے کر آ گیا۔

"پانچ سو روپے ادھار۔" جاوید نے با آواز بلند کاغذ لہراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں چکرا گئی۔ میں نے مشین سے اٹھ کر کاغذ ہاتھ میں لے لیا۔

"کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی' میں جا کر پوچھتی ہوں۔" چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے میں باہر نکلی۔

"بیٹا! امی کدھر ہیں؟" برآمدے میں اس کی دونوں بچیاں پڑھ رہی تھیں۔

"واش روم میں ہیں۔" ان کے بتانے پر میں نے جلدی سے واش روم کا دروازہ دھڑ دھڑایا تھا۔

"باجی ذرا جلدی کریں نا! باہر آئیں۔"

"کیا بات ہے شازیہ خیریت تو ہے؟" وہ افتاں و خیزاں باہر نکلی تھی۔

"باجی! وہ جو پانچ سو روپے میں نے آپ سے لیے تھے" وہ دودھ کے حساب والی پرچی پر کیوں لکھ دیے ہیں؟ اب اپنے بھائی کو آ کر بتائیں کہ غلطی سے لکھ دیے ہیں۔"

"مگر وہ جو تم نے۔۔۔"

"وہ میں آپ کو خود ہی واپس کروں گی' بس جلدی کریں۔" میں نے دروازہ کی طرف دھکیلا تھا۔

☼ ☼ ☼

سلائی سے ملنے والی رقم کے ساتھ کچھ جمع جوڑ کر ساڑھے تین سو روپے میں چلنے سے چند منٹ قبل زلیخا کو دے کر آئی تھی' اس تسلی کے ساتھ کہ بقیہ رقم کسی نہ کسی طرح اسے بھجوا دوں گی۔ چند دن ملنے ملانے اور ایڈجسٹ ہونے میں گزر گئے۔

شہناز کے ہاں سے واپسی پر میں بہت خوش تھی۔ اس کی ساس نے میرے تحائف خوشی خوشی وصول کیے اور خاصی پذیرائی کی۔ جاوید واپس جا چکے تھے۔ میں اسی سوچ و بچار میں تھی کہ زلیخا کے پیسے کیسے بھجواؤں؟ مگر جاوید کی فون کال نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ کوڈو سے جے سی او کا بڑا بھائی جاوید کی یونٹ میں تھا۔ اس کے ذریعے زلیخا نے ڈیڑھ سو روپے کا مطالبہ کر دیا۔ پہلے تو جاوید نے حیران ہو کر انکار کیا' پھر بات بحث مباحثے تک پہنچی تو جاوید نے جا کر فرزانہ سے تصدیق کے بعد ڈیڑھ سو روپے واپس کیے۔

"میں نے کب تمہاری بات نہیں مانی۔ اپنے وسائل میں حتی الامکان میں نے تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی' پھر کیوں تم نے مجھے دس لوگوں کے بیچ میں ذلیل کروایا۔"

"مجھے معاف کر دیں جاوید!" میرے پاس اس کے سوا کہنے کو کچھ نہ تھا۔

میرا میکا پچھلے محلے میں آباد تھا۔ میں کچن میں تھی' جب میری بھتیجی حفصہ بریانی کی پلیٹ لیے چلی آئی۔

"آج نیاز دلوائی ہے۔ امی نے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔" اس نے پلیٹ پکڑاتے ہوئے مجھے بتایا۔

"پھوپھو! امی پوچھ رہی تھیں' تھوڑا سا دودھ ہو گا؟ آج دودھ والی دیگچی میں کاکروچ گر گیا ہے۔"

"ہاں نا کیوں نہیں' یہ لو۔" میں نے گلاس میں دودھ ڈال کر اسے پکڑایا اور پلیٹ خالی کر کے سنک میں دھونے لگی۔

"تمہاری خالہ کب تک آ رہی ہیں؟" کام نمٹاتے ہوئے میں نے اس سے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔

"پتا نہیں پھوپھو! دو' چار دن تک آئیں گی شاید۔" وہ دودھ کا گلاس اور پلیٹ ہاتھ میں پکڑے کچن کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے یوں ہی مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی' تب ہی جاوید غالباً ہماری آواز سن کر ادھر آ گئے۔ ان کی نظریں حفصہ کے ہاتھ میں پکڑے گلاس پر تھیں۔

حفصہ انہیں سلام کر کے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

فہد ان کے پاس بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ احمد بھی ادھر ادھر پھدک رہا تھا۔ میں چٹائی پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔

"سنو! یہ احد بہت کمزور ہو رہا ہے' کیا بات ہے تم اسے دودھ نہیں دیتی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"بھئی مطلب یہ کہ جب ہم بچوں کے لیے دودھ منگواتے ہیں تو ادھر ادھر بانٹنے کے بجائے بچوں کو دیا کرو۔" میں نے بغور جاوید کے سوالیہ چہرے کو دیکھا اور پھر ان کی آنکھوں میں جھانکا' وہاں بھی صرف سوال تھے۔

اس لیے کہ اعتبار ختم ہو جائے تو سوال شروع ہو جاتے ہیں۔ اعتبار وہ ستون ہے' جس پر ازدواجی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ دوسروں کے بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں' میں نے اپنے شریک سفر کو بے اعتبار کر دیا تھا۔

مجھے یوں لگا' میرا گھر ایک مکان میں بدل گیا ہے۔

☼

نمرہ احمد



محمل ابراہیم' آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تایا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً" تائی مہتاب کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور مہتاب تائی' فواد' حسنان' وسیم' سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضہ چچی کے تین بچے حسن' ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو' معیز اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں تائی مہتاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو' فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی مہتاب کے خاندان کی اس دکھتی رگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو' سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک پراسرار سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی' حال' مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل' آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکالرشپ مل

جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایروناٹیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محمل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تائی مہتاب فوراً" انکار کردیتی ہیں۔ جس پر محمل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آنرشپ دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کردیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محمل اس پراسرار لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی تائی مہتاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محمل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ تائی مہتاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملاتی ہیں۔ محمل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت سست بھی سناتی ہے۔ اس ردِعمل پر وہ لڑکی بجھ سی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محمل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محمل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محمل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محمل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میریٹ میں ڈنر کا جھانسہ دے کر فواد، محمل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈراما رچا کر محمل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محمل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اے ایس پی کے سامنے محمل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محمل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، محمل کی آغا فواد سے بات کرواتا ہے تو وہ اسے رات اسی کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ محمل اس دھوکہ دہی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کرلیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کوٹھی کے برابر میں مدرسہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے۔ جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ محمل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محمل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محمل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آغا کریم اور تمام چچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محمل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکے سے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کروا دیتی ہے۔ تائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آغا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ مصلحتاً محمل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محمل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس معاملے میں محمل کو بھی قصوروار سمجھتی ہیں۔ محمل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدرسے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف محمل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھر والوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محمل کو بری طرح زدوکوب کرتے ہیں۔ وہ رو رو کر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ حسن گھر والوں کے اس سلوک پر ششدر رہے۔ مسرت، محمل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محمل، انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے مصلحتاً جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا، وہ ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

چھٹی اور آخری قسط

"فرشتے! میرے اختیار میں نہ کل کچھ تھا، نہ آج ہے۔ ہمایوں نے فیصلہ سنانا تھا، سنا دیا۔ اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تو کیا میں اسے مجبور کروں؟ نہیں۔" اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر وہ علیحدگی ہی چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں مصالحت کی آخری کوشش ضرور کروں گی، مگر اس سے بھیک نہیں مانگوں گی۔"

"پھر.... پھر کیا کرو گی؟ کدھر جاؤ گی؟"

"فرشتے! میں ہمایوں کی محتاج نہیں ہوں۔ اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔"

"تم اس کے بغیر رہ لو گی؟"

"کیا وہ میرے بغیر نہیں رہ رہا؟" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"مگر کیا تم خوش رہو گی؟"

"اگر اللہ نے میرے مقدر میں خوشیاں لکھی ہیں تو وہ مجھے مل ہی جائیں گی، بھلے ہمایوں میرے ساتھ ہو یا نہ ہو۔"

فرشتے تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔

"آئی ایم ویری سوری محمل! اگر تم کہو تو میں اسے اس کا فیصلہ بدلنے کو...."

"نہیں۔" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "آپ اس معاملے میں نہیں بولیں گی۔"

"مگر ایک دفعہ مصالحت کی ایک کوشش تو۔"

"پلیز فرشتے! مجھے بھکاری مت بنائیں!" اس نے کچھ ایسی بے بسی سے کہا تھا کہ فرشتے لب کاٹتی رہ گئی۔

"مگر.... وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیا اس نے تمہیں وجہ بتائی ہے؟"

"کیا میں نہیں جانتی؟ ہونہہ!" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔ "وہ ایک معذور عورت کے ساتھ کب تک رہتے، کب تک میری خدمت کرتے، وہ میری بیماری سے اکتا گیا ہے، میں جانتی ہوں۔"

"کیا یہی واحد وجہ ہے؟"

"اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"واللہ اعلم خیر، جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا، اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس پہ اپنے دل کو بھی راضی کر لینا۔ لَو یو سسٹر!" اس نے اپنے ہاتھ محمل کے ہاتھوں سے ہٹائے اور ہولے سے اس کا گال تھپتھپاتی کھڑی ہو گئی۔

"بس یہ یاد رکھنا کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتیں، میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ او کے۔"

محمل نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

جب سے ہمایوں نے علیحدگی کی بات کی تھی، وہ لاکھ فرشتے کے سامنے خود کو صابر شاکر ظاہر کرتی، اندر سے وہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس کی یادداشت میں ہمایوں کے ساتھ بیتا ایک ہی سال تھا۔ باقی کے ماہ و سال ذہن کے پردے پہ اترے بغیر ہی سرک گئے تھے۔

اور وہ ایک سال جو اس نے اس گھر میں محبتوں اور چاہتوں کے بیچ گزارا تھا.... جب وہ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ وہ کینڈل لائٹ ڈنرز، وہ لانگ ڈرائیوز، وہ روز ہمایوں کے لیے تیار ہونا، وہ ٹیرس پہ جا کر رات کو باتیں کرنا، وہ ایک ساتھ کی گئی شاپنگز.... ہر شے اس کی یادداشت پر سے کسی فلم کی طرح گزرتی تھی اور ہر یاد اس کے دل پہ مزید آنسو گراتی جاتی تھی۔

اور اگر تیمور بھی اس کے ساتھ نہ رہا، تب وہ کیا کرے گی؟ کدھر جائے گی؟ اگر ہمایوں نے اسے گھر سے نکال دیا، تو وہ کہاں رہے گی؟ کیا اپنے چچاؤں کے

پاس؟ کیا وہ اسے رکھیں گے؟ یا فرشتے کے ساتھ؟ مگر فرشتے تو خود تنہا تھی۔ ہمایوں کے گھر میں مہمان تھی۔ پھر وہ کیا کرے گی؟

یوں لگتا تھا کہ چلچلاتی دھوپ میں اسے لا کھڑا کیا گیا تھا۔ نہ چھت، نہ سائبان، مستقبل کا خوف کسی بھیانک آسیب کی طرح اس کے دل سے چمٹ گیا تھا۔

بار بار یہ سوال ذہن میں اٹھتے اور وہ بمشکل ان کو جھٹلا پاتی۔

اور پھر آخر کب تک وہ ان کو یوں جھٹکے گی؟ کبھی نہ کبھی تو اسے ان کا جواب چاہیے ہو گا اور جس کتاب سے جواب مل جایا کرتے تھے اس کے صفحے بار بار ایک ہی آیت سے کھل جاتے تھے۔ کبھی ایک جگہ سے کھل جاتی تو کبھی دوسری جگہ سے اور یہی قصہ سامنے آجاتا۔

"اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور کہو حطۃ"

مگر ہیکل سلیمانی کا دروازہ کہاں تھا؟ وہ تو بن سواری کے شہر سے نکل باہر کی جا رہی تھی۔ اندر کیسے جاتی؟

وہ سہ پہر بہت زرد سی اتری تھی۔ بلقیس نے اسے بیڈ سے وہیل چیئر پہ بٹھایا اور باہر لے آئی۔

تیمور لاؤنج میں صوفے پہ کتابیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، اور پھر نگاہیں کتاب پہ جما دیں۔ وہ پیاسی نظروں سے اسے تکتی رہی، یہاں تک کہ بلقیس وہیل چیئر لاؤنج کے داخلی دروازے تک لے آئی۔

دروازے کی چوکھٹ پہ لگے گلاس بیل بوٹوں اور نقش و نگار کے درمیان اسے صوفے پہ بیٹھے تیمور کا چہرہ نظر آیا جو بہت غور سے اسے باہر جاتے دیکھ رہا تھا۔

بلقیس وہیل چیئر لان میں لے آئی۔ تازہ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو بھورے بال پیچھے کو اڑنے لگے۔ اس نے آنکھیں موند کر لمحے بھر کو موسم کی تازگی اپنے اندر اتارنا چاہی۔ تب ہی دیوار کے اس پار سے مدھم مدھم سی بھنبھناہٹ سماعت میں اتری۔

"اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے۔"

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اسے گھر آئے مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر وہ کبھی مسجد نہیں گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

"بلقیس! مجھے مسجد لے چلو۔" ایک دم سے اس کا دل مچل گیا تھا۔

بلقیس نے فرماں برداری سے سر ہلا کر وہیل چیئر کا رخ موڑ دیا۔

"فرشتے کدھر ہیں؟" اس نے سوچا کہ اسے بھی ساتھ لے لے۔

"وہ کھانا کھا کر سو گئی تھیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" وہ جانتی تھی، فرشتے تھکی ہوئی ہو گی۔ صبح بھی وہ فزیو تھراپسٹ کے ساتھ محمل کی ایکسرسائز اور پھر مساج کرنے میں لگی رہی تھی۔ پھر سبزی لانا اور گھر کی نگرانی۔ وہ شام کو مسجد جانے کی ہی، پھر ابھی اسے کیوں تھکاتے سو اس نے فرشتے کو بلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مسجد کا ہرا بھرا گھاس سے مزین لان ویسا ہی خوب صورت تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ سفید ستونوں پہ کھڑی عالیشان، اونچی عمارت، چمکتے سنگ مرمر کے برآمدے ۔۔۔ کونوں میں رکھے سبز لہلہاتے گملے شور مچاتی دنیا سے دور، ہنگامے سے پاک "ٹھہرا ہوا" کونا کونا سکون میں ڈوبا ماحول۔

مسجد کے اندر کوئی اور ہی دنیا تھی۔ ٹھنڈی، تازگی بھری، باوقار سی دنیا۔ اس کے در و دیوار سے سکون ٹپکتا تھا۔

وہ جیسے بچوں کی طرح کھل اٹھی تھی۔ آنکھوں میں چمک آگئی اور بے اختیار ادھر ادھر گردن گھماتی وہ ہر ہر شے دیکھ لینا چاہتی تھی۔ بلقیس آہستہ آہستہ وہیل چیئر آگے بڑھا رہی تھی۔

برآمدے میں سنگ مرمر کی چمکتی سیڑھیاں اترتی تھیں۔ ان پہ مسلسل اوپر نیچے لڑکیاں آجا رہی تھیں۔ سفید یونیفارم کے اوپر لائٹ گرین اسکارف، یا رسٹ کلر کے اسکارف پہنے، وہ مسکراتی ہوئی خوش باش لڑکیاں، ہاتھوں میں قرآن اور کتابیں پکڑے ہر کسی کو مسکرا کر سلام کرتیں آس پاس نظر آ رہی تھیں۔

"وعلیکم السلام ۔۔۔ وعلیکم السلام۔" وہ مسکرا کر ہر ایک کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔ وہ وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی اور کوئی اسے نہیں جانتا تھا پھر بھی سلام کرنا اور سلام میں پہل کرنے کی حرص رکھے، ہر کوئی پاس سے گزرتے ہوئے سلام کرتا تھا۔ اس کا پور پور خوشی میں ڈوب رہا تھا۔ یہ ماحول، یہ در و دیوار ۔۔۔ یہ تو اس کی ذات کا حصہ تھے۔ وہ کیسے اتنا عرصہ ان سے کٹی رہی؟

وہ نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے وہیل چیئر پہ بیٹھی مسلسل سب کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔ نہ کسی نے رک کر ترس سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ نہ کسی نے ترحم بھری نگاہ ڈالی۔ نہ کوئی تجسس نہ کرید۔ وہ کونے میں وہیل چیئر پہ بیٹھی ساری چہل پہل دیکھ رہی تھی۔

پھر کتنی ہی دیر وہ ادھر ہی بیٹھی رہی، یہاں تک کہ بلقیس نے مرکز تک جانے کی اجازت مانگی۔

"رات صاحب کے کوئی سرکاری مہمان آنے ہیں اور فرشتے بی بی نے مجھے گوشت بنوانے کو کہا تھا، میں بھول ہی گئی۔ آپ بیٹھو میں لے آتی ہوں۔"

"نہیں میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی، آج دل کر رہا ہے دنیا کو پھر سے دیکھنے کا۔"

ایک الوہی سی چمک نے محمل کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ اس ماحول میں آکر جیسے بہت خوش تھی اور اس خوشی کو اپنے اندر سمیٹ کر اب وہ دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔

آج اسے بازار جانے سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

بلقیس عادتاً چھوٹی موٹی ادھر ادھر باتیں کرتی اس کی وہیل چیئر چلاتی مرکز تک لے آئی۔ مرکز وہاں سے بہت قریب پڑتا تھا۔ وہ گوشت بنوانے دکان میں چلی گئی جبکہ محمل باہر بیٹھی رہی۔

گاڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں، لوگ بہت اونچا بول رہے تھے۔ موٹر سائیکلیں بہت شور مچا رہی تھیں۔ روشنیاں بہت تیز تھیں۔

ذرا سی دیر میں ہی سارا سکون ہوا ہو گیا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

"جلدی کرو بلقیس!" وہ لفافے تھامے دکان سے باہر آئی تو محمل سخت اکتا چکی تھی۔

"بس بی بی! یہ سامنے والے پلازہ میں ہوٹل ہے۔ تیمور بابا کے لیے پزا لے لوں۔ ورنہ بابا کھانا نہیں کھائے گا۔ بس بی بی، پانچ منٹ۔"

وہ تیز تیز وہیل چیئر دھکیلتی کہہ رہی تھی۔ محمل نے بے زاری اور بے چینی سے سڑک کو دیکھا۔ وہ فراٹے بھرتی گاڑیاں اسے بہت بری لگ رہی تھیں۔ ایسی ہی کسی گاڑی نے کبھی اسے ٹکر ماری تھی۔

بلقیس ایک فاسٹ فوڈ کے سامنے اسے کھڑا کر کے اندر چلی گئی، اور وہ اس ریسٹورنٹ کی گلاس وال کو تکتے اس گاڑی کو یاد کرنے لگی، جس نے اسے ٹکر ماری تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا یا تھی؟ پکڑا بھی گیا یا نہیں؟

کیا ہمایوں نے اس پہ مقدمہ کیا ہو گا؟ اسے جیل بھیجا ہو گا؟ مگر یوں مقدمہ کرنے سے اس کا نقصان پورا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

"خیر جانے دو، میں نے معاف کیا سب کو۔"

اس نے سر جھٹکا اور پھر بے چین و منتظر نگاہوں سے ریسٹورنٹ کی گلاس وال کو دیکھا۔ بلقیس جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

وہ یونہی بے زاری سے نگاہ اِدھر اُدھر گھماتی رہی اور دفعتاً" بری طرح ٹھٹکی۔ ریسٹورنٹ کی گلاس وال کے اس طرف کا منظر صاف واضح تھا۔

کونے والی میز پہ بیٹھا وہ مسکراتے ہوئے، والٹ کھولتا ہمایوں ہی تھا۔ وہ یک ٹک اس کی مسکراہٹ کو دیکھے گئی۔ کیا اسے مسکرانا یاد تھا؟ کیا اسے مسکرانا آتا تھا؟

اور تب اس کی نظر ہمایوں کے مقابل بیٹھی لڑکی پہ پھسلی۔ شولڈر کٹ بال، سلیو لیس شرٹ، دوپٹہ ندارد، کمان کی طرح تنی آئی بروز...... وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی اور ہمایوں سر جھٹک کر مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

اس لڑکی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ آرزو تھی۔ وہ واقعی آرزو ہی تھی۔

ہمایوں اب والٹ سے چند نوٹ نکالتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا جبکہ وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی واضح اور عیاں تھی۔

"تو یہ بات تھی ہمایوں داؤد! تمہیں آرزو ہی ملی تھی؟"

اس نے غم سے لب کاٹتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔ فرشتے ٹھیک کہتی تھی۔ یقیناً" وجہ کوئی اور تھی۔ اس کی معذوری کا تو بہانہ تھا۔ اصل وجہ تو وہ پتلی کمان سی ابرو والی شاطر لڑکی تھی جو اس کے شوہر کے ساتھ سرِعام لنچ کر رہی تھی۔

اس نے کہا تھا، وہ ہمایوں کو اس سے چھین لے گی، اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

محمل نے کرب سے سوچا۔

مغرب کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، جب بلقیس اس کی وہیل چیئر دھکیلتی گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

اس کے سامنے ایک ہی منظر تھا، کونے کی ٹیبل پہ بیٹھے ہنستے مسکراتے دو نفوس، ایک جانا پہچانا سا فرد، اور ایک جانی پہچانی سی عورت۔

وہ اجڑی اجڑی سی صورت لیے گم صم سی وہیل چیئر پہ بیٹھی تھی۔ بلقیس کب اسے کمرے تک لائی اسے کچھ علم نہ تھا۔

کسی نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ چونکی، اور پھر گردن اٹھا کر سامنے دیکھا۔

فرشتے حیران سی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ زرد شلوار قمیص میں ملبوس، دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے اس نے گیلے بکھرے بال سمیٹ کر دائیں شانے پہ ڈال رکھے تھے۔ شاید ابھی وہ نہا کر آئی تھی۔

"کدھر گم ہو محمل؟ کب سے تمہیں بلا رہی ہوں۔" وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے کارپٹ پہ بیٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ دائیں شانے پہ پڑے اس کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک کر دامن کو بھگو رہے تھے۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں فرشتے۔" وہ جیسے ہار گئی تھی۔ فرشتے کو لگا، وہ رو رہی ہے، مگر اس کے آنسو باہر نہیں اندر گر رہے تھے۔

"میں نے آج خود ان دونوں کو دیکھا ہے۔"

"کن دونوں کو؟" وہ بری طرح چونکی۔

"ہمایوں اور..... اور آرزو کو۔"

"آرزو؟ اسد انکل کی بیٹی آرزو؟"

"ہاں وہی۔ کیا اسد چچا کی ڈیتھ ہو گئی ہے؟"

"تم نے انہیں کدھر دیکھا؟" وہ اس کا سوال نظر انداز کر گئی تھی۔

"مرکز کے ایک ریسٹورنٹ میں۔ وہ دونوں لنچ کر رہے تھے یا شاید ہائی ٹی۔ فرشتے! ہمایوں ہنس رہے تھے، میں تو سمجھی تھی کہ وہ ہنسنا ہی بھول گئے ہیں۔"

"مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ..... پتا نہیں مگر....." وہ مضطرب تھی، کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مجھے پتا ہے، وہ آرزو کی وجہ سے میرے ساتھ یوں کر رہے ہیں۔ اس نے کہا تھا وہ ہمایوں کو مجھ سے چھین لے گی۔ اور اس نے یہ کر دکھایا۔ کیا وہ کبھی اس گھر میں آئی ہے؟"

"ہاں وہ اکثر آتی رہتی ہے۔ مگر تمہارے گھر شفٹ ہو جانے کے بعد وہ کبھی نہیں آئی۔"

"واقعی؟" اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ آخر وہ کس حیثیت سے آئی تھی اس کے گھر؟

"آپ نے اسے نکالا کیوں نہیں؟ اندر کیوں آنے دیا؟"

"یہ میرا گھر نہیں ہے محمل! مجھے اس کا حق نہیں ہے۔"

محمل چپ سی ہو گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

"ہمایوں کے کچھ گیسٹ آنے ہیں چائے پہ۔ ابھی آنے والے ہوں گے، میں ذرا کچن دیکھ لوں۔" وہ اس کے ہاتھوں سے ہاتھ نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گیلے بال شانے سے پھسل کر کمر پہ جا گرے۔

"آپ..... آپ بہت اچھی ہیں فرشتے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"وہ تو مجھے پتا ہے۔" وہ نرمی سے مسکرائی، اور زرد دوپٹے کا پلو سر پہ ڈالا، پھر اچھی طرح چہرے کے گرد حصار سا بنا کر دایاں پلو بائیں کندھے پہ ڈال دیا۔ یوں کہ بال اور کان چھپ گئے۔

"تم آرام کرو۔" وہ باہر نکل گئی اور محمل وہیں اداس، ویران سی بیٹھی رہ گئی۔

باہر سے چہل پہل کی مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد اس نے کھڑکی سے ہمایوں کی گاڑی کو آتے دیکھا تھا۔ اس کے ہمراہ دو تین معزز اشخاص بھی تھے۔ ہمایوں اسی لباس میں تھا جس میں ابھی شام میں آرزو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گویا وہ واقعی وہی تھا، یہ اس کا واہمہ نہ تھا۔

وہ حسرت و یاس سے کھڑکی سے لگی ان کو اندر جاتے دیکھتی رہی۔ اس کے کمرے میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ باہر والے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ "باہر والا" تو شاید اب کبھی بھی اسے نہ دیکھ سکے۔ اس کے پاس اب بہتر انتخاب تھا، جوان، اسٹائلش، زندگی سے بھرپور عورت، بے شک وہ محمل کی طرح خوب صورت نہ تھی، مگر اس کی تراش خراش کی گئی شکل "اب" کی محمل سے حسین لگتی تھی۔

کیا کبھی حالات بدلیں گے؟ کیا کبھی ہمایوں لوٹے گا؟ کیا کبھی اس کی معذوری ختم ہو گی؟ کیا کبھی تیمور اس کے پاس آئے گا؟ کیا یہ گھر اس کا رہ سکے گا؟ کیا وہ دربدر کر دی جائے گی؟ کیا وہ بے سہارا چھوڑ دی جائے گی؟

اندر کا خوف اور بے بسی آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے نکل کر چہرے پہ لڑھکنے لگی۔ مستقبل ایک بھیانک سیاہ پردے کی مانند ہر طرف چھایا دکھائی دے رہا تھا، اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"اللہ اس چیز سے بڑا ہے، جس سے میں ڈرتی اور خوف کھاتی ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا وہ ایک کلمہ وہ بار بار زیر لب دہرا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اندر کرب قدرے کم ہوا اور ذرا سا سکون آیا تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑ ہی دینا ہے، نکال ہی دینا ہے تو مجھے کسی بے قدرے کے حوالے مت کرنا، میرے مالک! کوئی امید کا سرا دکھا دے، کوئی روشنی دکھا دے۔" وہ بنا لب ہلائے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو اسی طرح بہہ رہے تھے۔

پھر جب بہت رو چکی، تو چہرہ پونچھا اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اپنا سفید کور والا قرآن اٹھایا، اس کے فرنٹ کور پہ مٹا مٹا سا "م" اسی طرح لکھا تھا۔

اسے یاد نہ تھا کہ اس نے آخری دفعہ تلاوت کدھر چھوڑی تھی، پتا نہیں نشان کہیں لگایا تھا یا نہیں۔ بس جہاں سے صفحہ کھلا، اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔

لاشعوری طور پر وہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی چاہتی تھی۔

"اور کس کی بات اس شخص کی بات سے زیادہ اچھی ہو سکتی ہے' جو اللہ کی طرف بلائے اور اچھے عمل کرے اور کہے' بے شک میں مسلمانوں میں سے ہوں۔"

اس نے اگلی آیت پڑھی۔

"اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں سو (برائی کو) اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو' پھر دفعتاً" وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے' یوں ہو جائے گا گویا کہ تمہارا حمیم (گہرا جاں نثار دوست) ہو۔"

اس نے اچنبھے سے ان آیات کو دیکھا' کیا اب بھی کوئی امید تھی کہ وہ شخص اس کا حمیم (گہرا جاں نثار دوست) بن سکتا ہے؟ اب تو کچھ باقی نہیں رہا تھا' سب ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اس آیت کو دوبارہ پڑھا۔

بہت ہی عجب ماجرا تھا۔ آج وہ اپنے شوہر کو ایک دوسری عورت کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھ آئی تھی' اپنے اس شوہر کو جو برملا اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا کہہ چکا تھا۔ اس کا اپنا بچہ اس سے بدکتا تھا۔ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی بے انتہا پر امید رہنے والی بہن بھی آج خاموش تھی' آج اس نے بھی امید نہیں دلائی تھی کہ ہمایوں کا رویہ سب کے سامنے تھا۔

اس نے پھر سے پڑھا۔

"پھر دفعتاً" وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے' یوں ہو جائے گا گویا تمہارا حمیم ہو' اور اس (خوبی) کو ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں حاصل کر سکتا جو بہت صبر کرتے ہیں اور اس (خوبی) کو ان کے علاوہ کوئی نہیں حاصل کر سکتا جو بڑی قسمت والے ہوتے ہیں۔"

میں اتنی صبر کرنے والی اور بڑی قسمت والی کہاں ہوں اللہ تعالیٰ؟ اس نے یاس سے سوچا تھا۔ کیا وہ واقعی کبھی بھی ان عداوتوں کو پگھلا نہیں سکے گی؟ کیا اسے مایوس ہو جانا چاہیے؟

باہر سے چہل پہل کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ محمل کے کمرے کے سامنے ہی ڈرائنگ ہال اور ڈائننگ روم تھا۔

اس نے قرآن بند کر کے شیلف پہ رکھا' اور وہیل چیئر کو گھسیٹتی ہوئی کھڑکی کے پاس لے آئی۔ قد آور کھڑکی کے شفاف شیشوں کے اس پار ڈوبتی شام کا منظر نمایاں تھا۔ دور اوپر کہیں آدھا چاند بادلوں سے جھانک رہا تھا۔ یہاں تک کہ شام ڈوب گئی اور چاندنی سے کھڑکی کے شیشے روشن ہو گئے۔ وہ اسی طرح اندھیرے میں ڈوبے کمرے میں بیٹھی گردن اٹھائے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

"ادفع بالتی ہی احسن۔"

(دور کرو اسے اس طریقے سے جو بہترین ہو۔)

جو بہترین ہو۔

جو بہترین ہو۔

ایک آواز بار بار اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ وہ چپ چاپ چاند کو دیکھتی کچھ سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے دیوار پہ آویزاں گھڑی پہ نگاہ دوڑائی۔ ایک بجنے میں ابھی چند منٹ تھے اور ہمایوں ڈیڑھ بجے تک گھر آجاتا تھا۔

وہ وہیل چیئر گھسیٹتی سنگھار میز کے سامنے لے آئی اور قد آور آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہیل چیئر پہ بیٹھی ایک کمزور سی لڑکی جس کے گھٹنوں پہ چادر پڑی تھی اور گیلے بال شانوں پہ بکھرے تھے۔ چہرے کی سپید رنگت میں زردی گھلی تھی اور بھوری آنکھوں تلے حلقے تھے۔

اس نے ہیئر برش اٹھایا اور آہستہ آہستہ بالوں میں اوپر سے نیچے کنگھی کرنے لگی۔ گیلے بالوں سے موتیوں کی طرح ٹپکتے قطرے اس کی سرخ قمیص کو بھگو رہے تھے۔ یہ خوب صورت جوڑا فرشتے نے اس کے لیے بنوایا تھا اور آج بہت شوق سے اس نے پہنا تھا۔

بال سلجھ گئے تو اس نے چہرے پہ ہلکا سا فاؤنڈیشن لگایا' پھر گلابی سا بلش آن بکھیرا' آنکھوں میں گہرا کاجل اور اوپر لائٹ پنک سا آئی شیڈو' پھر پنک اور ریڈ لپ اسٹک ملا کر لبوں پہ لگائی' یوں کہ اوور بھی نہ لگے اور بہت پھیکی بھی نہیں۔ بال ذرا ذرا سوکھنے لگے تھے۔ اس نے ان کو برش سے سمیٹا' پھر دونوں ہاتھوں میں پکڑے اونچا کیا' اور پونی میں باندھا' یوں کہ اونچی پونی ٹیل اس کی گردن پہ جھولنے لگی۔

محمل کی یادگار پونی ٹیل۔

وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرا دی۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا جیولری باکس کھولا اور لشکتے سرخ یاقوت کا سیٹ نکالا۔ کانوں میں آویزے پہنے اور گردن میں نازک سا نیکلیس۔ اب اپنا عکس دیکھا تو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ تر و تازہ اور خوب صورت۔

جیولری باکس کے ساتھ ہی اس کی کانچ کی سرخ چوڑیاں رکھی تھیں۔ وہ ایک ایک چوڑی اٹھا کر کلائی میں ڈالتی گئی۔ یہاں تک کہ دونوں کلائیاں بھر گئیں اور جب اس نے سرخ بڑے سے یاقوت کی انگوٹھی اٹھائی تو اسے پہنتے ہوئے چوڑیاں بار بار کھنک اٹھتیں۔

ڈیڑھ بجنے والا تھا' اس نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا اور پھر پرفیوم اسپرے کر کے خود کو باہر نکال لائی۔

ہمایوں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بے چین سی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ کبھی آویزے درست کرتی' کبھی چوڑیاں ٹھیک کرتی اور بار بار دروازے کو دیکھتی۔

دو بجنے والے تھے جب اس نے گاڑی کی آواز سنی۔ ایک دم اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یہ ہی طریقہ اسے "بہترین" لگا تھا' سو اس نے اسی کو اپنایا تھا۔

قدموں کی چاپ قریب ہوتی سنائی دی۔ وہ خوامخواہ گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نروس ہو رہی تھی اور وہ یہ جانتی تھی۔

دروازہ کھلا اور اسے ہمایوں کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ مگر نہیں' ساتھ میں نازک ہیل کی

تک تک بھی تھی۔

اس نے حیرت سے سر اٹھایا اور اگلے ہی پل زور کا جھٹکا لگا۔

ہمایوں اور آرزو آگے پیچھے اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ یونیفارم میں ملبوس تھا' ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا اور وہ آرزو سے بغیر کچھ سنے چلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ہم قد' مسرور سی چل رہی تھی۔ وائٹ ٹراؤزر پہ پنک گھٹنوں تک آتی شرٹ' اور دوپٹہ ناپید' کمان کی سی پتلی ابروز اور تیکھی نگاہیں۔

اسے سامنے بیٹھے گردن اٹھائے خود کو دیکھتے' ان دونوں کے قدم ذرا سے سست ہوئے۔

چند لمحے وہ شدید صدمے کی حالت میں رہی تھی' مگر پھر سنبھل گئی۔

بظاہر سکون سے ان دونوں کو آتے دیکھا اور اسی سکون سے سلام کیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" ہمایوں نے جواب دے کر ایک نظر آرزو کو دیکھا جو سینے پہ بازو باندھے تیکھی نگاہوں سے محمل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں واضح استہزا تھا۔

"میں آپ کا انتظار کر رہی تھی ہمایوں! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ آرزو کو یکسر نظر انداز کیے سپاٹ لہجے میں ہمایوں سے مخاطب تھی۔

"مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہتا اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھا' خاکی لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ٹھیک ہے' آپ بتائیں۔"

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور آرزو اسی طرح سینے پہ بازو لپیٹے اکڑی اکڑی سی کھڑی تھی۔ چند لمحے خاموشی حائل رہی۔ ہمایوں ہاتھ میں پکڑے خاکی لفافے کو دیکھتا رہا' جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ اس نے سر اٹھایا اور ان ہی سنجیدہ نگاہوں سے محمل کا چہرہ دیکھا۔

"میں شادی کر رہا ہوں۔"

ایک لمحے کو سکوت چھا گیا' مگر نہ آسمان گرا' نہ زمین پھٹی' نہ ہی کوئی طوفان آیا۔ اس نے بہت صبر سے اس کی بات سنی اور پھر سوالیہ ابرو اٹھائے۔ "تو؟"

"تو یہ کہ ہم دونوں کو الگ ہو جانا چاہیے۔ یہ لو۔" اس نے خاکی لفافہ محمل کی طرف بڑھایا' جسے اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر تھاما۔ دونوں لمحے بھر کو رکے' دونوں نے اس وقت خاکی لفافہ تھام رکھا تھا۔ مگر وہ بس ایک لمحے کا فسوں تھا۔ پھر ہمایوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور محمل نے سفاکی سے لفافہ چاک کیا۔

"کیا ہے اس میں ہمایوں صاحب؟ کیا میرا طلاق نامہ ہے؟" اندر سے تہ شدہ کاغذ نکالتے ہوئے وہ بہت آرام سے بولی تھی۔ وہ خاموش رہا۔ محمل نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔

وہ واقعی طلاق نامہ تھا۔ ہمایوں کے دستخط' محمل کا نام۔

نہ اس کے ہاتھ سے کاغذ پھسلا' نہ وہ چکرا کر گری۔ بس ایک نظر میں پورا صفحہ پڑھ ڈالا اور پھر گردن اٹھائی۔ لمحوں میں ہی اس نے سارے فیصلے کر لیے تھے۔

"اس پہلی طلاق کا شکریہ ہمایوں داؤد! جس عالم نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دینا ایک قبیح عمل ہے۔ سو طلاق ایک ہی دینا بہتر ہے' تو اس نے یقیناً" یہ بھی بتایا ہو گا کہ اب عدت کے تین ماہ میں اسی گھر میں گزاروں گی' کیا نہیں بتایا؟"

"مجھے معلوم ہے' تم تین ماہ ادھر رہ سکتی ہو' اس کے بعد میں شادی کر لوں گا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ محمل نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا جس کے بے وفا چہرے پہ کوئی پچھتاوا' کوئی ملال نہ تھا۔

"پوچھ سکتی ہوں' آپ دوسری شادی کس سے کر رہے ہیں؟"

ہمایوں نے ایک نظر سامنے کھڑی آرزو کو دیکھا اور پھر شانے جھٹکے۔

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ میں ذرا چینج کر کے آتا

ہوں۔" آخری فقرہ آرزو سے کہہ کر وہ تیزی سے اوپر سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

وہ چند لمحے اسے اوپر جاتے دیکھتی رہی۔ زندگی میں پہلی بار اسے ہمایوں داؤد سے نفرت محسوس ہوئی تھی' شدید نفرت۔

"آپ تو اپاہج ہو کر بھی خوب بنی سنوری رہتی ہیں۔" آرزو کی طنزیہ آواز پہ اس نے چہرہ اس کی جانب موڑا۔

"اگر شکل اچھی ہو تو معذوری میں بھی اچھی ہی لگتی ہے' آرزو بی بی ورنہ لوگ تو گھٹنوں کی تراش خراش کے بعد بھی خوب صورت نہیں لگتے۔"

"چچ چچ۔ رسی جل گئی' بل نہیں گئے۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ دائیں ٹانگ بائیں پہ چڑھائی اور بڑے استحقاق سے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہمایوں کا موبائل اٹھایا جو اس نے بیٹھتے ہوئے ادھر رکھا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا محمل! مجھے اس سے پیار ہو گیا ہے' تو ایٹ فرسٹ سائٹ میں اسے حاصل کر ہی لوں گی۔"

"اور میں نے بھی تب کہا تھا آرزو! کہ تم خدا نہیں ہو جو ہر چیز تمہاری مرضی سے ہو۔ آج وہ تمہارے لیے مجھے چھوڑ رہا ہے' کل کو کسی اور کے لیے تمہیں بھی چھوڑ دے گا' تب میں تمہاری آہیں سننے ضرور آؤں گی۔"

آرزو بے اختیار محظوظ سی ہنس پڑی۔

"جیلس ہو رہی ہو' ہے نا؟"

اس کا انداز محمل کے اندر آگ لگا گیا' مگر اس نے وہ آگ چہرے پہ نہ آنے دی۔ وہ بہت کمال ضبط کا وقت تھا۔

"تمہارے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے' جس سے میں جیلس ہوں۔ رہا ہمایوں' تو تم شوق سے اسے لے لو' مجھے کھنکتی مٹی کے اس پتلے کا کیا کرنا ہے' جس میں وفا ہی نہ ہو۔"

"تمہاری اکڑ ابھی تک نہیں گئی محمل۔"

"اور میری یہ اکڑ جائے گی بھی نہیں' تمہیں کیا لگتا ہے' محمل' ہمایوں کے بغیر مر جائے گی؟ ہونہہ۔" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔ "میں سات سال کوما میں پڑی رہی' تب میرے پاس ہمایوں نہیں تھا' میں تب بھی نہیں مری تو' اب اس کے بغیر کیوں مروں گی؟ خیر' اگر تم نے بیٹھنا ہے تو بیٹھو' کھانے پینے آئی ہو تو سامنے کچن ہے' ویسے بھی دوسروں کے مال کھانے کی تمہاری خاندانی عادت ہے اور ہمایوں کی خیرات کرنے کی۔ جو کھانا ہو' کھا لینا' ٹیک کیئر۔"

اس نے دانستہ السلام علیکم کہنے سے احتراز برتا۔ کم از کم اس وقت وہ آرزو پہ سلامتی نہیں بھیج سکتی تھی اور وہیل چیئر کا رخ اپنے کمرے کی طرف موڑ دیا۔

تہ شدہ زرد کاغذ ادھ کھلا اس کی گود میں دھرا تھا۔

اسے آرزو کے بڑبڑانے' اٹھنے اور سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا گھر تاش کے پتوں کی طرح بکھر چکا تھا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لاک نہیں لگایا' اب کس کو ادھر آنا تھا بھلا؟ سب کچھ بکھر گیا تھا۔

وہ وہیل چیئر کے پہیوں کو دونوں ہاتھوں سے گھسیٹتی سنگھار میز کے سامنے لائی۔ کمرے کی بتی بجھی تھی۔ کھڑکی کے آگے پردہ گرا تھا' کہیں درزوں سے زرد سی روشنی جھانک رہی تھی' جس سے کمرے میں نیم اندھیرا سا تھا۔

وہ اس نیم تاریک ماحول میں اپنا عکس آئینے میں دیکھے گئی۔

ہر شے اجڑ گئی تھی' سب ختم ہو گیا تھا۔ راکھ کا ڈھیر لگا تھا اور اس میں کوئی چنگاری نہیں بچی تھی۔

اپنے عکس کو دیکھتے اس کا دل چاہا' وہ کانوں سے آویزے نوچ پھینکے' نازک سا ہار اتار کر دیوار پہ مارے' چوڑیاں توڑ دے۔ زور' زور سے چلائے' دھاڑیں مار

مار کر روئے۔

اس نے ہاتھ آویزوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ دفعتاً" نیم تاریک کمرے میں ایک مدھم سی آواز ابھری۔

"آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

اور دل غمگین ہے۔

مگر ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔"

آویزے کو پکڑے اس کا ہاتھ بے دم سا نیچے گر گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا صبر صدمے کی پہلی چوٹ پہ ہوتا ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو شخص گریبان چاک اور رخساروں پر طمانچے مارے اور جاہلیت کی طرح بین (نوحہ) کرے۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس نے سر وہیل چیئر کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ قطرہ قطرہ آنسو بند آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ وہ بے آواز روتی رہی' بلکتی رہی۔ اندھیرے کمرے میں بیٹھی ایک معذور' کمزور لڑکی جو بے آواز روتے ہوئے بس ایک ہی لفظ بار بار دہرائے جا رہی تھی۔

"یارب المستضعفین ..... اے کمزوروں کے رب..... اے کمزوروں کے رب۔"

دوپہر دم توڑ گئی' شام ڈوب گئی اور ہر سو رات چھانے لگی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب کسی نے دروازے پہ دستک دی اور پھر چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ وہ کھلتا چلا گیا۔

اس نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔ اسے اب کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ ہمایوں کبھی اس کے پاس آئے گا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک ہیولا سا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"محمل!" وہ فرشتے کی آواز تھی۔

وہ چپ چاپ' آنکھیں چھت پہ جمائے بیٹھی رہی۔

"محمل! کیا ہوا ہے' ایسے کیوں بیٹھی ہو؟"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی متفکر سی آواز ابھری۔

"محمل! تم ٹھیک ہو؟"

اس نے دھیرے سے چہرہ اٹھایا اور متورم آنکھوں سے اندھیرے میں کھڑی فرشتے کو دیکھا۔ اس نے سیاہ جوڑا پہن رکھا تھا سیاہ دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"محمل!"

"ہمایوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔" وہ دھیرے سے بولی تو آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

کتنے ہی پل ماحول پہ سکتہ سا چھایا رہا۔

"کب؟"

"آج دوپہر میں' میں عدت اس گھر میں پوری کروں گی' پھر اس کے بعد میں چلی جاؤں گی اور وہ شادی کر لے گا۔" اس نے رخ فرشتے سے موڑ لیا' تاکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

"آئی ایم ویری سوری محمل۔" وہ متاسف کھڑی تھی۔ "تم عدت کے بعد کہاں جاؤ گی؟"

"اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے' کہیں بھی چلی جاؤں گی۔"

"کیا تم خود کو اتنا اسٹرونگ فیل کرتی ہو کہ حالات کا مقابلہ کر لو گی؟"

"ہاں' میں کر لوں گی' آپ جائیں' مجھے اکیلا چھوڑ دیں پلیز۔"

فرشتے نے سمجھ کر سر ہلایا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز پہ اس نے چہرہ واپس موڑا۔

کمرہ پھر سے سنسان ہو گیا تھا' وہ جا چکی تھی۔

وہ رات بہت عجیب رات تھی۔ محمل نے اتنی ویران رات کبھی نہیں گزاری تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ مسجد کی دیوار پھلانگ رہی تھی۔ تب بھی نہیں جب اسے اس کی جائیداد اور گھر سے محروم کر کے باہر نکال دیا گیا تھا۔ تب بھی نہیں جب اس کی ماں مری تھی اور تب بھی نہیں جب وہ سات سال بعد کومے سے جاگی تھی۔ ایسی رات پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

وہ وہیل چیئر کی پشت سے سر ٹکائے نم آنکھوں سے چھت کو دیکھتی رہی۔ پردوں سے چھن چھن کر اندر آتی چاندنی میں پردے یوں چمک رہے تھے جیسے چاندی کے ورق ہوں۔

زندگی ایک دم گویا ختم سی ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس کے پاس آگے چلنے کو کوئی امید نہ رہی تھی۔ ہمایوں اس کا نہیں رہا تھا' تیمور اس کا نہیں رہا تھا' نہ کسی رشتہ دار کا آسرا تھا اور رہی فرشتے تو وہ اس کے جانے کے بعد مسجد شفٹ ہو جاتی۔ وہ کب تک فرشتے کو اپنی وجہ سے پابند رکھتی؟

وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں۔ اس کا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔

رات یوں ہی خاموشی سے بیتتی گئی۔ وہ اسی طرح برف کا مجسمہ بنی وہیل چیئر پہ پڑی رہی۔ پردوں کی چمک ختم ہوتی گئی اور کمرے میں مہیب گھپ اندھیرا چھا گیا۔

اسے اس اندھیرے سے خوف آنے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے کی سعی کرنے لگی اور تب ہی کھڑکی کے کناروں میں صبح کاذب کی نیلاہٹ ابھرنے لگی۔

دور کہیں فجر کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔

اس کے برف بنے وجود میں پہلی بار جنبش ہوئی۔ اس نے اپنے سن ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھائے اور پہیوں کو آگے کی طرف گھسیٹا۔ شیلف پہ ایک طرف وضو کے پانی کا برتن رکھا تھا۔

محمل نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کوئی دعا ذہن میں ہی نہ آئی' بس ایک رہ ہی لفظ۔

"اے کمزوروں کے رب!" لبوں پہ اترا۔ اس نے کئی بار اسے دہرایا' آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو اس نے آمین کہہ کر چہرے پہ ہاتھ پھیر لیے۔

کمرے میں ہلکی ہلکی نیلاہٹ اترنے لگی تھی۔ وہ وہیل چیئر کو شیلف کے قریب لائی' جہاں ٹیپ ریکارڈر اور ساتھ کیسٹوں کا ڈبہ رکھا تھا۔ اس نے بنا دیکھے ایک کیسٹ لگائی اور ٹیپ میں ڈال کر پلے کا بٹن دبایا۔

کہیں درمیان سے تلاوت شروع ہو گئی تھی۔

"اور کس کی بات اس شخص کی بات سے زیادہ اچھی ہو سکتی ہے' جو اللہ کی طرف بلائے؟"

وہ حیرت سے چونکی' یہ آیت تو پرسوں اس نے پڑھی تھی' پھر یہ ہی کیوں لگ گئی؟

"اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں۔"

وہ حیران سی سن رہی تھی۔ اللہ اسے یہ آیات پھر سے کیوں سنوا رہا تھا؟ یہ آیات تو گزر چکی تھیں' پھر دوبارہ کیوں؟

"برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو؟"

قاری صاحب کی آواز پڑھتے ہوئے بھرا گئی تھی۔

وہ الجھ سی گئی۔ اللہ اسے کیوں پھر سے وہ ہی بات بتا رہا تھا؟ وہ شخص تو اب سارے تعلق کاٹ چکا تھا' اب تو کوئی امید باقی نہیں رہی تھی' پھر کیوں اسے برائی کو بہترین طریقے سے دور کرنے کو کہا جا رہا تھا؟

وہ میرا حمیم (جاں نثار دوست) نہیں بن سکتا اللہ تعالیٰ! اس نے مجھے طلاق دے دی ہے' وہ مجھے تین ماہ بعد گھر سے نکال دے گا۔ اب تو درمیان کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا' پھر آپ کیوں مجھے اس عداوت کو دور کرنے کا کہہ رہے ہیں؟ وہ ایک دم رو پڑی تھی۔

پردوں کے دوسری طرف سے روشنی جھانکنے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے ہٹا دیے۔

باہر لان میں صبح اتر رہی تھی۔ گہری سیاہ رات کے بعد اترتی صبح۔

"برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو۔"

گھاس پہ تیمور بیٹھا تھا۔ نیکر شرٹ میں ملبوس سوئی سوئی آنکھیں لیے وہ گھاس پہ بیٹھی بلی کی کمر پہ پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شاید اس کے ہاتھ میں کچھ تھا جو وہ بلی کو کھلانے لایا تھا۔

"پھر دفعتاً" وہ شخص....."

"پھر دفعتاً" وہ شخص۔"

"پھر دفعتاً" وہ شخص۔"

قاری صاحب کی آواز اور اس کی سوچیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

تیمور اب بلی کے منہ میں روٹی کا ٹکڑا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے۔"

وہ الفاظ کمرے کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔

وہ بنا پلک جھپکے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔ اس اترتی نیلی صبح میں اس پہ اچانک سے کچھ آشکار ہوا تھا۔ "وہ شخص۔" ہمایوں نہیں تھا، نہیں تھا، نہیں تھا۔

"وہ شخص تھا۔ تیمور تھا۔

اس کا بیٹا، اس کا خون، اس کے جسم کا ٹکڑا، کیا وہ اس کا حمیم (جاں نثار دوست) بن سکتا تھا؟ کیا واقعی؟ کیا وہ ایسی قسمت والی ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟

وہ ایک نئی آگہی کے احساس کے ساتھ حیرت میں گھری بیٹھی تھی۔

تیمور اب روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے گھاس پہ ڈال رہا تھا، بلی لپک کر آگے گئی اور گھاس پہ منہ مارنے لگی۔

☼ ☼ ☼

بلقیس کرسی پہ چڑھی، اوپر بنے کیبنٹ کو کھولے کھڑی تھی، جبکہ وہ سامنے وہیل چیئر پہ بیٹھی گردن اوپر اٹھائے اسے ہدایات دے رہی تھی۔ اس کے اور ہمایوں کے ٹوٹے تعلق کی بات ابھی ملازموں تک نہیں پہنچی تھی۔

"بلیو کلر کا ویلوٹ کور کا البم ہوگا، سائیڈ پہ دیکھو۔"

"یہ والا بی بی؟" اس نے ایک البم نکال کر وہیں سے لہرایا۔

"یہ مہرون ہے بلقیس، میں بلیو کہہ رہی ہوں، نیلا آسمانی رنگ۔" وہ اس البم کی تلاش میں اسٹڈی کے کئی دراز اور شیلف چھنوا چکی تھی۔ اب اوپر والے کیبنٹس کی باری آئی تھی۔

"ایک منٹ جی۔" اسے شاید کچھ نظر آیا تھا، کچھ دیر اندر سر گھسائے ہاتھ مارتی رہی، پھر کہیں پیچھے سے کھینچ کر البم نکالا۔

"یہ ہی ہے، لاؤ مجھے دو۔" اس نے سکون کی گہری سانس اندر کو کھینچی۔

"یہ لیں جی۔" بلقیس نے ننگے پاؤں زمین پہ رکھے، اور البم اس کو تھما کر چپل اڑسنے لگی۔ "میں ذرا ہانڈی دیکھ لوں۔"

"ہاں جاؤ۔" اس نے البم دونوں ہاتھوں میں لیا، اس پہ جمی گرد جھاڑی اور پہلا صفحہ کھولا۔

یہ آغا ہاؤس میں کھینچی گئی ملی جلی تصاویر کا البم تھا۔ جب وہ اپنی شادی کے سال بعد آغا ہاؤس گئی تھی تو واپسی پہ اپنی کچھ دوسری چیزوں کے ہمراہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس میں زیادہ تصاویر اس کی اپنی تھیں۔ کہیں وہ تیرہ سال کی تھی تو کہیں انیس سال کی۔ کچھ تصاویر خاندان میں ہونے والی شادیوں کی بھی تھیں، وہ محویت سے ان کو دیکھتی صفحے پلٹنے لگی۔

معلوم نہیں یہ سب لوگ اب کدھر تھے۔ سوائے آرزو کے کسی کا کچھ پتا نہیں تھا اور آرزو سے ان کا پتا وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی اس روز کے بعد آرزو ادھر نہیں آئی تھی۔ ہاں ہر شام ہمایوں کہیں باہر نکل جاتا تھا۔ ایک دفعہ پوچھنے پہ بلقیس نے بتایا تھا کہ وہ کسی "دوست" کے ساتھ اس وقت شام کی چائے پیتے ہیں اور دوستی کا ایک نظارہ تو وہ اس روز مرکز کے ریسٹورنٹ میں دیکھ ہی چکی تھی۔ سو اب مزید کریدنے کی حاجت نہیں رہی تھی۔

اور رہے یہ لوگ تو ان کی تصویریں دیکھتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح یہ ہی سوچ رہی تھی کہ ان کا کیا بنا؟ کیا وہ ابھی تک بے مہار گھوم رہے ہیں یا اللہ نے ان کی رسی کھینچی؟ ظلم اور والدین کی نافرمانی تو وہ ایسے گناہ ہیں جن کی سزا دنیا میں بھی لازماً ملتی ہے تو کیا ان کو سزا ملی؟ کیا ان کو احساس ہوا؟ اور سب سے بڑھ کر کیا اس شخص کو سزا ملی جو اس وقت اس کے سامنے تصویر میں مسکرا رہا تھا؟

آغا فواد کریم، آغا جان کا ولی عہد، جس نے اس کو بکاؤ مال بنایا، بلیک میل کر کے تمام جائیداد اپنے نام لکھوائی اور پھر اس کی گردن پہ پستول رکھ کر فرشتے کو دھمکایا، گھر سے نکلوایا اور بعد میں جانے وہ ہمایوں کو آ کر کیا کہہ گیا تھا کہ ہمایوں اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہ رہا تھا۔

"ہانڈی نہیں لگی تھی، شکر مالک کا۔" بلقیس تیزی سے واپس اندر داخل ہوئی تھی، اس نے خیالات سے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہائے کتنے سوہنے فوٹو ہیں، یہ آپ کے گھر والوں کے ہیں جی؟" وہ کھلے البم کو دیکھ کر اشتیاق سے اس کے کندھے کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور سر جھکائے دیکھنے لگی۔

"ہاں، میرے رشتہ دار ہیں۔" اس نے صفحہ پلٹا۔ اگلے صفحے پہ آرزو اور فواد، تائی اماں کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ خاندان کی کسی شادی کا فوٹو تھا۔

"یہ تو وہ ہیں!" بلقیس گویا حیرت زدہ رہ گئی۔

تب اسے یاد آیا، بلقیس نے ہی تو اسے فواد کے آنے کا بتایا تھا، شاید وہ اسے پہچان گئی تھی۔

"یہ آپ کی رشتہ دار ہیں جی؟ یہ تو ادھر آتی رہتی ہیں۔ کمال ہے، مجھے پتا ہی نہیں تھا۔"

"کون؟ یہ لڑکی؟" اسے حیرت ہوئی وہ تو سمجھی تھی کہ بلقیس فواد کی بات کر رہی ہے۔

"ہاں جی، یہ آرزو بی بی!" اس نے آرزو کے چہرے پہ انگلی رکھی۔

"ہاں، یہ میری کزن ہے اور یہ ساتھ فواد ہے جو ہمایوں کے پاس آیا تھا۔"

"آیا ہو گا جی۔" وہ ابھی تک اشتیاق سے آرزو کے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز میں ذرا سی لاپروائی تھی۔ یک دم محمل کو کچھ کھٹکا۔ اسے لگا وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔

"بلقیس، یہ وہ ہی بندہ ہے جو اس روز ہمایوں کے پاس آیا تھا، جب ہمایوں نے فرشتے کو ڈانٹا تھا؟" اس نے البم ذرا اس کے قریب کیا۔ "تمہیں یاد ہے تم نے مجھے بتایا تھا؟"

"نا جی، یہ تو کبھی نہیں آیا۔"

"یہ... یہ کبھی نہیں آیا؟" اسے جھٹکا لگا تھا۔ "تو پھر وہ کون تھا؟"

"پتا نہیں جی، کوئی آپ کا رشتہ دار تھا۔ آپ کے چچا، تایا کسی کا بیٹا تھا۔"

"میرے چچا کا بیٹا؟ ایک منٹ، یہ... یہ دیکھو۔" وہ جلدی جلدی البم کے صفحے پیچھے کو پلٹنے لگی۔ پھر حسن کی تصویر پہ رکی۔

"یہ تھا؟"

"نہیں جی، یہ تو بڑا بابو لوگ ہے بی بی، وہ تو عمر میں کم تھا۔"

"کیا مطلب کم تھا؟" وہ الجھی۔ بلقیس متذبذب سی کھڑی تھی جیسے اپنی بات صحیح نہ پہنچا پا رہی ہو۔

"اچھا، یہ تو نہیں تھا؟" اس نے ساتھ لگی وسیم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ بلقیس پہلے نا جی میں سر ہلانے لگی، پھر یک دم رک گئی اور چہرہ جھکا کر غور سے تصویر کو دیکھا۔ کافی دیر وہ تصویر بغور دیکھے گئی۔

"ہاں جی، یہ والا تھا، یہ ہی تھا۔"

"تو کیا وسیم؟" وہ ابھی حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ بلقیس نے معیز کی شکل پہ انگلی رکھی جو تصویر میں وسیم کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ سدرہ کی منگنی کی تصویر تھی۔

"معیز؟ وہ معیز تھا؟ معیز آیا تھا؟" وہ ششدر رہ گئی۔

"یہ ہی تھا بی بی، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ابھی ذرا بچہ لگ رہا ہے، مگر یہ شاید پرانی تصویر ہے جی، جب ادھر آیا تھا تو اس سے بڑا تھا، مسیں بھیگ رہی تھیں، قد بھی اونچا لمبا تھا، میں آپ کو کہہ رہی تھی نا کہ عمر میں کم تھا۔"

اور وہ تو ایسی دم بخود بیٹھی تھی کہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ تصویر میں معیز بارہ سال کا تھا، اب بیس کا ہو گا اور جب وہ ادھر آیا تھا تو یقیناً سترہ برس کا تھا۔ مگر وہ کیوں آیا؟ وہ کیوں ہمایوں سے لڑا؟ وہ دونوں کیوں بلند آواز میں جھگڑتے رہے؟

بہت سے سوال تھے جن کے جواب اسے معلوم نہ

تھے۔ بلقیس سے پوچھنا بے کار تھا۔ اس نے پہلے جب اس کے کزن کا ذکر کیا تھا تو ایسے تعظیم سے ان اور وہ آئے جیسے الفاظ استعمال کیے تھے کہ وہ بالکل غلط سمجھ بیٹھی۔ مگر خیر، بلقیس کا قصور نہیں تھا اور پتا نہیں کس کا قصور تھا۔

اس نے بے دلی سے البم بند کیا اور میز پہ رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

چمکیلی صبح برآمدے پہ پھسل رہی تھی۔ بلقیس پائپ لگائے سفید سنگ مرمر کا چمکتا برآمدہ دھو رہی تھی۔

وہ صبح ناشتے کا وقت تھا۔ ہمایوں کو اس کے کمرے میں ناشتا دے کر بلقیس اب ادھر مصروف تھی۔ تیمور کدھر تھا، اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ آج اپنی فجر کی تلاوت نہیں کر سکی تھی اور اب ادھر وہیل چیئر پہ بیٹھ کر وہ ہی کرنا چاہ رہی تھی، مگر بار بار دھیان بٹ جاتا تھا۔

بلقیس پائپ اٹھائے برآمدے سے نیچے اتر گئی۔ اب وہ ڈرائیو وے پہ پانی ڈال رہی تھی۔ برآمدے کے فرش پہ کہیں کہیں پانی چمک رہا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

ہمایوں عجلت بھرے مصروف انداز میں کف بند کرتا باہر آ رہا تھا۔ اس نے محمل کو ادھر بیٹھے دیکھا یا نہیں، اس کے بے نیاز انداز سے یہ پتا لگانا مشکل تھا۔

وہ سیدھا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

بلقیس نے جھاڑو اٹھائی اور بھاگ کر پائپ ڈرائیو وے سے ہٹایا۔ چوکیدار جو گھاس کاٹ رہا تھا، پھرتی سے آگے بڑھا اور گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیے۔

وہ گاڑی میں بیٹھا، زور سے دروازہ بند کیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی نکال کر لے گیا۔

گیٹ کے دونوں پٹ کھلے رہ گئے۔ چوکیدار نے ابھی انہیں بند نہیں کیا تھا، وہ واپس درانتی اٹھائے گھاس کی طرف آ گیا تھا۔

بلقیس پھر سے پائپ کا فوارہ سفید بجری کے ڈرائیو وے پہ ڈالنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر اپنی آیات کی طرف متوجہ ہوئی۔

مگر پھر پڑھتے پڑھتے نگاہ پھسلی، پہلے ناخنوں کے کناروں کو دیکھا، پھر ہاتھوں کو، پھر ان سے ہوتی ہوئی پیروں پہ جا ٹکی اور پھر سے پائپ کے پانی کی طرف بھٹک گئی۔

کھلے گیٹ کے اس پار سامنے والوں کا گیٹ بھی کھلا نظر آ رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں کسی سوچ میں گم ادھر دیکھے گئی۔ سامنے والوں کے گیٹ کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی، اس کے کندھے پہ پیارا سا پھولے پھولے گالوں والا بچہ تھا۔ ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھولے ایک گڈ لکنگ سا آدمی مسکرا کر انہیں کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑکی ہنس رہی تھی، پھر وہ آدمی جو غالباً اس کا شوہر تھا، گاڑی میں بیٹھ گیا اور لڑکی بچے کا ہاتھ پکڑ کر بائے بائے کے انداز میں گاڑی کی طرف ہلانے لگی۔ بچہ قلقاریاں مار رہا تھا۔ آدمی نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

ایک مکمل اور خوب صورت فیملی۔

وہ چپ چاپ ان تینوں کو دیکھے گئی، یہاں تک کہ گاڑی فراٹے بھرتی سڑک پہ آگے نکل گئی اور لڑکی بچے کو کندھے سے لگائے گیٹ بند کرنے لگی۔

اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور اپنی خاموش، بالکل خاموش نظریں واپس قرآن پہ جھکا دیں اور پڑھا کہ آگے کیا لکھا ہوا تھا۔

"اس کی طرف مت دیکھا کرو جو ہم نے دوسرے جوڑوں کو عطا کیا ہے۔"

محمل نے بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر سر اٹھایا۔ پھر ادھر ادھر گردن گھمائی، بلقیس اپنے کام میں مگن تھی اور چوکیدار اپنے کام میں، وہاں کسی نے اس کی ایک لمحے کی وہ نظر نہیں پکڑی تھی۔ مگر...

اس نے ذرا سی گردن اوپر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

مگر کوئی تھا جو اس کی لمحے بھر کے لیے بھٹکی نگاہ بھی پکڑ لیتا تھا اور کسی دوسرے کو بتاتا بھی نہیں تھا۔ خاموشی سے اسے تنبیہہ کر دیتا تھا۔ سمجھا دیتا تھا، بہت احسان تھے اس کے اس پر، وہ تو شکر بھی ادا نہیں کر سکتی

تھی۔

"بلقیس! آج کون سا دن ہے؟" ایک دم اسے خیال آیا تو اسے پکارا۔

"جمعہ ہے جی۔" وہ اب پائپ بند کر کے اسے سمیٹ رہی تھی۔

"اوہ اچھا۔" اسے یاد آیا' آج تو سورۂ کہف پڑھنی تھی۔ جانے وہ کیسے بھول گئی' وہ خود کو سرزنش کرتی قرآن کے صفحے پلٹنے لگی۔

چوکیدار گیٹ بند کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا اور بلقیس اندر' وہ برآمدے میں تنہا رہ گئی تھی' پہلے قرآن سے پڑھنے کا سوچا' مگر سورۂ کہف یاد تھی ہی' سو قرآن میز پہ رکھا اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

کبھی کبھی اس کو لگتا تھا کہ اس کی زندگی مصحف قرآنی کے گرد ہی گھومنے لگی ہے۔ اس کا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں اس کا کردار نہ ہو۔ ہر لمحے' ہر وقت وہ قرآن کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اب اس کے بغیر اس کا گزارہ بھی نہ تھا۔

آنکھیں موندے وہ بسم اللہ پڑھ کر سورۂ کہف پڑھنے لگی۔

اس ٹھنڈی صبح میں ہر طرف خاموشی اور میٹھی سی چاشنی چھا گئی تھی۔ وہ آنکھیں موندے اپنی تلاوت کر رہی تھی۔

"ام حسبت ان اصحب الکھف ــ"

"والرقیم...."

ابھی اس نے نویں آیت "اصحب الکھف" تک ہی پڑھی تھی کہ کسی نے اگلا لفظ "والرقیم" پڑھ دیا۔ اس کے ہلتے لب رک گئے۔ بہت حیرت سے چونکتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے کھلے دروازے میں تیمور کھڑا تھا۔

اپنے نائٹ سوٹ میں ملبوس' کچی نیند سے خمار آلود آنکھیں لیے وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

چند لمحوں کے لیے سارے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں بنا پتلیوں کو حرکت دیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

اور پھر اسی طرح تیمور کی بھوری آنکھوں کو نگاہوں میں لیے اس نے ہولے سے لب کھولے اور پھر سے وہ آیت دہرائی۔

"ام حسبت ان اصحب الکھف ــ" وہ دانستہ رکی تو تیمور کے ننھے سرخ ہونٹ حرکت کیے۔

"والرقیم۔"

"کانو من ایتنا عجبا" اس نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے آیت مکمل کی۔

تیمور اسی طرح ساکت سا مجسمے کی طرح کھڑا تھا جیسے برآمدے اور لان میں مبہوت ہوئی خلق کا حصہ ہو۔

"ادھر آؤ۔" وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ کسی معمول کی طرح آہستہ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا۔

اس نے اس کے ہاتھ تھامنے کو دونوں ہاتھ بڑھائے اور کسی سحر زدہ شخص کی طرح تیمور نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ اصحب الکھف کے بعد والرقیم آتا ہے؟"

وہ خاموش کھڑا رہا جیسے اسے خود بھی نہ معلوم ہو۔

"تمہیں سورۃ کہف آتی ہے؟" نرمی سے اس کے ہاتھ تھامے محمل نے پوچھا تو۔

اس نے آہستہ سے سر کو نفی میں ہلایا۔

"پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"It....it just slipped" (میرے منہ سے نکل گیا) وہ اٹک' اٹک کر بول رہا تھا۔ آنکھیں ابھی تک محمل کے چہرے پہ جمی تھیں۔

اسے یاد تھا کہ تیمور کی پریگنینسی میں وہ ہر جمعہ کو یوں ہی بیٹھ کر آنکھیں موندے بلند آواز میں سورۂ کہف پڑھا کرتی تھی' تاکہ وہ جنم لینے سے قبل ہی قرآن کا عادی ہو اور شاید وہ واقعی عادی ہو گیا تھا اور شاید سات سال بعد اس نے یہ آواز سنی تھی۔

"تمہیں اور سورتیں آتی ہیں؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ اپنے ہاتھ ابھی تک محمل کے ہاتھوں میں دیے کھڑا تھا۔

"تمہیں قرآن پڑھنا آتا ہے؟"

اس نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

"مسجد جاتے ہو یا کہیں اور سے سیکھا ہے؟"

"گھر پہ قاری صاحب لگوائے تھے ڈیڈی نے۔"

"کتنی دفعہ قرآن ختم کیا ہے؟"

"ٹو ٹائمز۔"

"کیا قاری صاحب کا قرآن بھی یوں ہی سنا کرتے تھے جیسے میرا سنتے ہو؟"

"نہیں۔ وہ بالکل اچھا نہیں بولتے تھے۔"

"اور میں؟"

"آپ.... آپ اچھا بولتی ہو۔" وہ اب بھی اٹک' اٹک کر بول رہا تھا۔

"اور فرشتے کا اچھا لگتا ہے؟"

"She never reads" (وہ کبھی نہیں پڑھتیں۔)

وہ recite (تلاوت) کو read (پڑھنا) کہہ رہا تھا' مگر وہ وقت اس کی غلطی نکالنے کا تھا' نہ ہی یہ بتانے کا کہ وہ کون سا تمہارے سامنے پڑھتی ہو گی' وہ لمحے تو بہت خاص تھے' ان کو ضائع نہیں کرنا تھا۔

"تم ایسا پڑھ سکتے ہو؟"

"نو!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"پڑھنا چاہتے ہو؟"

وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

محمل نے آہستہ سے اس کے ہاتھ چھوڑے۔

"چلو' کل صبح پھر پڑھیں گے۔" اور سر وہیل چیئر کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس نے سوچا کہ اسے کھلا چھوڑ دے۔ اگر وہ اس کا ہوا' تو واپس آجائے گا' نہ ہوا تو نہیں آئے گا۔

کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو تیمور ادھر نہیں تھا۔ فرش کا پانی سوکھ چکا تھا۔ چڑیاں اڑ گئی تھیں۔ سرخ کیڑے اپنے بلوں میں جا چکے تھے۔ چیونٹیاں بکھر گئی تھیں' سفید بلی بھی واپس چلی گئی تھی۔

"اور اللہ کی طرف بلانے والی بات سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے بھلا۔"

اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ دشمن کو دوست بنانے کا "احسن" طریقہ تو اسی آیت میں دے رکھا تھا' اس کی سمجھ میں ذرا دیر سے آیا تھا۔



اگلی صبح وہ لان میں پہلے سے موجود تھی۔ لان میں لاؤنج کی کھڑکی کھلتی تھی اور اس کے سامنے تیمور کا کمرا تھا۔ آواز کا راستہ صاف اور کھلا تھا۔

پچھلا پورا دن اس نے دانستہ تیمور کا سامنا نہیں کیا۔ وہ بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کی غالباً چھٹیاں تھیں' سو آج کل گھر پہ ہی ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کل قرآن سنا کر اس نے تیمور کو ذہنی طور پہ ڈسٹرب کر دیا ہے۔ اگر وہ واقعی قرآن کی چاہ رکھتا ہے تو اس کے اندر مزید سننے کی خواہش ضرور بھڑکے گی اور وہ خود ہی چل کر آئے گا۔ اس نے نو ماہ اسے قرآن سنایا تھا۔ وہ سات سالوں میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

بلقیس نے اسے لان میں ہی ٹیپ ریکارڈر سیٹ کر کے دے دیا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ تیمور جاگ چکا ہے یا ابھی سو رہا ہے' پھر بھی اس نے پلے کا بٹن دبایا اور آواز اونچی کر دی۔

قاری المشاری کی سورۂ کہف چلنے لگی تھی۔ گو کہ قاری حضرات اور بھی بہت اچھے تھے۔

مگر جو بات قاری مشاری کے دھیمے' پرسوز انداز میں تھی' وہ اسے دنیا میں کہیں نہیں ملی تھی۔ اور سورۂ کہف تو شروع ہوتی اور اس کے آنسو بہنے لگتے تھے۔

پہلا رکوع ابھی ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ برآمدے کا دروازہ کھلا اور تیمور بھاگتا ہوا برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گھاس پہ آیا۔ پھر اسے بیٹھے دیکھ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔

وہ کہنیوں تک آستینیں فولڈ کیے ہوئے تھا۔ جن کے کنارے اور اس کے بازو گیلے تھے' چہرہ اور ماتھے پہ گرے بال بھی گیلے تھے۔ پاؤں بھی دھلے لگ رہے تھے۔ شاید وہ وضو کرکے آیا تھا۔

اس نے مسکرا کر سر خم کرکے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

دونوں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے وہ مدھر' مترنم سی آواز سنتے رہے۔ جو غار والوں اور کتے والوں کا قصہ بیان کررہی تھی۔ ان چند نوجوانوں کا قصہ جو کہیں چلے گئے تھے۔ اور دو باغوں کے مالک کا قصہ جسے اپنے مال اور اولاد پہ بہت غرور تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جو اللہ کے ایک بندے سے ملنے اس جگہ کو ڈھونڈ رہے تھے جہاں مچھلی نے سمندر میں راستہ بنایا تھا۔ اور اس گردش کرنے والے آدمی کا قصہ جو سفر کرتا ہوا مشرق و مغرب تک جا پہنچا تھا۔

وہ چار قصے تھے جو قرآن کے درمیان میں رکھ دیے گئے تھے۔ جب وہ ختم ہوئے تو تیمور نے سر اٹھایا۔ محمل اب اسٹاپ کا بٹن دبا رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے' یہ کس کی آواز ہے؟"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ قاری مشاری تھے۔ تمہیں پتا ہے وہ کون ہیں؟"

اس نے پھر گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

"پہلے وہ سنگر تھے۔ پھر انہوں نے قرآن پڑھا تو گلوکاری چھوڑ دی اور قاری بن گئے۔ ان کے گیارہ مختلف ٹونز میں قرآن موجود ہیں' مگر مجھے یہ والی ٹون سب سے زیادہ پسند ہے' تمہیں پسند آئی؟"

"جی!" وہ بے ساختہ کہہ اٹھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ہی چیختا' بدتمیزی کرتا بچہ تھا جو اب جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

چند لمحے وہ خاموشی سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔ (آخر تھا تو وہ بچہ ہی' کتنا ناراض رہ سکتا تھا بھلا؟) اور پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھ سے ابھی تک خفا ہو؟"

تیمور نے آنکھیں اٹھا کر خاموشی سے اسے دیکھا' منہ سے کچھ نہ بولا۔

"کیوں خفا تھے مجھ سے؟"

وہ چپ رہا' بالکل چپ۔

"تمہیں میں بہت بری لگتی ہوں؟ تمہارا دل کرتا ہے کہ تم مجھے قتل کردو؟"

"تو... نیور!" وہ گھبرا کر کہہ اٹھا' پھر ایک دم چپ ہو کر لب کاٹنے لگا۔

"تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ تم میرے لیے اسپتال پھول لے کر آتے تھے' مجھ سے اتنی باتیں کرتے تھے' میرے ہاتھوں پہ پیار کرتے تھے' تمہیں بھول گیا ہے؟"

اس کی بھوری آنکھوں میں استعجاب پھیل گیا۔

"آپ کو سنائی دیتا تھا سب؟" زندگی میں پہلی دفعہ اس نے محمل سے یوں بات کی وہ اندر سے تڑپ کر رہ گئی۔

"تمہیں لگتا تھا کہ میں اپنے تیمور کی بات نہیں سنوں گی؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔ تردید نہیں کی' نہ وہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی' نہ ہی اسے مایوس کرنا چاہتی تھی۔

"آپ... آپ پھر اس رات بولتی کیوں نہیں تھیں' جب ڈیڈی نے مجھے مارا تھا؟ آپ کو سب سنتا تھا تو آپ بولتی کیوں نہیں تھیں؟" اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ غصے سے نہیں دکھ سے۔

"میں بول نہیں سکتی تھی' میں بیمار تھی۔ اور... اور... ڈیڈی نے تمہیں کیوں مارا تھا؟"

وہ تڑپ کر رہ گئی تھی' مگر بظاہر خود کو کمپوزڈ رکھا۔

"وہ اس چڑیل (چڑیل) سے شادی کررہے تھے۔ میں نے ان سے بہت لڑائی کی تھی۔"

اس کی موٹی موٹی بھوری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "وہ کہتے تھے وہ اس وچ سے شادی کرلیں گے۔ وہ آپ کو ڈائیورس کردیں گے۔ میں ان سے بہت لڑا تھا۔" اور ایک دم وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"تیمور!" وہ متحیر رہ گئی۔ اس نے کبھی اسے روتے نہیں دیکھا تھا۔

"ادھر آؤ میرے پاس۔"

وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چہرے پہ رکھے رو رہا تھا۔ محمل نے بے اختیار بازو بڑھا کر اس کے ہاتھ تھامے۔

"میرے پاس آؤ۔" اسے ہاتھوں سے تھام کر کھڑا کیا اور خود سے قریب کیا۔

"ڈیڈی نے کیوں مارا تمہیں؟"

"میں نے کہا تھا میں ان کو اور اس وچ کو گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری ماں بری عورت ہے۔ میں نے ان پہ بہت شاؤٹ کیا' تو انہوں نے مجھے ادھر تھپڑ مارا۔" اس نے ہاتھ اپنے آنسوؤں سے بھیگے گال پہ رکھا۔ محمل نے بے اختیار اس کا گال چوما۔ وہ بیٹھی رہی اور وہ اس کے ساتھ کھڑا رو رہا تھا۔

"تم پھر میرے پاس آئے تھے؟"

"ہاں' میں اتنی دیر تک آپ کے پاس روتا رہا تھا' بٹ یو ور سلیپنگ۔ آپ نے مجھے جواب نہیں دیا' آپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا' آپ بولتی نہیں تھیں' آپ نے مجھے پیار بھی نہیں کیا۔"

"اور تم مجھ سے ناراض ہوگئے؟" وہ ہچکیوں کے درمیان آنسو پونچھ رہا تھا۔

"میں تب بیمار تھی' بول نہیں سکتی تھی' لیکن اب میں تمہارے پاس ہوں نا' اب تو تم ناراض نہیں ہو؟" ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا۔

ایک دم ہی اس کے ادھورے وجود میں ٹھنڈک اتر آئی۔ اسے لگا وہ مکمل ہوگئی ہے' اب اسے کسی ہمایوں داؤد نامی شخص کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اس کا تیمور واپس مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دن بہت خوب صورت تھا۔ جب وہ دونوں خوب رو چکے' تو پھر مل بیٹھ کر خوب باتیں کیں' کبھی لان میں' کبھی ڈائننگ ٹیبل پہ' کبھی لاؤنج میں اور پھر تیمور کے کمرے میں۔

اس سے بات کرکے محمل کو پتا چلا تھا کہ اس کا یہ رویہ اس رات کا رد عمل تھا جو اس نے ہمایوں سے تھپڑ کھانے کے بعد محمل کو پکارتے گزاری تھی۔ شاید وہ ساری رات روتا رہا تھا' مگر اس کی ماں نے جواب نہیں دیا تو وہ اس سے بدظن ہوگیا۔ مگر بچہ تھا' آخر کتنی دیر ناراض رہ سکتا تھا۔ بالآخر اپنے اندر کا سارا لاوا نکال کر اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور یہ بدگمانی کی عادت تو اس نے اپنے ماں اور باپ دونوں سے ورثے میں لی تھی۔ اس کا قصور نہیں تھا۔

اس کی باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آرزو اور ہمایوں کے تعلق کو بھی جانتا ہے' مگر محمل دانستہ اس موضوع کو نہیں چھیڑتی تھی۔ محمل کو اب احساس ہوا تھا کہ تیمور غیر معمولی ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کے بارے میں خبر رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب ہمایوں نے اسے طلاق دی' کب اسے جھڑکا' کب اس پہ چلایا اور وہ سرد مہری ہر شے جو ان دونوں کے درمیان تھی' وہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اس سے نفرت ہے' مگر اس کے باوجود وہ اس کے ہر پل کی خبر رکھتا تھا۔

"اگر ڈیڈی نے آپ کی ڈائیورس واپس نہ لی تو آپ یہاں سے چلی جائیں گی؟" وہ دونوں تیمور کے کمرے میں بیٹھے تھے' جب اس نے بے حد اداسی سے کہا۔

"جانا تو ہے۔"

"پر ابھی تو اینڈ آف منتھ تو آپ ادھر ہی ہیں نا؟ آپ کی ڈائیورس کے تھری منتھس بعد تک آپ نے یہیں رہنا ہے نا؟"

وہ اپنی باتوں سے اسے حیران کردیتا تھا۔ اس کی عمر اتنی نہیں تھی' مگر وہ ہر بات سمجھتا تھا۔

"ہاں..."

"ابھی تو ہاف منتھ ہوا ہے' ابھی تو بہت ٹائم ہے' کیا پتا ڈیڈی ڈائیورس واپس لے لیں۔"

اس نے سوچا کہ اسے سمجھائے کہ پہلی طلاق واپس نہیں ہوتی، بلکہ اس میں رجوع ہو سکتا ہے، مگر اس کے ننھے دماغ کو خوامخواہ کہاں الجھاتی، سو بات بدل دی۔

''مجھے اپنی بکس دکھاؤ۔''

''آپ ٹاپک مت چینج کریں، میں آپ کو ساری بکس دکھا چکا ہوں۔''

''اوہ میرا مطلب تھا کہ کاپیز دکھاؤ۔''

''محمل... محمل۔'' اس سے پہلے کہ تیمور جواب دیتا، اس نے فرشتے کی آواز سنی جو باہر اسے پکار رہی تھی۔ اس کی وہیل چیئر دروازے سے ذرا دور تھی۔ سو اس نے تیمور کو اشارہ کیا۔

''بیٹا! دروازہ کھولو۔''

''پلیز، نو!'' اس نے برا سا منہ بنایا اور وہیں بیڈ پہ بیٹھا رہا۔

''محمل۔'' فرشتے کی آواز میں پریشانی تھی۔

''تیمور، پلیز دروازہ کھولو، خالہ بلا رہی ہیں۔'' وہ چاہتی تو فرشتے کو آواز دے لیتی، مگر ابھی وہ تیمور کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''شی از ناٹ مائی خالہ۔'' وہ منہ ہی منہ میں بدبداتا اٹھا، دروازہ آدھا کھول کر سر باہر نکالا اور غصے سے بولا۔

''واٹس رانگ ود یو؟''

''اوہ سوری سنی! میں محمل کو ڈھونڈ رہی تھی۔'' فرشتے کی خجل سی آواز آئی۔

''شی از ود می، پلیز ڈونٹ ڈسٹرب اَز۔ (وہ میرے ساتھ ہیں پلیز، ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔)'' اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر واپس مڑا تو محمل قدرے خفا سی اس کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ میری بہن ہے، تم اسے مجھ سے بات بھی نہیں کرنے دو گے بیٹا۔''

''آپ کیوں اس وچ نمبر ٹو کو پسند کرتی ہیں؟ میرا تو دل کرتا ہے اس سے کہوں اپنا بروم اسٹک اٹھائے اور یہاں سے چلی جائے۔'' بگڑ کر کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر دروازہ کھولا۔

''آجاؤ۔'' فرشتے کا چہرہ دکھائی دیا تو محمل نے مسکرا کر کہا۔

وہ حیران سی دروازے میں کھڑی تھی۔

''تم اور سنی... اوہ گاڈ... یہ سب کیسے ہوا؟'' وہ حیرت زدہ بھی تھی اور خوش بھی۔

''بس اللہ کا شکر ہے!'' اس نے مسکراہٹ دبا کر کندھے اچکائے، جیسے خود بھی اس خوش گوار واقعے پہ لاجواب ہو گئی ہو۔

''آئی ایم سو ہیپی محمل!'' فرط جذبات سے فرشتے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور اس سے پہلے کہ محمل جواباً کچھ کہہ پاتی، تیمور زور سے بولا۔ ''نو یو آر ناٹ، آپ جھوٹ بولتی ہو، مجھے سب پتا ہے۔'' فرشتے کا چہرہ ماند پڑ گیا۔

''سنی... تیمور...''

''یو مین گرل! جسٹ گو اوے!'' وہ ایک دم زور سے چلایا۔ فرشتے لب کاٹتی ایک دم پلٹی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

تیمور بھی غصے میں مٹھیاں بھینچے بیٹھا تھا۔ وہ گئی تو اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور قریب رکھا کاغذ اٹھا کر پھاڑ ڈالا۔ پھر اس کے ٹکڑے دروازے پہ دے مارے۔

محمل بغور اس کا رویہ دیکھ رہی تھی۔ وہ واپس آ کر بیڈ پہ بیٹھا تو اس نے اس کی رف کاپی اٹھائی، تین صفحے پھاڑے اور تیمور کی جانب بڑھائے۔

''لو ان کو بھی پھاڑو۔'' تیمور نے پہلے ذرا حیرت سے اسے دیکھا، پھر جھپٹ کر کاغذ پکڑے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

''یہ بھی پھاڑو۔'' وہ اس کی کاپی سے ایک ایک صفحہ نکال کر اسے پکڑاتی جا رہی تھی اور وہ وحشیانہ انداز میں اسے پھاڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا اور سر ہاتھوں پہ گرا دیا۔

محمل نے اس کی کاپی بند کر کے بیڈ پہ ڈال دی۔

''اٹھو، پانی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔''

اس کے اندر کا لاوا باہر آ چکا تھا۔ سو خاموشی سے

اٹھا اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا تو ہاتھ میں پانی سے بھرا شیشے کا گلاس تھا۔ محمل نے گلاس تھاما، پانی پیا اور پھر گلاس واپس اس کی طرف بڑھایا۔

"اس کو بھی دیوار پہ مارو اور توڑ دو۔"

تیمور لب کاٹتے اسے دیکھتا رہا، گلاس لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"اسے توڑنا چاہتے ہو؟"

"نو۔" اب وہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

"چلو، لان میں چلتے ہیں، میں تمہیں ایک اسٹوری بھی سناؤں گی۔"

اس کی بات پہ وہ مسکرا دیا، اور گلاس اس سے لے کر دروازہ کھولا، پھر ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ وہ آسودگی سے مسکراتی وہیل چیئر کے پہیوں کو دونوں ہاتھوں سے گھماتی آگے بڑھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ محمل کے ہاتھ میں قرآن کے قصوں کی کتاب تھی اور وہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تیمور کو سنا رہی تھی۔ ان گزرے چھ دنوں میں اس نے آہستہ آہستہ بہت سارے قصے اسے سنا ڈالے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ تیمور میں قرآن کا شوق پیدا ہو جائے۔

"اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل خالی ہو گیا۔"

دروازہ کھلنے کی آواز پہ وہ لاشعوری طور پہ رک گئی۔ جانتی تھی اس وقت کون آیا ہو گا۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"آگے بتائیں نا، ماما!" تیمور چند لمحوں کے انتظار کے بعد بے چین ہو گیا، اسی پل ہمایوں اندر داخل ہوا، بے ساختہ ہی محمل نے سر اٹھا لیا۔

وہ تھکا تھکا سا، سرخ آنکھیں لیے، آستین کہنیوں تک فولڈ کیے چلا آ رہا تھا۔ ان دونوں کو یوں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر ایک دم ٹھٹک کر رکا۔ آنکھوں میں واضح حیرت اور الجھن ابھری۔ وہ پچھلے دنوں کافی دیر سے گھر آ رہا تھا اور سوئے اتفاق وہ ان دونوں کی اس دوستی کے بارے میں کچھ جان سکا نہ ہی دیکھ سکا۔

محمل نے نگاہیں کتاب پہ جھکا لیں اور آگے پڑھنے لگی۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ تیمور صوفے سے اٹھا اور لپک کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو؟" کچھ دیر تک وہ دوسری طرف سنتا رہا، پھر سر ہلایا۔ "جی وہ ہیں، ایک منٹ!"

وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے محمل کی طرف گھوما۔ اسی پل ہمایوں کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"ماما! آپ کا فون ہے۔"

"کون ہے؟" وہ ذرا حیران ہوئی۔ اس کے لیے بھلا کہاں فون آتے تھے۔

"وہ کہہ رہے ہیں ان کا نام آغا فواد ہے۔" تیمور نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ تار لمبی تھی، ریسیور اس تک پہنچ ہی گیا۔

"آغا فواد؟" وہ بے یقینی سے بڑبڑائی، پھر ریسیور تھاما۔ کتنی ہی دیر وہ سن سی اسے کان سے لگائے بیٹھی رہی۔

"ہے۔۔۔ ہیلو۔" اور پھر بمشکل لفظ لبوں سے نکل ہی پایا تھا کہ کسی نے سختی سے ریسیور اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ محمل نے بری طرح چونک کر پیچھے دیکھا۔

"میرے گھر میں یہ سب نہیں ہو گا، یہاں سے جا کر جو بھی کرنا ہو کر لینا۔" ریسیور ہاتھ میں لیے درشتی سے کہتا وہ محمل کے ساتھ آغا فواد کو بھی سنا چکا تھا۔

وہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔ ہمایوں نے ایک شعلہ بار نگاہ اس پہ ڈالی اور ریسیور کھٹاک سے کریڈل پہ ڈال دیا۔ پھر جیسے آیا تھا، اسی طرح تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

تیمور خاموشی سے مگر بغور سب دیکھ رہا تھا، ہمایوں واپس ہو لیا تو وہ آہستہ سے محمل کی طرف بڑھا۔

"ماما!" اس نے ہولے سے محمل کا ہاتھ چھوا، پھر ہلایا۔

وہ اسی طرح شل سی بیٹھی تھی۔

"ایک دفعہ پہلے بھی ان کا فون آیا تھا آپ کے لیے، ڈیڈی نے تب ان کو کہا تھا کہ یہاں کوئی محمل نہیں رہتی، ماما! ڈیڈی ان کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وہ تو آپ کے کزن ہیں نا؟"

وہ ابھی تک سن تھی، پہلی دفعہ ہمایوں نے اتنی زہریلی بات کی تھی۔ یہ اتنا سارا زہر اس کے اندر کس نے بھر دیا تھا؟

"اچھا چھوڑیں نا، مجھے اسٹوری آگے سنائیں۔" وہ اس کے ساتھ صوفے پہ بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ ہلا کر اس کو متوجہ کیا۔ محمل نے سر جھٹک کر کتاب اٹھا لی۔

☼ ☼ ☼

وہ لان میں بیٹھی تھی اور تیمور پانی کا پائپ اٹھائے گھاس پہ چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ قطرے موتیوں کی طرح سبز تنکوں پہ گر رہے تھے۔ وہ چہرے پہ ڈھیروں سکون لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

امام شافعی کہتے تھے آزمائش جب بہت تنگ ہو جاتی ہے تو پھر وہیں سے کھل جاتی ہے، ٹھیک ہی کہتے تھے جب اسے زندگی میں گھپ اندھیر انظر آنے لگا تھا، وہیں پہ فجر کی پہلی کرن چمکی تھی۔ ہمایوں کی بے وفائی کا غم اب اتنا شدید نہیں رہا تھا جتنا اس سے قبل تھا۔ تیمور کی محبت مرہم کا کام کر رہی تھی۔

شام اتر رہی تھی جب اس نے گیٹ پہ آہٹ سنی تو گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ فرشتے نے باہر سے ہاتھ اندر کر کے گیٹ کا ہک کھولا تھا اور اب وہ دروازہ کھول کر داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا اور وہ اپنے مخصوص سیاہ عبایا اور اسکارف میں ملبوس تھی۔ جس میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ غالباً مسجد سے آ رہی تھی۔ اس وقت وہ ادھر پڑھانے جاتی تھی۔

"السلام علیکم، جلدی آ گئیں؟" اسے آتے دیکھ کر محمل نے مسکرا کر مخاطب کیا۔

"ہاں، بس ذرا تھک گئی تھی۔" وہ تھکان سے مسکرائی اسی کی طرف چلی آئی۔

"کھانا کھا لیں، آپ نے دوپہر میں بھی نہیں کھایا تھا۔"

"ہاں، کھاتی ہوں۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہہ کر انگلی سے کنپٹی سہلائی۔ اس کی مخروطی انگلی میں چاندی کی وہ ہی انگوٹھی تھی جو وہ اکثر دیکھتی تھی۔ جانے کیوں وہ محمل کو قدرے پریشان لگی تھی۔

"خیریت فرشتے؟ مجھے آپ ٹینس لگ رہی ہیں۔"

"نہیں تو۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ تب ہی فاصلے پہ کھڑے تیمور نے پائپ پھینکا اور ان کی طرف آیا۔

"وہ ٹینس بھی ہے تو آپ کیوں کیئر (پروا) کرتی ہیں؟ جسٹ لیو ہر الون!" وہ بہت غصے اور بدتمیزی سے بولا تھا۔ محمل نے فرشتے کی مسکراہٹ کو واضح ماند پڑتے دیکھا، اس کا دل دکھا۔

"تیمور، بیٹا! وہ تمہاری خالہ ہیں، ایسے بات۔۔۔"

"جسٹ گو! چلی جاؤ آپ یہاں سے۔" وہ پیر پٹخ کر چیخا۔ بالکل ہمایوں کا پرتو۔

"سوری سنی!" وہ شکستگی سے اٹھی، بیگ ہاتھ میں لیا اور تیز تیز قدموں سے لان کی روش پار کر گئی۔

"اور جہاں میری ماما ہوں، وہاں مت آیا کرو۔" وہ اس کے پیچھے چلایا تھا۔ محمل نے تاسف سے برآمدے میں دیکھا جہاں فرشتے دروازہ بند کر کے گم ہو گئی تھی۔ تیمور ابھی تک لب بھینچے برآمدے کو دیکھ رہا تھا۔

"اف۔۔۔ یہ لڑکا۔۔۔ کیسے سمجھاؤں اسے کہ تمہارے بڑے تمہارے دشمن نہیں ہیں۔" وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں اپنی وہیل چیئر پہ بیٹھی تھی۔ گود میں ٹوکری تھی جس میں مٹر رکھے تھے۔ تیمور بلقیس کے ساتھ مرکز تک گیا تھا۔ وہ مٹر چھیلتے ہوئے لاشعوری طور پہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

کچن کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہ ویسے بھی اس سمت میں بیٹھی تھی کہ لاؤنج سے نظر نہ آ سکتی تھی۔ تب ہی اسے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ قدموں کی چاپ بھی۔ پھر قریب آتی آوازیں۔۔۔ مٹر چھیلتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

"ایسا کب تک چلے گا ہمایوں؟" وہ آرزو تھی اور تنک کر کہہ رہی تھی۔

"کیا؟"

"انجان مت بنو۔ ہم کب شادی کر رہے ہیں؟" ان کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہ گئی۔ مٹر کے دانے ہاتھ سے پھسل گئے۔

"کرلیں گے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"

"کیا مطلب جلدی؟ اتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں اسے طلاق دیے ہوئے۔"

"اس کی عدت ختم ہولینے دو۔"

"اور کب ختم ہوگی وہ؟"

"ایک دو ہفتے رہتے ہیں۔" وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں وہیں لاؤنج کے وسط میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"کیا اس کی عدت کے ختم ہونے سے پہلے ہم شادی نہیں کر سکتے؟"

"نہیں!" اس کا انداز اتنا سرد مہر اور قطعی تھا کہ پل بھر کو آرزو بھی چپ رہ گئی۔

"مگر ہمایوں..." اس نے کہنا چاہا۔

"کہا نا نہیں!" وہ اب سختی سے بولا تھا۔ "اگر تمہیں منظور نہیں ہے۔ تو بے شک شادی نہ کرو۔ جاؤ چلی جاؤ۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

نہیں' ہمایوں' سنو' رکو۔" وہ بوکھلائی ہوئی سی اس کے پیچھے لپکی۔

سیڑھیاں چڑھنے کی آوازیں مدھم ہو گئیں... وہ دونوں اب اس سے دور جا چکے تھے۔

"ماما!" کتنی ہی دیر بعد تیمور نے اسے پکارا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم کب آئے؟" وہ سنبھلی۔

"ماما!" وہ آہستہ سے اس کے قریب آیا۔ "آپ رو رہی ہیں؟" اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے چہرے پہ گرتے آنسوؤں پہ رکھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ پتا نہیں کب یہ آنسو پھسل پڑے تھے۔

"آپ نہ رویا کریں۔" وہ اب آہستہ سے اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔ محمل بھیگی آنکھوں سے مسکرائی اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں تو نہیں رو رہی۔"

"آپ رو رہی ہیں۔ میں بچہ تھوڑی ہوں۔" وہ اس کی غلط بیانی پہ خفا ہوا۔

"اچھا' اب تو نہیں رو رہی۔ اور شاپ سے کیا لائے ہو؟"

"چپس!" اس نے چپس کا پیکٹ سامنے کیا۔

"اور میں اتنی دیر سے گیا ہوا ہوں پر آپ نے ابھی تک مٹر نہیں چھیلے یو آر ٹو سلو ماما!" اس نے مٹر کی ٹوکری اس کی گود سے اٹھائی اور کاؤنٹر پہ رکھ دی۔

"آئیں باہر چلتے ہیں۔"

"رہنے دو تیمور' میرا دل نہیں کر رہا۔"

"بلقیس بوا!" اس کی سنے بغیر بلقیس کو پکارنے لگا۔ "ماما کو باہر لے آؤ۔"

اور وہ اپنی ناقدری کا غم اندر ہی اندر دباتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

بڑے عرصے سے لائبریری کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کتنے ہفتوں سے سوچ رہی تھی کہ کسی دن کروالے' آج ہمت کر ہی لی۔

بلقیس کو تو کہنے کی دیر تھی۔ فوراً" لگ گئی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پہ وہیل چیئر پہ بیٹھی ہدایات دے رہی تھی۔

"یہ والی بکس اندر رکھ دو' اس طرف والی سامنے کر دو۔ میز سے یہ سب ہٹالو اور اس والے شیلف میں رکھ دو۔"

جھاڑ پونجھ سے گرد اڑ رہی تھی۔ سالوں سے کسی نے کتابوں کو صاف نہیں کیا تھا۔

"بی بی! ان کو تو کیڑا لگ گیا ہے۔" وہ پریشان سی کچھ کتابوں کے کنارے دکھا رہی تھی۔ تاریخ کی پرانی کتابیں۔

"ان کو الگ کر دو۔ اور وہ دراز خالی کرو' یہ اس میں رکھ دیں گے۔"

"اچھا جی!" بلقیس اب اسٹڈی ٹیبل کی درازوں سے کتابیں نکال رہی تھی۔

"ان کو اس آخری شیلف پہ نہ سیٹ کر دوں؟" اس نے دراز سے نکلنے والے کتابوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں کر دو۔" اسے بھلا کیا اعتراض تھا۔ بلقیس پھرتی اور انہماک سے کتابیں صاف کر کے اوپر لگانے لگی۔

ڈھیر ذرا ہلکا ہوا تو اسے ان کتابوں کے بیچ ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ رکھا نظر آیا۔

"یہ لفافہ اٹھا کر دو۔ شاید ہمایوں کے کام کا ہو۔" کتابیں سیٹ کرتی بلقیس رکی اور خاکی لفافہ اٹھا کر اسے تھمایا۔

لفافہ وزنی نہیں تھا مگر پھولا ہوا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

کوئی نام پتہ نہیں لکھا تھا۔ اوپر اکھڑی ہوئی سی ٹیپ لگی تھی جیسے کھول کر پھر لگا دی گئی ہو۔

"پتا نہیں کس کا ہے۔" بنا کسی تجسس کے محمل نے ٹیپ اتاری اور لفافہ گود میں الٹ دیا۔ ایک عدالتی کاغذ اور ساتھ ایک سفید خط کا کور گود میں گرا۔ اس نے زرد عدالتی کاغذ اٹھایا۔

اس کی تہیں کھولیں اور چہرے کے سامنے کیا۔ اسٹامپ پیپر کی تحریر کے نیچے بہت واضح سے دستخط تھے۔

"محمل ابراہیم۔"

"فرشتے ابراہیم۔"

وہ بری طرح سے چونکی اور تیزی سے اوپر تحریر پہ نگاہیں دوڑائیں۔

یہ وہی کاغذ تھا جو فواد نے اس سے اور فرشتے سے سائن کروایا تھا۔ وسیم سے نکاح نہ کروانے کی شرط پہ' اس کی گردن پہ پستول رکھ کر۔

مگر یہ ادھر ہمایوں کی لائبریری میں کیا کر رہا تھا؟ وہ تو اس معاملے سے قطعی لاعلم تھا۔ یہ موضوع کبھی زیر بحث آیا ہی نہیں' بس ایک دفعہ آغا جان کے گھر سے واپسی پہ ہمایوں نے اسے اپنا حصہ لینے کے لیے کہا تھا مگر وہ ٹال گئی تھی۔ اگر وہ براہ راست پوچھتا تو وہ بتا دیتی۔

پھر فرشتے نے بھی نہیں بتایا کہ یہ کاغذ اس کے ہاتھ کیسے لگا اور کیا وہ اسی کی وجہ سے اس سے بدظن تھا؟ مگر یہ اتنی بڑی وجہ تو نہیں تھی۔ اور یہ کاغذ ہمایوں کے ہاتھ لگا بھی کیسے یہ تو اس کے پاس تھا۔

اس نے دوسرا سفید لفافہ اٹھایا۔ وہ بے دردی سے چاک کیا گیا تھا اس نے اس کے کھلے منہ میں جھانکا۔ اندر کچھ فوٹو گراف تھے شاید۔

محمل نے لفافہ گود میں الٹ دیا۔ چند تصویریں اس کے گھٹنے پر سے پھسلتی فرش پہ جا گریں اس نے ہاتھ جھکا کر تصویروں کو اٹھایا اور سیدھا کیا۔

وہ فواد اور محمل کی تصاویر تھیں۔ فواد... اور... محمل...

وہ ساکت سی ان تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں وہ کچھ تھا جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا فواد اور اس کے کندھے پہ سر رکھے محمل... ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے فواد اور محمل... ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واک کرتی فواد اور محمل... اک ساتھ کسی شادی کی تقریب میں رقص کرتے... قابل اعتراض تصاویر... قابل اعتراض مناظر۔ وہ سب جو کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس نے پھر سے تصویروں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔

اس کا لباس اور چہرہ... ہر تصویر میں ذرا الگ تھا۔ کوئی بچہ بھی بتا سکتا تھا کہ وہ فوٹو شاپ یا اس قسم کی کس ٹرک کا کمال ہے۔ پہلی نظر میں واقعی پتا نہیں لگتا تھا۔ مگر بغور دیکھنے پہ صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ سب نقلی ہے ہمایوں خود ایک پولیس آفیسر تھا' وہ ان بچوں والی باتوں میں نہیں آسکتا تھا۔ اور کس نے لا کر دیں اس کو یہ تصاویر؟

کیا معیز جو ایک دفعہ آیا تھا' اسی لیے آیا تھا؟" اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

پزل کے سارے ٹکڑے ایک ساتھ جڑنے لگے۔

آرزو نے کہا تھا کہ وہ ہمایوں کو اس سے چھین لے گی۔ محمل کو سجا سنورا اور ہنستا بستا دیکھ کر وہ شاید شدید حسد کی آگ میں جلنے لگی تھی۔ اس سے اس کی خوشیاں برداشت نہیں ہو رہی تھیں پھر اسد چچا کی ناگہانی وفات کے بعد یقیناً" وہ لوگ مالی کرائسز کا شکار ہوئے ہوں گے۔ ایسے میں محمل کی طویل بے ہوشی نے آرزو کو امید دلائی ہوگی۔ اور شاید یہ سب ایک سوچا سمجھا پلان تھا۔

یہ جعلی تصاویر بنا کر، محمل اور فرشتے کا دستخط شدہ کاغذ ہمایوں کو دکھا کر اس نے ہمایوں کو بھڑکایا ہوگا۔ مگر کیا ہمایوں چھوٹا بچہ تھا جو ان کی باتوں میں آجاتا؟ کیا ایک منجھا ہوا پولیس آفیسر اس قسم کے بچکانہ کھیل کا شکار بن سکتا تھا؟ کیا بس اتنی سی باتوں پہ ہمایوں اتنا بدظن ہو گیا تھا؟ اپنی بیوی سے دوری اور آرزو سے بڑھتا ہوا التفات... پزل کا کوئی ٹکڑا اپنی جگہ سے غائب تھا۔ پوری تصویر نہیں بن رہی تھی۔

اس نے بے اختیار ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔

"بی بی، تسی ٹھیک ہو؟" بلقیس نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ چونکی۔

"ہاں، مجھے باہر لے جاؤ۔" اس نے جلدی سے تصویریں لفافے میں ڈالیں، مبادا بلقیس انہیں دیکھ نہ لے۔

پزل کا کوئی ٹکڑا واقعی غائب تھا۔

✵ ✵ ✵

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، جب بیرونی گیٹ پہ ہارن کی آواز سنائی دی۔ وہ جو دانستہ لاؤنج میں بیٹھی تھی، فوراً" الرٹ ہو گئی۔

ہمایوں کی گاڑی کی زن سے اندر داخل ہونے کی آواز... پھر لاک کی کھٹ کھٹ، وہ سر جھکائے بیٹھی تمام آوازیں سنتی گئی، یہاں تک کہ دروازے کے اس طرف بھاری بوٹوں کی چاپ قریب آگئی۔ اس نے بے چینی سے سر اٹھایا۔

وہ اندر داخل ہو رہا تھا، یونیفارم میں ملبوس، کیپ ہاتھ میں لیے، وہ چند قدم چل کر قریب آیا، اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر لمحے بھر کو رکا۔

"السلام علیکم، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"بولو۔" وہ اکھڑے تیوروں سے سامنے آکھڑا ہوا۔

"آپ بیٹھ جائیں۔"

"میں ٹھیک ہوں، بولو۔"

محمل نے گہری سانس لی اور الفاظ ذہن میں مجتمع کیے۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب چاہیے ہمایوں! بس ایک بار مجھے بتا دیں کہ آپ میرے ساتھ ایسے کیوں کر رہے ہیں۔" آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا۔

"کیا کر رہا ہوں؟"

"آپ کو لگتا ہے، آپ کچھ نہیں کر رہے؟"

"علیحدگی چاہتا ہوں، یہ کیا کوئی جرم ہے؟" وہ سنجیدہ اور بے نیاز تھا۔

"مگر... آپ اتنے کیوں بدل گئے ہیں؟ آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شکوہ کر بیٹھی۔

"پہلے میں کاٹھ کا الو تھا، جس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی تھی۔ ہوش اب آیا ہے، دیر ہو گئی مگر خیر۔"

"ہو سکتا ہے، کسی نے اب آپ کی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی ہو۔ آپ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیں۔" اس نے سوچا تھا وہ اس کی منت نہیں کرے گی مگر اب وہ کر رہی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس سے اسے بے حد محبت تھی، وہ اسے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

"صفائی کا موقع ان کو دیا جاتا ہے جن پہ شک ہو۔ مگر جن پہ یقین ہو، ان پہ صرف حد جاری ہوتی ہے۔" وہ بہت چبا چبا کر بولا تھا۔

"یہ آپ کی اپنی بنائی گئی حدود ہیں ایس پی صاحب! لوگوں کو ان کے اوپر نہ پرکھیں۔ کھوٹے کھرے کو الگ کرنے کا پیمانہ دل میں ہوتا ہے، ہاتھوں میں نہیں۔ کہیں آپ کو پچھتانا نہ پڑ جائے۔"

"کھوٹے کھرے کی پہچان مجھے بہت دیر سے ہوئی ہے محمل بی بی! جلدی ہوتی تو اتنا نقصان نہ اٹھاتا۔"

ان تین ماہ میں پہلی دفعہ اس نے محمل کا نام لیا تھا۔ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

"اگر میں کھوٹی ہوں تو جس کے پیچھے مجھے چھوڑ رہے ہیں، اس کے کھرے پن کو بھی ماپ لیجیے گا۔ کہیں پھر دھوکا نہ ہو جائے۔"

"وہ تم سے بہتر ہے۔" چند لمحے خاموش رہ کر وہ سرد لہجے میں بولا اور ایک گہری چبھتی ہوئی نگاہ اس پہ ڈال کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نم آنکھوں سے اسے زینے چڑھتے دیکھتی رہی۔ آج ہمایوں نے اپنی بے وفائی پہ مہر لگا دی تھی۔

✵ ✵ ✵

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے برش لیے مغموم گم صم سی بیٹھی تھی جب فرشتے نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

"میری چھوٹی بہن کیا کر رہی ہے؟" اس نے چوکھٹ سے ٹیک لگا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" محمل نے مسکرا کر گردن موڑی۔ اس کے کھلے بال شانوں پہ گرے تھے۔

"تو کچھ خاص کرتے ہیں۔" وہ اندر چلی آئی۔ فیروزی شلوار قمیص پہ سلیقے سے سر پہ دوپٹہ لیے وہ، ہمیشہ کی طرح، بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔

"تمہارے بال ہی بنا دوں لاؤ۔" اس نے رسان سے کہتے ہوئے برش محمل کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے کھلے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹا۔

"بس اب تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" وہ اب پیار سے اس کے بالوں میں اوپر سے نیچے برش کر رہی تھی۔ وہ محمل کی وہیل چیئر کے پیچھے کھڑی تھی، محمل کو آئینے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

"تم نے آگے کا کیا سوچا؟"

"پتا نہیں، جب عدت ختم ہو جائے گی تو چلی جاؤں گی۔" وہ بے زار ہوئی۔

"لیکن کدھر؟" فرشتے نے اس کے بالوں کو سلجھا کر ٹمسیٹ کر اونچا کیا۔

"اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے، پہلے آغا جان کو ڈھونڈوں گی، اگر وہ نہ ملے تو مسجد چلی جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ مجھے ہاسٹل میں رہنے دیا جائے گا۔"

"ہوں۔" اس نے اونچی سی پونی باندھی، پھر ان بالوں کو دوبارہ سے ذرا سا برش کیا۔

"اور آپ نے کیا سوچا؟ میرے بعد تو آپ کو بھی جانا ہوگا۔"

"میں شاید ورکنگ ویمن ہاسٹل چلی جاؤں، پتا نہیں ابھی کچھ ڈیسائیڈ نہیں کیا، خیر چھوڑو، آج میں نے چائنیز بنایا ہے، تمہیں منچورین پسند ہے نا؟ اب فٹافٹ چلو، کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے محمل کی وہیل چیئر پیچھے سے تھام کر اس کا رخ موڑا۔

اب وہ کیا بتاتی کہ عرصہ ہوا، ذائقے محسوس کرنا چھوڑ دیے ہیں۔ مگر ایسی مایوسی کی باتیں اللہ کو ناراض کر دیتی ہیں، اسی لیے چپ رہی۔ ہمایوں کی طرف سے دل اتنا دکھا ہوا تھا کہ ایسے میں فرشتے کا دھیان بٹانا اچھا لگا۔

ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا لگا ہوا تھا۔ گرم گرم چاولوں کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔

"تیمور کدھر؟" وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ پھر تھک کر بولی۔ "میں کیا کروں، جو وہ آپ کو ناپسند کرنا چھوڑ دے؟"

"یہ چاول کھاؤ، بہت اچھے بنے ہیں۔" فرشتے نے مسکرا کر ڈش اس کے سامنے رکھی۔ اس کا ضبط بھی کمال کا تھا۔

"تیمور کی ساری بدلحاظیوں پہ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

"اونہوں، جانے دو، میں مائنڈ نہیں کرتی، خالہ بھی ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔"

محمل بھیگی آنکھوں سے ہولے سے ہنس دی۔

فرشتے نے رک کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟ کیا نہیں

ہوتی؟"

"میرے بھانجے نہیں ہیں، ورنہ ضرور اپنی رائے دیتی، لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہی فرمایا ہے تو آف کورس ٹھیک ہے۔"

"کیا؟" فرشتے الجھی۔

"یہ ہی کہ خالہ ماں جیسی ہوتی ہے، یہ ایک حدیث ہے نا۔"

"وہ اچھا؟ مجھے بھول گیا تھا۔" فرشتے سر جھٹک کر مسکرا دی اور چاول اپنی پلیٹ میں نکالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ دن اپنی دانست میں "ہمایوں کے گھر میں" اس کا آخری دن تھا۔ کل دوپہر اس کی عدت کو تین قمری ماہ مکمل ہو جانے تھے اور تب وہ شرعی طور پہ ہمایوں کی بیوی نہ رہتی اور پھر اس گھر میں رہنے کا جواز بھی ختم ہو جاتا۔

آج وہ صبح اترتے ہی لان میں آبیٹھی تھی۔ چڑیاں اپنی مخصوص بولی میں کچھ گنگنا رہی تھیں۔ گھاس شبنم سے گیلی تھی۔ سیاہ بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پہ جابجا بکھری تھیں۔ امید تھی کہ آج رات بارش ضرور ہو گی۔

شاید اس کی اس گھر میں آخری بارش۔

فرشتے صبح جلد ہی کسی کام سے باہر گئی تھی۔ ہمایوں رات دیر سے گھر آیا تھا اور صبح سویرے نکل گیا تھا۔ تیمور اندر سو رہا تھا۔ اور بلقیس اپنے کوارٹر میں تھی۔ سو وہ لان میں تنہا اور مغموم بیٹھی چڑیوں کے اداس گیت سن رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی کانچ سی بھوری آنکھوں سے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

اس گھر کے ساتھ اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ زندگی کا ایک بے حد حسین اور پھر ایک بے حد تلخ دور اس نے گھر میں گزارا تھا۔ یہاں اسی ڈرائیو وے پہ وہ پہلی دفعہ سیاہ ساڑھی میں اتری تھی، اسی رات جب اس کی مشکلات کا آغاز ہوا تھا۔ پھر ادھر ہی وہ سرخ کام دار جوڑے میں دلہن بنا کر لائی گئی تھی، کبھی وہ ادھر ملکہ کی حیثیت سے بھی رہی تھی، مگر خوشی کے دن جلدی گزر جاتے ہیں، اس کے بھی گزر گئے تھے۔ ایک سیاہ تاریک نیند کا سفر تھا اور وہ بہت نیچے لا کر پھینک دی گئی تھی۔

"ماما۔" تیمور نیند بھری آنکھیں لیے اس کا شانہ جھنجوڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا، پھر مسکرا دی۔

"ہاں بیٹا!" اس نے بے اختیار پیار سے اس کا گال چھوا۔

"کیوں رو رہی ہیں اتنی دیر سے؟ کب سے دیکھ رہا ہوں۔" وہ معصومیت بھری فکر مندی لیے اس کے ساتھ آبیٹھا۔ وہ نائٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ غالباً ابھی جاگا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" محمل نے جلدی سے آنکھیں رگڑیں۔

"آپ بہت روتی ہیں ماما۔ ہر وقت روتی ہی رہتی ہیں۔" وہ خفا تھا۔

"مجھے لگتا ہے آپ دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ روتی ہوں گی۔"

"نہیں تو اور تمہیں پتا ہے کہ دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ آنسو کس انسان نے بہائے تھے؟"

"کس نے؟" وہ حیرت بھرے اشتیاق سے اس کے قریب ہوا۔

"تمہارے باپ آدم علیہ السلام نے جب ان سے اس درخت کو چھونے کی غلطی ہوئی تھی۔" وہ نرمی سے اس کے بھورے بالوں کو سہلاتی بتا رہی تھی، اسے تیمور کو اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا تھا، اس کا ذہن بٹانے میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔

"اچھا!" وہ حیران ہوا۔ "اور ان کے بعد؟"

"ان کے بعد داؤد علیہ السلام نے، جب ان سے ایک فیصلے میں ذرا سی کمی رہ گئی تھی۔"

"اور ان کے بعد؟"

"ان کے بعد؟" اس نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں بیٹا! یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ آپ بھی بہت روتی ہیں ماما مگر آپ کو پتا ہے آپ جیسی مدر کسی کی نہیں ہیں۔ میرے کسی فرینڈ کی بھی نہیں، کوئی ٹیچر بھی نہیں۔"

"میرے جیسی کیسی؟" اسے حیرت ہوئی۔

"آپ جیسی Noble اور Honourable۔ آپ کو پتا ہے، آپ میرے لیے پوری دنیا میں سب سے زیادہ آنریبل اور نوبل ہیں۔"

"جبکہ میں ایسی نہیں ہوں۔ تمہیں پتا ہے، noble کون تھے؟"

محمل نے ایک گہری سانس لی۔

"یوسف علیہ السلام جو پیغمبر کے بیٹے، پیغمبر کے پوتے اور پیغمبر کے پرپوتے تھے۔"

"وہ کیوں ماما؟"

"وہ کیوں؟" اس نے زیر لب اس کا سوال دہرایا۔ بے اختیار آنکھوں میں اداسی چھا گئی۔ "کیونکہ شاید وہ بہت صبر کرنے والے تھے اور الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی۔

"بتائیں نا ماما۔" وہ بے چین ہوا۔ "میں جب بھی آپ سے حضرت یوسف کی اسٹوری سنتا ہوں۔ آپ یوں ہی اداس ہو جاتی ہیں۔"

"پھر کبھی بتاؤں گی، تمہارا اسکول کب کھل رہا ہے؟" اس نے بات پلٹ دی۔

"منڈے کو۔"

"اور تمہارا ہوم ورک ڈن ہے؟"

"یہ باتیں چھوڑیں، مجھے پتا ہے آپ اپ سیٹ ہیں۔ کل آپ اور ڈیڈی ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے، ہے نا؟" وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے، اداسی سے بولا۔

"ہاں! ہو تو جائیں گے، تم میرے ساتھ چلو گے یا ڈیڈی کے پاس رہو گے؟" اس نے خود کو بے پروا ظاہر کرنا چاہا۔

"میں آپ کے ساتھ جاؤں گا، اس چڑیل کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ مجھے پتا ہے ڈیڈی فوراً شادی کر لیں گے۔" اسے شاید آرزو بہت بری لگتی تھی۔ وہ محمل کو اس پہ ترجیح دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا، ہمایوں نے کہا تھا، وہ اس سے بہتر ہے۔

"وہ مجھ سے بہتر ہے تیمور؟" وہ ہمایوں کی اس زہریلی بات کو یاد کر کے پھر سے دکھی ہو گئی۔

"کون؟" تیمور کی سفید بلی بھاگتی ہوئی اس کے قدموں میں آبیٹھی تھی۔ وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا۔

"آرزو۔" بہت دفعہ سوچا تھا کہ بچے سے یہ معاملہ ڈسکس نہیں کرے گی، مگر رہ نہیں سکی۔

"آرزو آنٹی؟" تیمور بلی کو بازوؤں میں اٹھا کر سیدھا ہوا۔ "وہ جو آپ کی کزن ہیں، جو ادھر آتی ہیں؟"

"ہاں، وہ ہی۔"

"وہ آپ سے اچھی تو نہیں ہیں، نہیں، بالکل نہیں۔" وہ سوچ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"پھر تمہارے ڈیڈی کیوں اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟ کیا تم اسے ماں کے روپ میں قبول کر سکو گے؟" کتنا خود کو سمجھایا تھا کہ بچے کو درمیان میں انوالو نہیں کرے گی، مگر ہمایوں کی اس روز کی بات ابھی تک کہیں اندر چبھ رہی تھی، لیکن پھر کہہ کر خود ہی پچھتائی۔

"چھوڑو، جانے دو، یہ بلی ادھر دکھاؤ۔"

مگر تیمور الجھا الجھا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ بلی ابھی تک اس کے بازوؤں میں تھی۔

"ڈیڈی، آرزو آنٹی سے شادی کر رہے ہیں؟" اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی۔

"تمہیں نہیں پتا؟"

"آپ کو یہ کس نے کہا ہے؟" وہ کنفیوزڈ بھی تھا اور حیرت زدہ بھی۔

"تمہارے ڈیڈی نے بتایا تھا اور ابھی تم خود کہہ رہے تھے کہ وہ اس سے شادی کر لیں گے۔"

تیمور اسی طرح الجھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ موٹی بلی اس کے ننھے ننھے ہاتھوں سے پھسلنے کو بے تاب کسمسا رہی تھی۔

"آرزو آنٹی سے؟ نہیں ماما' ڈیڈی تو ان سے شادی نہیں کر رہے۔"

"مگر تم نے۔" لیکن تیمور کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"وہ تو فرشتے سے شادی کر رہے ہیں' آپ کو نہیں پتا؟"

اسے لگا کسی نے ڈھیروں پتھر اس کے اوپر لڑھکا دیے ہوں۔

"تیمور!" وہ درشتی سے چلائی تھی۔ "تم ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟"

بلی سہم کر تیمور کے بازوؤں سے نیچے کودی۔

"آپ کو نہیں پتا ماما؟" وہ اس سے بھی زیادہ حیران تھا۔

"تم نے ایسی بات کی بھی کیسے؟ مائی گاڈ' وہ میری بہن ہے' تم نے اتنی غلط بات کیوں کی اس کے بارے میں؟" غصہ اس کے اندر سے ابلا تھا۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتی کہ تیمور ایسے کہہ سکتا ہے۔

"ماما! آپ بے شک ڈیڈی سے پوچھ لیں' فرشتے سے پوچھ لیں۔ وہ دونوں شادی کر رہے ہیں۔"

"شٹ اپ' جسٹ شٹ اپ' تم اس لڑکی کے بارے میں ایسی بات کر رہے ہو جو میری بہن ہے؟"

"جی ماما! اسی لیے تو ڈیڈی نے آپ کو ڈائیورس دی ہے' بی کاز شی از یور سسٹر' اور مسلم ایک ٹائم پہ دو سسٹرز سے شادی نہیں کر سکتے۔"

محمل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔

"آئی تھاٹ' آپ کو پتا ہے' میں نے آپ کو کہا تو تھا کہ ڈیڈی اس چڑیل سے شادی کر رہے ہیں۔"

اور تیمور فرشتے کو بھی چڑیل کہتا تھا' وہ کیوں بھول گئی؟ اس کا دماغ بری طرح چکرانے لگا تھا۔

"نہیں تیمور' وہ میری بہن ہے۔" اس کی زبان لڑکھڑائی۔

"وہ اسی لیے تو ادھر ہمارے ساتھ رہتی ہے' تاکہ جب آپ چلی جائیں تو وہ ڈیڈی سے شادی کر لے۔"

"مگر تیمور' وہ میری بہن ہے۔" اس کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔

"آپ نے نہیں دیکھا' جب وہ ڈیڈی کے ساتھ شام کو باہر جاتی ہیں؟" ایک دفعہ وہ مجھے بھی لے گئے تھے' وہ سمجھتے ہیں میں بچہ ہوں' مجھے کچھ پتا نہیں چلتا۔"

"مگر تیمور! وہ تو میری بہن ہے۔" وہ بکھری' شکست خوردہ سی' گھٹی گھٹی آواز میں چلائی تھی۔ اسے لگ رہا تھا' کوئی دھیرے دھیرے اس کی جان نکال رہا ہے۔ تیمور کیا کہہ رہا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے اسی لیے وہ اچھی نہیں لگتی' وچ نمبرون' اس کی وجہ سے ڈیڈی آپ کو سیپریٹ کر رہے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا' جب وہ شام کو ڈیڈی کے ساتھ باہر ریسٹورنٹ جاتی ہے؟"

"نہیں' تم غلط کہہ رہے ہو' شام کو تو وہ مسجد جاتی ہے' وہ ادھر پڑھاتی ہے۔"

اسے یاد آیا' شام کو فرشتے مسجد جاتی تھی۔ یقیناً تیمور کو غلط فہمی ہوئی ہو گی' اس نے غلط سمجھا ہو گا۔

"مسجد؟" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"یہ ساتھ والی مسجد؟ ماما' آپ کدھر رہتی ہیں؟ فرشتے تو کبھی مسجد نہیں گئی۔"

"وہ۔ وہ ادھر قرآن پڑھاتی ہے' تمہیں نہیں پتا' تیمور' وہ۔"

"وہ تو کبھی قرآن نہیں پڑھتی' میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔"

"نہیں! وہ مجھ سے اور تم سے زیادہ قرآن پڑھتی ہے۔ اس نے۔۔۔ اس نے ہی تو مجھے قرآن سکھایا تھا۔ تم غلط کہہ رہے ہو' وہ ایسے نہیں کر سکتی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے' اسے جھٹلا رہی تھی۔

"آپ نے کبھی اس کو قرآن پڑھتے دیکھا؟ مسجد جاتے دیکھا؟"

"وہ۔۔۔" وہ جو فرشتے کے دفاع میں' تیمور کو جھٹلانے کے لیے کچھ کہنے لگی تھی' ایک دم رک گئی۔

اس نے اسپتال سے آ کر کبھی فرشتے کو مسجد جاتے

نہیں دیکھا تھا، کبھی قرآن پڑھتے نہیں دیکھا تھا، ہاں نمازیں وہ ساری پڑھتی تھی۔

"کم آن ماما، آپ بلقیس بوا سے پوچھ لیں، وہ مسجد نہیں جاتی، کیا آپ کو اس نے خود کہا ہے کہ وہ مسجد جاتی ہے؟" اور تیمور کے سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

"ہسپتال کی وجہ سے صبح کی کلاسز لینا ممکن نہیں تھا۔" فرشتے نے تو اس کے استفسار پہ مبہم سا جواب دیا تھا۔ باقی سب اس نے خود فرض کر لیا تھا۔

تو کیا تیمور سچ کہہ رہا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں، فرشتے اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو اس کی بہت پیاری، بہت خیال رکھنے والی بہن تھی، وہ بھلا کیسے۔

"وہ مسجد نہیں جاتی، وہ ڈیڈی کے ساتھ جاتی ہے، پہلے ڈیڈی گاڑی پہ نکلتے ہیں، پھر وہ باہر نکلتی ہے، اور کالونی کے اینڈ پہ ڈیڈی اس کو پک کر لیتے ہیں، تاکہ بلقیس بوا کو پتا نہ چلے۔ میں نے ٹیرس سے بہت دفعہ دیکھا ہے، صبح بھی وہ ڈیڈی کے ساتھ ہی گئی تھی۔"

وہ پتھری بنی سن رہی تھی۔

"جب آپ اسپتال میں تھیں تب بھی وہ یوں ہی کرتے تھے۔ پر میں کوئی چھوٹا بے بی تو نہیں ہوں، مجھے سب سمجھ آتا ہے۔"

"یہ سب کب ہوا؟ کیسے ہوا؟" وہ متحیر، بے یقین سی سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ تیمور آگے بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا، مگر وہ نہیں سن رہی تھی، تمام آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ سب چہرے مٹ گئے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا، سناٹا تھا۔

"ماما! آپ ٹھیک ہو؟" تیمور نے پریشانی سے اس کا ہاتھ ہلایا۔ وہ ذرا سی چونکی۔ آنکھوں کے آگے جیسے دھند سی چھا رہی تھی۔

"مجھے... مجھے اکیلا چھوڑ دو بیٹا۔" اس نے بے اختیار چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ "ابھی... ابھی جاؤ یہاں سے پلیز۔"

چند لمحے وہ اداسی سے اسے دیکھتا رہا، پھر جھک کر گھاس پہ بیٹھی موٹی سفید بلی اٹھائی اور واپس پلٹ گیا۔

"کیا یہ ہی واحد وجہ ہے؟"

"کیا تمہیں بالکل امید نہیں ہے کہ وہ رجوع کرے گا؟"

"کیا تم خود کو اتنا اسٹرانگ فیل کرتی ہو کہ حالات کا مقابلہ کر لو گی؟" اس کے ذہن میں فرشتے کی باتیں گونج رہی تھیں۔

ہر شام ہمایوں گھر سے چلا جاتا۔ کسی دوست کے پاس، ہر شام فرشتے بھی گھر سے چلی جاتی۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کدھر جاتی ہے۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ محمل کی عدت ختم ہونے کے بعد کدھر جائے گی؟ اور وہ ابھی تک ادھر کیوں رہ رہی تھی؟ کیا صرف محمل کی کیئر کے لیے؟ وہ کیئر تو کوئی نرس بھی کر سکتی تھی۔ پھر وہ کیوں ان کے گھر میں تھی؟ اس نے کبھی فرشتے کو قرآن پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔

جس روز وہ مسجد گئی تھی۔ فرشتے ادھر نہیں تھی۔ وہ شام تک وہیں رہی، مگر وہ ادھر نہیں آئی۔ وہ غلط فہمی کا شکار رہی اور فرشتے نے اس کی غلط فہمی نہیں دور کی۔

اور آرزو؟ اس کا کیا قصہ تھا؟ وہ گواہ تھی کہ ہمایوں اس سے شادی کر رہا تھا۔ اس نے خود آرزو سے یہی کہا تھا مگر جب محمل نے پوچھا تھا تب اس نے کیا کہا تھا، "یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔" اس نے کبھی نہیں کہا کہ وہ آرزو سے شادی کر رہا ہے۔ فرشتے نے کبھی اس کے اور آرزو کے غیر واضح تعلق پہ فکر مندی نہیں ظاہر کی۔ وہ سب کسی سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ تھا، وہ دونوں جانتے تھے اور ایک اسی کو بے خبر رکھا تھا۔ وہ تم سے بہتر ہے۔ یہ ہی کہا تھا ہمایوں نے اور وہ یقیناً "فرشتے" کی بات کر رہا تھا۔

لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ وہ اس کے گھر میں خیانت کیسے کر سکتی ہے؟ وہ تو قرآن کی حاملہ تھی، وہ تو سچی تھی، وہ تو امانت دار تھی۔ پھر وہ کیوں بدل گئی؟ وہ جو لمحوں کی امانت کا خیال رکھتی تھی، رشتوں میں خیانت کیسے کر گئی؟

سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ آج اسے لگا تھا کہ سب دھوکے باز نکلے تھے، سب خود غرض نکلے تھے۔ ہر شخص اپنی زمین کی طرف جھکا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں، وہ کتنی ہی دیر ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھی رہی۔

بہت سے لمحے سرکے، تو اسے یاد آیا کہ جہاں سب بدل گئے تھے، وہاں کوئی نہیں بھی بدلا تھا۔ جہاں سب نے دھوکا دیا، وہاں کسی نے اس کا خیال بھی رکھا تھا۔ جہاں سب ساتھ چھوڑ گئے۔ وہاں کسی نے سہارا بھی دیا تھا۔

"اوہ!" اس نے آہستہ سے سر اٹھایا اور پھر دھیرے سے ویل چیئر کے پہیوں کو اندر کی جانب موڑا۔ اس کے کمرے میں شیلف کے اوپر اس کا سفید جلد والا مصحف قرآن رکھا تھا۔ اس نے سرعت سے اسے اٹھایا۔ اس وقت اسے اس کی بے حد ضرورت تھی۔

مصحف کے نیچے اس کا پرانا رجسٹر رکھا تھا۔ اس نے قرآن اٹھایا تو رجسٹر پھسل کر نیچے جا گرا۔ محمل نے ایک ہاتھ میں قرآن پکڑے، جھک کر رجسٹر اٹھایا۔ وہ درمیان سے کھل گیا تھا۔ اسے بند کر کے واپس رکھتے ہوئے وہ ٹھہر سی گئی۔ کھلے صفحے پہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر لکھی تھی جس پہ وہ ہمیشہ الجھتی تھی۔ حطۃ اور حنطۃ۔ یہ صفحہ بہت دفعہ کھولنے کے باعث اب رجسٹر کھولتے ہی یہ کھل جاتا تھا۔

کھلا ہوا رجسٹر اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور قرآن بائیں میں، دونوں اس کے بالکل سامنے تھے۔ رجسٹر کی سطر حنطۃ کا مطلب ہوتا ہے گن۔ کے آگے صفحہ ختم تھا۔ وہ بے اختیار اس سطر کو قرآن کے سفید کور کے قریب لائی جہاں مٹا مٹا سا م لکھا تھا۔

اس نے گن اور م کو ملایا۔ دونوں کے درمیان ایک، ایک ننھا سا نقطہ تھا۔ اس نے نقطوں کو جوڑا، ادھورا لفظ مکمل ہو گیا۔

"گندم"

وہ ننھے نقطے دال کے دو حصے تھے۔

اسے یاد آیا وہ غلطی سے قرآن پہ رجسٹر رکھ کر لکھ رہی تھی۔ صفحہ ختم ہوا تو لاشعوری طور پہ اس نے لفظ قرآن کے کور پہ مکمل کر دیا۔ اسی وقت اسے کلاس انچارج سے ڈانٹ پڑی تو یہ بات ذہن سے محو ہو گئی۔ وہ کبھی جان ہی نہ پائی کہ یہ مٹا مٹا سا م اس ادھورے لفظ کی تکمیل تھا۔

آج برسوں بعد وہ قصہ مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک روشنی کا کوندا سا لپکا تھا اور ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

بنی اسرائیل کو شہر کے دروازے میں داخل ہونے سے قبل بخشش مانگنے کا حکم ملا تھا۔ مگر وہ گندم مانگتے رہے۔ بخشش نہیں مانگی۔ یہ بنی اسرائیل کی ریت تھی اور یہ ہی ریت خود اس نے بھی دہرائی تھی۔

ہم زمانہ جاہلیت سے دور اسلام میں آ کر ایک ہی دفعہ توبہ کرتے ہیں، ساری عمر پھر عمل صالح تو کرتے رہتے ہیں، مگر بار بار کی توبہ بھول جاتے ہیں، ہم ایک کھائی سے بچ کر سمجھتے ہیں کہ زندگی میں پھر کبھی کھائی نہیں آئے گی اور اگر آئی تو بھی ہم بچ جائیں گے۔ ہم ہمیشہ نعمتوں کو اپنی نیکیوں کا انعام سمجھتے ہیں اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا... اس دنیا میں جزا بہت کم ملتی ہے اور اس میں بھی امتحان ہوتا ہے، نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے اور مصیبت صبر کا اور زندگی کے کسی نئے امتحان میں داخل ہوتے ہی منہ سے پہلا کلمہ حطۃ کا نکلنا چاہیے۔ مگر ہم وہاں بھی گندم مانگنے لگتے ہیں۔

اللہ اسے زندگی کے ایک مختلف فیز میں لایا تو اسے بخشش مانگنی چاہیے تھی۔ مگر وہ "ہمایوں" اور "تیمور" کو مانگنے لگ گئی۔ حنطۃ حنطۃ کہنے لگ گئی۔ گندم مانگنا برا نہیں تھا۔ مگر پہلے بخشش مانگنی تھی۔ وہ پہلا زینہ چڑھے بغیر دوسرے کو پھلانگنا چاہ رہی تھی اور ایسے پار کب لگا جاتا ہے؟

اسے نہیں معلوم وہ کتنی دیر تک میز پہ سر رکھے زار و قطار روتی رہی، آج اسے اپنے سارے گناہ پھر سے یاد آ رہے تھے۔ آج وہ پھر سے توبہ کر رہی تھی۔ وہ توبہ جو بار بار کرنا ہم "نیک" بننے کے بعد بھول جاتے

ہیں۔

زندگی میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب آپ سے خود قرآن نہیں پڑھا جاتا۔ اس وقت آپ کسی اور سے قرآن سننا چاہتے ہیں۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ کوئی آپ کے سامنے کتاب اللہ پڑھتا جائے اور آپ روتے جائیں۔ بعض دفعہ آپ خوش ہونے کے لیے اس کے پاس جاتے ہیں اور بعض دفعہ صرف رونے کے لیے۔

اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ خوب روئے۔ قرآن سنتی جائے اور روتی جائے۔ تلاوت کی کیسٹوں کا ڈبہ قریب ہی رکھا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ بھی ساتھ تھا۔ اس نے بنا دیکھے آخر سے ایک کیسٹ نکالی اور بنا دیکھے ہی ڈال دی۔ ابھی نہ وہ معانی جاننا چاہتی تھی' نہ ہی فہم پہ غور و فکر کرنا چاہتی تھی۔ ابھی وہ صرف سننا چاہتی تھی' صرف رونا چاہتی تھی۔

اس نے پلے کا بٹن دبایا اور سر میز پہ رکھ دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر میز کے شیشے پہ گر رہے تھے۔ قاری صہیب احمد کی پر ردھم' پرسوز آواز دھیرے سے کمرے میں گونجنے لگی تھی۔ "والضحیٰ۔۔۔ قسم ہے دن کی۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اسے اپنی زندگی کے روشن دن یاد آ رہے تھے' جب وہ اس گھر کی ملکہ تھی۔

"اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔"

اس کو وہ سناٹے بھری رات یاد آئی جب ہمایوں نے اسے طلاق دی تھی' وہ رات جب وہ یہیں بیٹھی چھت کو دیکھتی رہی تھی۔

تمہارے رب نے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہے۔ (الضحیٰ 3)

اس کے آنسو روانی سے گرنے لگے تھے۔ یہ کون تھا جو اس کی ہر سوچ پڑھ لیتا تھا؟ یہ کون تھا؟

"یقیناً" تمہارے لیے انجام آغاز سے بہتر ہو گا۔"

(الضحیٰ 4)

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ کیا واقعی اب بھی اس سارے کا انجام اچھا ہو سکتا تھا؟

"تمہارا رب بہت جلد تمہیں وہ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔" (الضحیٰ 5)

ذرا چونک کر بہت آہستہ سے محمل نے سر اٹھایا۔

اللہ کو اس کی اتنی فکر تھی کہ وہ اس کے اداس دل کو تسلی دینے کے لیے یہ سب اسے بتا رہا تھا؟ کیا وہ واقعی اس سے ناراض نہیں تھا؟ کیا واقعی اس نے اسے چھوڑا نہیں تھا؟

"کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر ٹھکانا نہیں دیا؟" (الضحیٰ 6)

وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔ یہ۔۔۔ یہ سب۔۔۔ اتنا واضح' اتنا صاف' یہ سب اس کے لیے اترا تھا؟ کیا وہ اس قابل تھی؟

کیا اس نے تمہیں راہ گم پا کر ہدایت نہیں دی؟ (الضحیٰ 7)

وہ ساکت سی سنے جا رہی تھی' ہاں' یہ ہی تو ہوا تھا۔

"اور تمہیں نادار پا کر غنی نہیں کر دیا؟ (الضحیٰ 8)

اس کے آنسو گرنا رک گئے تھے۔ کپکپاتے لب ٹھہر گئے تھے۔

"پس تم بھی یتیم پہ سختی نہ کرنا' اور سائل کو مت ڈانٹنا۔ اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتے رہنا۔"

(الضحیٰ 9)

سورۃ الضحیٰ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری کہانی گیارہ آیتوں میں سمیٹ کر اسے سنا دی گئی تھی۔ وہ سورۃ جیسے ابھی ابھی آسمانوں سے اتری تھی' اس کے لیے' صرف اس کے لیے۔

اس نے تھک کر سر کرسی کی پشت پہ گرا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ کچھ دیر ہر سوچ سے بے نیاز سونا چاہتی تھی۔

پھر اٹھ کر اسے فرشتے سے ملنا تھا۔

☼ ☼ ☼

بادل زور سے گرجے تھے۔

محمل نے ایک نظر کھڑکی سے باہر پھسلتی شام پہ ڈالی اور دوسری بند دروازے پہ۔ اس کی دوسری طرف اسے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ابھی چند منٹ قبل اس نے فرشتے کو گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے آنے کے کچھ دیر بعد ہمایوں کی گاڑی اندر داخل ہوئی تھی۔ البتہ وہ بمشکل ایک منٹ بعد ہی کچھ کاغذات اٹھا کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کی گاڑی ابھی ابھی نکلی تھی۔

وہ کھڑکی کے اس طرف چوکیدار کو گیٹ بند کرتے دیکھ رہی تھی' جب دروازہ ہولے سے بجا۔

"محمل؟" فرشتے نے اپنے مخصوص نرم انداز میں پکارا' پھر ہولے سے دروازہ کھولا۔ اب وہ کثرت سے سلام نہیں کرتی تھی۔ محمل نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ دراز قد' کانچ سی سنہری آنکھوں والی لڑکی' جو کھلتے گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس' سر پہ دوپٹہ لیے کھڑی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی' اسے انکار والے کہی جاتی۔

"کیسی ہو؟" نرم سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے وہ اندر داخل ہوئی۔

"تمہیں بتا رہی تھی' تم میرا پوچھ رہی تھیں۔" وہ آگے بڑھ کر عادتاً شیلف پہ پڑی کتابیں' رجسٹر اور شیپ وغیرہ سلیقے سے جوڑنے لگی۔ اس کے بھورے بال کھلے تھے اور اس نے ان ہی پہ دوپٹہ لے رکھا تھا' ایسے کہ چند لٹیں باہر گر رہی تھیں۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"جی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ کدھر ہیں۔" محمل نے بغور اس کو دیکھا' جو اس کے سامنے سر جھکائے کتابیں سیٹ کر رہی تھی۔

اسے ابھی بھی تیمور کی بات پہ مکمل یقین نہ تھا۔ فرشتے ایسا نہیں کر سکتی تھی' کبھی بھی نہیں' یقیناً" تیمور کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔

"میں ایک دوست کے ساتھ تھی' کچھ شاپنگ کرنا تھی۔" بے حد رسان سے بتا کر اس نے رجسٹر ایک دوسرے کے اوپر رکھے۔

نہ اس نے جھوٹ بولا' نہ سچ بتایا۔ اس کا یقین ڈگمگانے لگا۔

"آپ نے آگے کا کیا سوچا ہے فرشتے؟ میرے جانے کے بعد آپ کیا کریں گی؟"

"ابھی پلان کروں گی' دیکھو کیا ہوتا ہے۔" وہ اب گلدان میں رکھے گلدستے سے سوکھے پھول احتیاط سے نکال رہی تھی۔ اس کے جواب مبہم تھے۔۔۔ نہ سچ' نہ جھوٹ۔

"اور تم سارا دن کیا کرتی رہیں؟" اس نے چرمرائے سوکھے پھول ڈسٹ بن میں ڈالے۔

"کچھ خاص نہیں۔"

دونوں خاموش ہو گئیں' اپنی اپنی سوچوں میں گم۔

اب اس کے پاس حقیقت جاننے کا ایک ہی طریقہ تھا اور اس نے اسے استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔

"فرشتے' وہ جسم کس کی کرسی پہ ڈالا گیا تھا؟"

"کون سا جسم؟" فرشتے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پلٹنے سے اس کا دوپٹہ سرکنے سے بھورے بال جھلکنے لگے۔

"قرآن میں ایک جگہ ایک جسم کا ذکر ہے جو کسی کی کرسی پہ ڈالا گیا تھا۔ آپ کو یاد ہے وہ کس کا جسم تھا؟"

اس کا انداز یوں تھا جیسے وہ بھول گئی ہو۔

فرشتے نے الجھ کر چند لمحے سوچا' پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں' مجھے نہیں یاد آ رہا۔"

اور محمل کو سارے جواب مل گئے تھے۔ فرشتے قرآن بھول گئی تھی۔ اگر وہ اسے پڑھتی رہتی تو اسے یاد رہتا' لیکن وہ اسے پڑھنا چھوڑ چکی تھی اور قرآن تو چند دن کے لیے بھی چھوڑ دیا جائے تو وہ فوراً" ذہنوں سے مکمل طور پہ محو ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اللہ کی سنت تھی اور کبھی یہ تبدیل نہیں ہو گی۔

اس نے گہری سانس لی۔

"وہ سلیمان علیہ السلام کی کرسی تھی جس پہ ایک جسم ڈال دیا گیا تھا۔"

"اوہ اچھا۔" فرشتے نے میز پہ گرے پانی کے قطرے ٹشو سے صاف کیے۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا' فرشتے؟" وہ بہت دکھ سے

بولی تھی، اب وقت آگیا تھا کہ وہ چوہے بلی کا کھیل بند کردے۔

"کیا؟" فرشتے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ صرف استفسار تھا۔

"وہ جو اس گھر میں ہوتا رہا، میں وہ سب جاننا چاہتی ہوں؟"

"مثلاً؟" اس نے ابرو اٹھائی، اس کے چہرے پہ وہ ہی نرم سا تاثر تھا۔

"سب کچھ!"

"سب کچھ؟ کس بارے میں؟ میری اور ہمایوں کی شادی کے بارے میں؟" اس کے انداز میں ندامت تھی، نہ پکڑے جانے کا خوف، وہ بہت آرام سے پوچھ رہی تھی۔

"سب کچھ!" اس نے آہستہ سے دہرایا۔

"جب ہمایوں کراچی سے آیا تو اس نے مجھے پرپوز کیا۔ وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا، مگر طلاق سے قبل وہ مجھ سے شادی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سو ہم نے ڈیسائیڈ کیا کہ جب تم ہوش میں آجاؤ تو وہ تمہیں ڈائیورس دے دے گا اور ہم شادی کرلیں گے۔"

وہ جیسے موسم کی کوئی خبر سنا رہی تھی۔

"وہ کہتا تھا کہ علما سے فتویٰ لے لیتے ہیں، مگر میرا دل نہیں مانا، میں نے سوچا کہ کچھ وقت اور انتظار کرلیتے ہیں۔ اور پھر تم ہوش میں آگئیں۔ سو اس نے ڈائیورس پیپرز سائن کردیے۔ مجھے پرپوز کرنے سے قبل ہی وہ تمہیں ڈائیورس دینے کا فیصلہ کرچکا تھا، اگر یہ ضروری نہ ہوتا وہ تب بھی ایسے ہی کرتا، کیونکہ وہ یہ شادی رکھنے کو راضی نہیں تھا۔"

وہ بہت اطمینان اور سکون سے میز سے ٹیک لگائے کھڑی اس کے بارے میں ان کہے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔

"میں نے اس کا پرپوزل اس لیے قبول کرلیا کیونکہ طلاق کے بعد اس کو بھی کسی نہ کسی سے شادی کرنی تھی اور مجھے بھی اور چونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے اور سمجھتے تھے، سو اس کا پرپوزل میرے لیے بہترین چوائس تھا۔ میں اس کو تمہارے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے پہ مجبور نہیں کرسکتی تھی، نہ ہی وہ کسی کی مانتا ہے۔ سو شرعی لحاظ سے میرے پاس پرپوزل قبول کرنے کا حق تھا سو میں نے وہ استعمال کیا۔"

اس کے پاس دلائل تھے، توجیہات تھیں، ٹھوس اور وزنی شرعی سہارے تھے۔ محمل خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتی رہی، وہ ذرا دیر کو چپ ہوئی تو اس نے لب کھولے۔

"اور جب ہمایوں نے آپ سے میرے اور فواد کے تعلق کی نوعیت اور ان تصاویر کے بارے میں پوچھا تھا، تب آپ نے کیا کہا تھا؟" اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔

"وہ ہی جو سچ تھا۔" وہ اب بھی پرسکون تھی۔ "معیز نے تصویریں اور وہ ایگری منٹ لاکر دیا تھا جو ہم نے فواد سے طے کیا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ تم نے اس کے بارے میں ہمایوں کو بتا دیا ہوگا، تم اس کے غصے کے ڈر سے خود نہیں بتایا تھا۔ مگر تم نے بھی نہیں بتایا تو اس کا غصہ کرنا لازمی تھا۔ اس نے مجھے بلایا، پھر وہ مجھ پہ چیخا، چلایا، میں چپ کرکے سنتی رہی، اس نے پوچھا کہ یہ ایگری منٹ سچا ہے یا جھوٹا۔ میں نے سچ بولا۔ وہ غصے سے چلاتا رہا، اسے دکھ تھا کہ ہم دونوں نے اس پہ ٹرسٹ نہیں کیا۔ پھر اس نے وہ تصویریں مجھے دکھائیں اور پوچھا کہ وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ میں نے سچ ہی بولا۔"

"کیا بولا؟" محمل نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"یہ ہی کہ مجھے معلوم نہیں اور مجھے واقعی معلوم نہیں تھا۔"

اور وہ اسے دیکھتی رہ گئی، یہ فرشتے کا سچ تھا؟

"پھر اس نے پوچھا کہ معیز جو باتیں اسے بتا گیا ہے وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ وہ اسے یہ بتا کر گیا تھا کہ تمہارا اور فواد کا افیئر تھا اس رات فواد نے تمہیں پرپوز کرنا تھا، کوئی رنگ بھی دی تھی غالباً" اور پھر اس نے تمہیں بہانے سے ہمایوں کے گھر بھیج دیا۔ اس رنگ کا ذکر فواد کی اس فون کال میں بھی تھا جو ہمایوں نے ٹیپ کی تھی۔ یہ بات اس نے اگنور کردی تھی، پھر ظاہر ہے معیز نے یاد دلایا تو وہ اٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سچ بولا۔"

اب کی بار وہ خاموش رہی۔ اس نے نہیں پوچھا کہ فرشتے کا سچ کیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہے۔

"میں نے اسے بتا دیا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی، نہ ہی تم نے کبھی مجھے اس معاملے میں رازدار بنایا ہے۔ اس نے اس رات کے متعلق پوچھا تو میں نے سچ بتایا کہ فواد تمہیں پرپوز کرنے کے بہانے سے ہی ونر پہ لے کر جا رہا تھا۔ تم نے مجھے یہ ہی بتایا تھا، سو میں نے بھی اس کو بتا دیا۔"

وہ چپ چاپ یک ٹک سامنے کھڑی مطمئن سی لڑکی کو دیکھتی رہی، جس کے چہرے پہ ملال تک نہ تھا۔ وہ اس کا ایک راز تک نہیں سنبھال سکی تھی۔ وہ سچ کیسے ہوسکتا ہے، جس میں کسی امانت کا خون شامل ہو؟ وہ تو اسے جانتی تھی، یہ اس کی کزن تھی، کیا وہ اس کی پردہ پوشی نہیں کرسکتی تھی؟ فواد نے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ اسے پرپوز کرنے جا رہا ہے۔ یہ سب تو اس نے خود اخذ کیا تھا۔ اس سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ وہ سمجھی تھی کہ وقت کی دھول نے اس غلطی کو دبا دیا ہوگا، مگر لڑکیوں کی کچی عمر کی نادانیاں اتنی آسانی سے کہاں دبتی ہیں۔

"اس ٹیپ میں کسی رنگ کا بھی ذکر تھا۔ ہمایوں نے اسے بار بار سنا، وہ مجھ پہ غصہ ہوتا رہا کہ میں نے اسے بے خبر کیوں رکھا، پھر اس نے اپنا ٹرانسفر کراچی کروالیا۔"

وہ اب کھڑکی سے باہر لان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"وہاں کراچی ہی اسے آرزو ملی۔ اس کے فادر کی ڈیتھ کے بعد کریم چچا اور غفران چچا نے اس کا حصہ بھی دبا لیا تھا۔ سو اس نے سوچا کہ ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں۔ اس نے فواد سے تمہارا اور میرا سائن کردہ کاغذ لیا اور معیز کے ہاتھوں ہمایوں کو بھجوایا۔ فواد، آرزو کو پسند کرنے لگا تھا، وہ اب اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، وہ اسے اپنانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مگر آرزو کو ہمایوں بہتر لگا، سو اس نے چاہا کہ ہمایوں تمہارا حصہ قانونی طور پہ آغا کریم سے واپس لے، اس کا حصہ لینے میں بھی مدد کرے، تاکہ جب وہ ہمایوں سے شادی کرے تو تمہارے حصے پہ بھی وہ قابض ہوسکے جو ہمایوں کی ملکیت میں ہوگا، اور بیچاری، تمہارے بارے میں وہ پر یقین تھی کہ تم کبھی نہیں اٹھوگی۔"

بادل ایک دفعہ پھر زور سے گرجے، دور کہیں بجلی چمکی، شام کی نیلاہٹ سارے میں بھر رہی تھی۔

وہ ابھی تک خاموشی سے فرشتے کو سن رہی تھی۔

"مگر ہمایوں کو فواد سے ضد ہوگئی تھی۔ صرف اس لیے کہ فواد آرزو کو پسند کرتا ہے، اس نے آرزو کو اپنے قریب آنے دیا۔ فواد ہمایوں کی منتیں کرتا رہا کہ وہ آرزو کو چھوڑ دے، مگر ہمایوں اس سے اپنے سارے بدلے چکانا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ فواد نے اس کی محبت کو اس سے چھینا ہے، وہ بھی اس کی محبت کو ویسے ہی چھینے گا۔ وہ آرزو سے کبھی بھی شادی نہیں کررہا تھا، مگر اس نے آرزو کو دھوکے میں رکھا۔ ابھی مجھے ڈراپ کرکے وہ آرزو کے پاس ہی گیا ہے، اس کو یہ بتانے کہ جیسے وہ اس کو استعمال کررہی تھی، وہ بھی ویسے ہی اسے استعمال کررہا تھا۔ وہ شدت پسند لڑکی ہے، جانے غصے میں کیا کر ڈالے۔ مگر جو بھی ہو، وہ آج اسے آئینہ دکھا کر ہی واپس آئے گا۔"

کھڑکی کے بند شیشے پہ کسی اڑتی چڑیا نے زور کی چونچ ماری، پھر چکرا کر پیچھے کو گری، بادل وقفے وقفے سے گرج رہے تھے۔

"شاید تم یہ سمجھو کہ میں نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے یا یہ کہ مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن تم یہ سوچو کہ میں پھر اور کیا کرتی؟ میں ہمایوں سے بہت محبت کرتی تھی اور کرتی ہوں۔ مگر جب مجھے لگا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو میں درمیان سے نکل گئی، لیکن اب وہ تمہیں نہیں چاہتا، اور مجھے بھی کسی نہ کسی

سے شادی تو کرنی تھی۔ مجھے بتاؤ میں نے کیا غلط کیا؟ میرے دین نے مجھے پروپوزل سلیکٹ کرنے کا اختیار دیا تھا۔ سو میں نے اسے استعمال کیا۔ تم کسی بھی مفتی سے پوچھ لو' اگر کوئی عورت' شوہر کی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ رہی ہو تو شوہر دوسری شادی کر سکتا ہے' اور اس میں کسی کی حق تلفی کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی قطع رحمی کا عنصر شامل ہے' یاد کرو' سورۂ نساء میں ہم نے کیا پڑھا تھا کہ اگر کوئی ایک حقوق ادا نہ کر سکے تو پھر اپنے حقوق چھوڑ دے' الگ ہو جائے کہ اللہ دونوں کے لیے وسعت پیدا کر دے گا۔"

اپنے مطلب کی آیات اسے آج بھی یاد تھیں۔

"آئی ہوپ کہ اب تمہاری کنفیوژن اور اعتراضات دور ہو گئے ہوں گے۔ میں نے سات سال تمہاری خدمت کی' حالانکہ یہ میرا فرض نہیں تھا' مگر اس لیے کہ تم کبھی یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے پیار نہیں کرتی۔ میں آج بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ تم نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ضرورت پڑنے پہ تم میرے لیے اپنا حق چھوڑ دو گی' فواد نے تمہاری گردن پہ پستول رکھا تھا' تمہیں بچانے کے لیے میں نے اپنا حق چھوڑا تھا۔ یہ باتیں میں نے آج کے دن کے لیے سنبھال رکھی تھیں' تاکہ آج میں تم سے تمہارے وعدے کی وفا مانگ سکوں۔"

وہ خاموش ہو گئی' اب وہ محمل کے بولنے کی منتظر تھی۔

محمل چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی' پھر آہستہ سے لب کھولے۔

"آپ نے کہہ لیا جو آپ نے کہنا تھا؟"

"ہاں۔"

"کیا اب آپ میری سنیں گی؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"ہاں۔"

"تو پھر سنیے' اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔" اس نے تعوذ پڑھا تو فرشتے نے ذرا الجھ کر اسے دیکھا۔ مگر وہ رکی نہیں تھی' بہت دھیمے' مگر مضبوط لہجے میں وہ عربی میں اسے کچھ سنانے لگی تھی۔ وہ عربی جو ان دونوں کی سمجھ میں آتی تھی۔

"اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں' شاید کہ وہ پلٹ آئیں.... شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔"

فرشتے کی آنکھوں میں الجھا سا تاثر ابھرا۔ محمل بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پڑھتی جا رہی تھی۔

"ان لوگوں کو اس شخص کی خبر پڑھ کر سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات دی تھیں۔ جس کو ہم نے اپنی "آیات" دی تھیں۔ پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو اس کے پیچھے شیطان لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔"

فرشتے کی بھوری آنکھوں میں بے چینی ابھری تھی۔ "محمل! میری بات سنو۔" مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ پتلیوں کو حرکت دیے بنا نگاہیں اس پہ مرکوز کیے کہتی جا رہی تھی۔

"تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔" اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ "اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان ہی آیات کے ساتھ بلندی عطا کرتے' لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا۔"

"محمل چپ کرو۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی' مگر محمل کی آواز اونچی ہو رہی تھی۔

"لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ تو اس کی مثال کتے جیسی ہے۔ تو اس کی مثال کتے جیسی ہے۔"

"اگر تم اس پہ حملہ کرو تو وہ زبان باہر نکالتا ہے' یا تم اس کو چھوڑ دو تو بھی وہ زبان باہر نکالتا ہے۔"

"خاموش ہو جاؤ! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ!" اس نے تڑپ کر محمل کے منہ پہ ہاتھ رکھنا چاہا' اس کا دوپٹہ کندھوں سے پھسل گیا تھا' کھلے بال شانوں پہ آگرے تھے۔

محمل نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ اسی میکانکی انداز میں اسے دیکھتی پڑھتی جا رہی تھی۔

"جسے اللہ ہدایت بخشے' پس وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے' پس وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔"

اس کے ہاتھ بے دم ہو کر اپنی گود میں آگرے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں گری تھی۔

"بے شک ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جنوں میں سے اور بہت سے انسانوں میں سے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل ہیں۔ وہ ان سے کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے لیے آنکھیں ہیں' وہ ان سے کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ اور ان کے لیے کان ہیں۔ وہ ان سے کچھ بھی نہیں سنتے۔ یہی لوگ مویشیوں کی طرح ہیں' بلکہ یہ تو زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غافل ہیں جو غافل ہیں جو غافل ہیں۔" وہ کسی معمول کی طرح بار بار وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

فرشتے سفید چہرہ لیے بے دم سی بیٹھی تھی۔ اس کے لب ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔ محمل نے آہستہ سے پلک جھپکی تو دو آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرے۔

"اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں' شاید کہ وہ پلٹ آئیں!"

اس نے وہیل چیئر کے پہیوں کو دونوں اطراف سے تھاما اور اس کا رخ کھڑکی کی طرف موڑا' وہ آہستہ آہستہ وہیل چیئر کھڑکی کی طرف بڑھانے لگی۔

فرشتے پیچھے بیٹھی رہ گئی تھی۔ محمل نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ وہ ابھی پلٹنا نہیں چاہتی تھی۔

"اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں' شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔۔۔!" وہ کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی تھی۔

فرشتے سے مزید کچھ سنا نہیں گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور منہ پہ ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

محمل اسی طرح نم آنکھوں سے باہر چمکتی بجلی کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ تب بھی کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی جب ہمایوں کی گاڑی اندر آئی۔ اور تب بھی' جب رات ہر سو چھا گئی۔ اس کی اس گھر میں آخری رات۔ اور وہ اسے سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ تب اس نے بلقیس کو بلوایا جس نے اسے بستر پہ لیٹنے میں مدد دی۔ پھر وہ آنکھوں پہ بازو رکھے' کب گہری نیند میں چلی گئی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا۔

اس کے ذہن میں اندھیرا تھا' گھپ اندھیرا جب اس نے وہ آواز سنی۔ تاریکی کو چیرتی' مدھری آواز۔ اپنی جانب کھینچتی آواز۔

محمل نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ کھڑکی کے آگے پردے بندھے تھے۔ وہ رات سوتے وقت شیشے کے پٹ کھول کر رکھتی تھی تاکہ جالی سے ہوا اندر آئے۔ وہیں باہر سے کوئی آواز آ رہی تھی۔

اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ ہاتھ مارا' اور بٹن دبایا۔ ٹیبل لیمپ فوراً جل اٹھا۔ روشنی سامنے دیوار گیر گھڑی پہ پڑی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ مدھم سی دکھ بھری آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

اس نے رک کر سننا چاہا۔ لفظ کچھ کچھ سنائی دینے لگے تھے۔

"اللھم جعل فی قلبی نورا"

(اے اللہ' میرے دل میں نور ڈال دے)

محمل نے بے اختیار سائیڈ ٹیبل پہ رکھی بیل پہ ہاتھ مارا۔

"وفی بصری نورا"

(اور میری بصیرت میں نور ہو)

بلقیس تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ محمل کی وجہ سے وہ کچن میں ہی سوتی تھی۔

"جی بی بی؟"

"مجھے بٹھا دو' بلقیس!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں وہیل چیئر کی طرف اشارہ کیا۔ بلقیس سر ہلا کر آگے بڑھی' تب ہی کھڑکی کے اس پار سے آواز آئی۔

"وفی سمعی نورا"

(اور میری سماعت میں نور ہو)

بلقیس چونک کر کھڑکی کو دیکھنے لگی، پھر سر جھٹک کر اس کی طرف آئی۔

"وعن یمینی نورا" وعن یساری نورا"

(اور میرے دائیں جانب اور بائیں جانب نور ہو)

بہت احتیاط سے بلقیس نے اسے وہیل چیئر پہ بٹھا دیا۔

"اب تم جاؤ۔" اس نے اشارہ کیا۔ بلقیس سر ہلاتی متذبذب سی واپس پلٹی۔

"وفوقی نورا" وتحتی نورا"

(اور میرے اوپر اور نیچے نور ہو)

مدھم چاندنی کی چاشنی میں ڈوبی آواز ہر شے پہ چھا رہی تھی۔ محمل نے وہیل چیئر کا رخ باہر کی جانب موڑا۔

"وامامی نورا" وخلفی نورا" (اور میرے آگے پیچھے نور ہو) آواز میں اب آنسو گرنے لگے تھے۔

وہ وہیل چیئر کو بمشکل گھسیٹتی باہر لائی۔

"واجعل لی نورا"

(اور میرے لیے نور بنا دے)

چاندنی میں ڈوبا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ وہ مترنم، غم زدہ آواز لان سے آ رہی تھی۔

"وفی لسانی نورا" وعصبی نورا" (اور میری زبان اور اعصاب میں نور ہو)

اس نے سوز میں پڑھتے ذرا سی ہچکی لی۔

محمل آہستہ آہستہ برآمدے کی آرام دہ ڈھلان، سے نیچے وہیل چیئر کو اتارنے لگی۔ یہ ڈھلان فرشتے نے ہی اس کے لیے لگوائی تھی۔

"ولحمی نورا" ودمی نورا"

(اور میرے گوشت اور لہو میں نور ہو)

لان کے آخری سرے پہ دیوار سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا سر نڈھال سا دیوار سے ٹکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں جن سے قطرہ قطرہ آنسو ٹوٹ کر رخسار پہ گر رہے تھے۔ لمبے بھورے بال شانوں پہ پڑے تھے۔

"وشعری نورا" وبشری نورا" (اور میرے بال و کھال میں نور ہو)

محمل وہیل چیئر کو گھاس پہ آگے بڑھانے لگی۔ گھاس کے تنکے پہیوں کے نیچے چرمرانے لگے تھے۔

"واجعل لی فی نفسی نورا" واعظم لی نورا" (اور میرے نفس میں نور ہو اور میرے لیے نور کو بڑھا دے)

وہ اسی طرح آنسو بہاتی بند آنکھوں سے، بے خبر سی پڑھتی جا رہی تھی۔

محمل وہیل چیئر اس کے بالکل سامنے لے آئی۔

اللھم اعطنی نورا"

(اے اللہ، مجھے نور عطا کر دے!)

چاندنی میں اس کے آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

"فرشتے!" اس نے ہولے سے پکارا۔

فرشتے کی آنکھوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے پلکیں جدا کیں اور محمل کو دیکھا۔ وہ شاید بہت روئی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم، سرخ تھیں۔

"کیوں رو رہی ہیں؟" اس کے اپنے آنسو گرنے لگے تھے۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے اسے قرآن سنایا تھا، قرآن پڑھایا تھا۔ اس کی جان ان لوگوں سے چھڑائی تھی سات سال اس کی خدمت کی تھی۔ بہت احسان تھے اس کے محمل پہ۔ اور آج اس نے اسے رلا دیا!

"مجھے رونا ہی تو چاہیے" وہ سر اٹھا کر چاند کو دیکھنے لگی" میں نے بہت زیادتی کی ہے محمل، بہت زیادتی۔"

وہ خاموشی سے اس کو سنے گئی۔ شاید ابھی فرشتے نے بہت کچھ کہنا تھا، وہ سب، جو وہ پہلے نہیں کہہ سکی۔

"میں نے سات سال توجیہات جوڑیں، دلیلیں اکٹھی کیں، اور تم نے سات آیتوں میں انہیں ریت کا ڈھیر بنا دیا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا تھا۔ بہت یقین دلایا تھا کہ یہی صحیح ہے مگر آج میرا یقین ٹوٹ گیا ہے۔ محمل میں خود غرض ہو گئی تھی، کتے کی طرح خود غرض جو ہڈی نہ ڈالنے پہ بھی زبان نکالتا ہے۔"

اس کی اوپر چاند کو تکتی آنکھوں سے قطرے گر رہے تھے۔

"کبھی تم نے میری چاندی کی وہ انگوٹھی دیکھی ہے محمل؟ تم نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ مجھے کس نے دی تھی؟ جانتی ہو، وہ مجھے میری خالہ نے دی تھی۔ وہ انہوں نے اپنی بہو کے لیے رکھی تھی اور اپنی وفات سے قبل وہ بہت بیمار تھیں، انہوں نے وہ مجھے پہنا دی۔ میری امی ان کا مطلب سمجھتی تھیں مگر خاموش رہیں۔ وہ وقت آنے پہ ہمایوں سے بات کرنا چاہتی تھیں مگر وقت نہیں آیا۔ آ ہی نہیں سکا۔ امی فوت ہو گئیں تو میں چپ چاپ مسجد چلی گئی۔ میں برسوں انتظار کرتی رہی کہ ہمایوں کبھی تو اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھے گا مگر اس نے نہیں پوچھا۔ پھر میں نے صبر کر لیا، مگر انتظار تو مجھے تھا۔ میں نے بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اسی کا نام سنا تھا، مجھے اس پہ اپنا ہی حق لگتا تھا۔ اور جب ایک روز ہمایوں نے مجھے کہا کہ مجھے شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے، تو میں نے اس کو خالہ کی خواہش کے بارے میں بتانے کا سوچا۔

اس رات میں بہت دیر تک مسجد کی چھت پہ بیٹھی رہی تھی، اور جب میں فیصلہ نہ کر پائی تو دعائے نور پڑھنے لگی۔ تمہیں پتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کا ایک حصہ سجدے میں پڑھا کرتے تھے؟ اور یہ دعا قرآن سمجھنے میں مدد دیتی ہے میں جب بھی فیصلہ نہ کر پاتی، اس دعا کو پڑھتی۔ اس رات بھی میں پڑھ کر ہٹی ہی تھی کہ تم ہماری چھت پہ آئیں، اور پھر ہماری زندگی میں بھی آ گئیں۔

میں نے آج تک تمہارے لیے جو بھی کیا ہے، وہ اللہ کے لیے کیا تھا۔ مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے کیا کیا تھا، پھر جب میں نے ہمایوں کو تمہارے لیے مسکراتے دیکھا اور اس کے لیے تمہاری آنکھوں کو چمکتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ تمہیں آگاہ کر دوں اور تمہیں یاد ہے جب ہسپتال میں تم ہمایوں کو دیکھنے آئی تھیں، تو میں تمہیں بتانے ہی والی تھی۔ مگر تم نے نہیں سنا، تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ قربانی دے دوں گی۔ تب میرا جینا، اور میرا مرنا اور میری نماز اور میری قربانی صرف اللہ کے لیے تھی۔ میں نے ہر چیز بہت خلوص دل سے کی۔ خود تمہاری شادی کروائی اور اپنے تئیں میں مطمئن تھی۔ لیکن۔

جب تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا اور میں پاکستان واپس آئی تو مجھے پہلی دفعہ لگا کہ شاید تم زندہ نہ رہ سکو، اور ہمایوں میرا نصیب۔۔۔ اور اس سے آگے سوچنے سے بھی میں ڈرنے لگی تھی۔ سو واپس چلی گئی۔ مگر ہمایوں جب بھی کال کرتا اور تمہاری مایوس کن حالت کی خبر دیتا تو مجھے لگتا شاید یہی تقدیر ہے۔ شاید تم ہمیں چھوڑ جاؤ، تب ہمایوں میرے پاس واپس آ جائے۔ مجھے لگا میری قربانی قبول ہو گئی ہے۔ اس کا انعام مجھے دیا جانے لگا ہے۔ مجھے بھول گیا کہ وہ قربانی تو اللہ کے لیے تھی، اللہ کو پانے کے لیے تھی، دنیا کے لیے یا ہمایوں کے لیے تو نہیں تھی۔ مگر تمہاری طرف سے ہم اتنے مایوس ہو گئے تھے کہ آہستہ آہستہ مجھے سب بھولتا گیا۔ میں ہر نماز میں، ہر روز تلاوت کے بعد ہمایوں کو خدا سے مانگنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکنے لگی تو میرے ساتھ شیطان لگ گیا۔"

اس کی اٹھی لمبی گردن پہ آنکھوں سے نکلتے آنسو پھسل رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ابھی بھی اوپر چاند پہ ٹکی تھیں۔ شاید وہ ابھی محمل کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

"جب میں دوبارہ واپس آئی تو اپنی "زمین" کی طرف جھکی ہوئی آئی، اس امید پہ تمہاری خدمت کرنے آئی کہ شاید یہی دیکھ کر ہمایوں کا دل میری طرف کھنچ جائے۔ میری اس انتھک خدمت میں ریا شامل ہو گئی۔ مجھے اس وقت سے ڈر نہیں لگا جب میں حشر کے بڑے دن اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال نامے میں ان بڑی بڑی نیکیوں پہ کانٹا لگے دیکھوں گی کہ یہ تو ریا کے باعث ضائع ہو گئیں، قبول ہی نہیں کی گئیں۔ مجھے ڈر نہیں لگا۔ میں ریاکاری کرتی گئی مگر یقین کرو، قرآن مجھ سے نہیں چھوٹا۔ میں تب بھی روز اسے پڑھتی تھی مگر میرا جینا مرنا، نماز اور قربانی ہمایوں کے لیے ہو گئی۔"

یکدم بادل زور سے گرجے اور اگلے ہی لمحے بارش

کے ٹپ ٹپ قطرے گرنے لگے مگر وہ دونوں بے خبر بیٹھی تھیں۔

"پھر ایک دن معیز چلا آیا' اسے آرزو نے بھیجا تھا۔ وہ ان گزرے سالوں میں کئی دفعہ ہمایوں سے رابطے کی کوشش کر چکی تھی مگر اس نے جب توجہ نہ دی تو اس نے معیز کو بھیجا۔ اس کے پاس تصویریں تھیں اور وہ کاغذ۔ ہمایوں نے مجھ سے پوچھا تو کاغذ کی بابت میں نے سچ بولا' مگر جب اس نے تصویریں میرے سامنے پھینکیں تو میں خاموش ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جعلی ہیں' مگر ٹیکنیکلی — میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سچ ہیں یا نہیں۔

میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا مگر میرا دل... بار بار کوئی میرے اندر وہ آیت دہرا رہا تھا کہ

"کیوں نہیں تم نے کہا کہ یہ کھلم کھلا بہتان ہے۔"

وہ آیت بھی ایک ایسی محترم ہستی کے لیے نازل ہوئی تھی جس کے اوپر لگے بہتان کی حقیقت سے مومنین بے خبر تھے' پھر بھی اللہ نے ان کو سرزنش کی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کردار کی کتنی سچی ہے' تم نے اس کی حمایت نہیں کی؟

میں ہمایوں کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ میرے اوپر چلا رہا تھا اور مسلسل کوئی میرے اندر کہہ رہا تھا کہ "ھٰذا افک مبین" (یہ بہتان ہے کھلم کھلا) میں نے سر اٹھایا' ایک نظر ہمایوں کو دیکھا' وہ ہمایوں جس سے میں نے بہت محبت کی تھی اور پھر میں نے کہہ دیا کہ میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔

تب ایک دم میرے اندر باہر خاموشی چھا گئی۔ وہ آواز آنا بند ہو گئی۔ تب ہمایوں نے معلوم نہیں کہاں سے وہ ٹیپ نکالی اور مجھے سنوائی۔ اس میں کسی انگوٹھی کا تذکرہ تھا۔ اس نے معیز کی کہی بات دہرائی کہ کیا اس روز فواد تمہیں پرپوز کرنے کا جھانسہ دے کر باہر لے کر گیا تھا؟ تب پھر سے کسی نے میرے اندر کہا۔

"اللہ خیانت کار کی چال کی راہنمائی نہیں کرتا۔"

مگر اب وہ آواز کمزور پڑ چکی تھی۔ مجھے لمانت کے سارے سبق بھول گئے۔ میں نے اسے وہ بتا دیا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔ تب وہ مجھ پہ بہت چیخا۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنی بہن کو بچانے کے لیے اس کے سر تھوپ دیا ہے۔ اس نے بہت مشکل سے دل بڑا کر کے اس بات کو نظر انداز کیا تھا کہ تم کس طرح پہلی دفعہ اس کے گھر لائی گئی تھیں۔ مگر یہ بات کہ فواد کا اور تمہارا کوئی افیئر تھا۔ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میرے ایک فقرے نے ہر چیز پہ تصدیق کی مہر لگا دی۔ وہ مجھ پہ کبھی ایسے نہیں برسا تھا۔ جیسے اس رات برسا تھا۔ میں ساری رات روتی رہی۔ نامعلوم غم کس بات کا زیادہ تھا۔ خیانت کا' یا ہمایوں کے رویے کا۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر ہمایوں نے اگلی صبح مجھ سے ایکسکیوز کر لیا۔ میں چپ چاپ سنتی رہی۔ تب آخری دفعہ میرے دل سے آواز آئی کہ اس کو بتا دو کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔

مگر میں چپ رہی۔ میں نے خواہشات کی پیروی میں چلنا شروع کر دیا۔ اور میں بھٹک گئی۔ وہ کراچی چلا گیا اور میں کئی دن تک تمہیں دیکھنے ہسپتال نہیں جا سکی پھر میں سجدہ بھی نہیں جا سکی۔ جس دن میں نے خیانت کی' محمل اس دن سے آج کے دن تک میں ساڑھے تین سال ہونے کو آئے ہیں' میں قرآن نہیں کھول پائی۔ ہاں نمازیں میری آج بھی ویسی ہی لمبی ہیں' میں سجدوں میں گر کر ہمایوں کو اب بھی مانگتی ہوں' مگر قرآن پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔ فرشتے کے بھورے بال بھیگ چکے تھے۔ موٹی موٹی گیلی لٹیں' چہرے کے اطراف میں چپک گئی تھیں۔ وہ ابھی تک اوپر چاند کو دیکھ رہی تھی۔

"وہ کراچی سے آیا تو بدل گیا تھا۔ پھر ایک روز اس نے مجھے پرپوز کیا۔ اچانک بالکل اچانک سے اور مجھے لگا میری ساری قربانیاں مستجاب ہو گئی ہیں۔ پھر مڑ کر پیچھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تم سے بہت بدظن ہو چکا تھا۔ مگر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ تمہارا علاج کروانا نہ چھوڑے۔"

موسلا دھار بارش میں بار بار بجلی چمکتی تو پل بھر کو سارا لان روشن ہو جاتا۔

"فواد نے کئی دفعہ فون کر کے تمہارا پوچھنا چاہا' میں نے اسے کبھی کچھ نہیں بتایا' بس اس کی بات سن کر کچھ کہے بنا ہی بند کر دیتی۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر اک دفعہ اسے اس سارے کھیل کا علم ہو گیا تو وہ ہمایوں کے پاس آ کر اسے سب بتا دے گا۔ مشکل ہی تھا کہ ہمایوں اس کا یقین کرے مگر اس ڈر سے میں نے اسے کبھی کچھ پتا نہیں لگنے دیا۔"

"مجھے ہمایوں نہیں چاہیے فرشتے!" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ "مجھے اپنی بہن چاہیے!"

"مجھے بھی ہمایوں نہیں چاہیے۔ مجھے بھی اپنی بہن ہی چاہیے!" اس نے بھیگی آنکھوں کا رخ پہلی دفعہ محمل کے چہرے کی طرف کیا۔ محمل نے اس کے گھٹنوں پہ رکھے ہاتھ پکڑ لیے۔ ان میں آج چاندی کی وہ انگوٹھی نہیں تھی۔

بارش زور سے ان دونوں پہ برس رہی تھی۔

"میں نے فواد کو فون کر دیا ہے۔ وہ پہنچنے والا ہو گا۔ وہ خاصا سمجھ دار بندہ ہے ایسے ثبوت لائے گا کہ ہمایوں انہیں جھٹلا نہ سکے گا۔ وہ ابھی آ کر ہمایوں کو سب کچھ بتا دے گا' ابھی کل دوپہر میں خاصا وقت ہے۔ تمہاری عدت ختم نہیں ہوئی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ حقیقت جان کر رہ نہیں سکے گا۔ اور تمہیں واپس اپنائے گا۔ آؤ۔ اندر چلتے ہیں۔" فرشتے نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکالے' اٹھی اور پھر وہیل چیئر کی پشت تھام لی۔

"بس مجھ پہ ایک احسان کرنا۔ ہمایوں کو مت بتانا کہ میں نے خیانت کی۔ میں اس کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی۔ بظاہر میں نے جھوٹ نہیں بولا مگر مجھے تمہارا راز نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی' میں فواد کے سامنے تمہاری تائید کروں گی' مگر تم۔ تم میری عزت رکھ لینا۔ وہ جانتا ہے۔ کہ فرشتے جھوٹ نہیں بولتی' خیانت نہیں کرتی۔ اس نے ان تصویروں پہ نہیں' مجھ پہ یقین کر کے تمہیں طلاق دی تھی۔ تم میری عزت رکھ لینا۔"

وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتی آہستہ آہستہ بے خود سی کہہ رہی تھی۔ محمل نے سر جھکا لیا۔ وہ فرشتے کو نہیں بتا سکی کہ آج وہ پھر زمین کی طرف جھک رہی ہے مگر اسے پتہ نہیں ہے۔

"تم ہمایوں کو واپس لے لو محمل۔ وہ تمہارا ہے' اسے تمہارا ہی رہنا چاہیے۔" وہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں اسی طرح نیم اندھیرا تھا۔ کھڑکی کے پردے ہٹے تھے۔ ٹیبل لیمپ ابھی تک جل رہا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹتی آگے بڑھی اور لیمپ کا بٹن بجھایا۔ ایک دم کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ بس کھڑکی کے پار بارش کے قطرے گرتے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ وہیں کھڑکی کے سامنے بیٹھی برستی بارش کو دیکھے گئی۔

"انسان جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے' اللہ اسے اسی کے ہاتھوں سے توڑتا ہے' انسان کو اس ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح ہونا چاہیے' جس سے لوگوں کی محبت آئے اور باہر نکل جائے۔"

اللہ نے اسے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں توڑا تھا جن سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتی تھی۔ ہمایوں' فرشتے اور تیمور!

تب ہی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

وہ گاڑی بار بار ہارن بجا رہی تھی۔ تب اس نے برستی بارش میں ہمایوں کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔

اس نے گیٹ کھولا تو ایک گاڑی زن سے اندر داخل ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکلا تھا' وہ فواد ہی تھا' وہ پہچان گئی تھی۔

وہ ویسا ہی تھا' بس آنکھوں پہ فریم لیس گلاسز تھے اور بالوں کا کٹ زیادہ چھوٹا تھا۔

کیا ہمایوں اس کی بات سن لے گا؟ کبھی بھی نہیں!

"تب ہی فواد نے لپک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور کسی کو بازو سے کھینچ کر باہر نکالا۔ محمل دھک سے رہ گئی۔ وہ معیز تھا۔

پتلا لمبا' نوجوان جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ فواد اس کو پکڑ کر ہمایوں کے سامنے لایا جو قدرے چونکا ہوا کھڑا تھا۔

برستی بارش کا شور بہت تیز تھا۔ ان کی باتوں کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ تینوں بارش میں بھیگتے کھڑے تھے۔ فواد زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہمایوں سینے پہ ہاتھ باندھے صرف خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس کی محمل کی طرف پشت تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اور تب اس نے معیز کو ہاتھ جوڑے دیکھا۔ شاید اس کے چہرے پہ بارش کے قطرے تھے' یا شاید وہ رو رہا تھا۔ روتے ہوئے' وہ کچھ کہتے ہوئے وہ ہمایوں سے معافی مانگ رہا تھا۔ اور تب اس نے فرشتے کو باہر آتے دیکھا۔ وہ بھی کچھ کہہ رہی تھی۔

محمل نے ہاتھ بڑھا کر پردہ برابر کر دیا۔ وہ اس منظر کو اب مزید نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

کتنی ہی دیر بعد اس نے فرشتے کی آواز سنی' وہ فواد اور معیز کو ادھر لا رہی تھی۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلا' محمل کی اس طرف پشت تھی۔

"محمل..." فواد کی بھرائی ہوئی آواز اسے سنائی دی۔ "معیز نے ہمایوں کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر مجھے پہلے پتہ ہوتا تو۔ محمل ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔"

"آپا! ہمیں معاف کر دو!" وہ معیز تھا' وہ رو رہا تھا۔ "اماں اور آرزو آپا نے مجھے یہ سب کرنے کو کہا تھا۔ آپا! اماں بہت بیمار ہیں۔ وہ اب پہلے جیسی نہیں ہیں۔ وہ سارا دن چیختی چلاتی ہیں۔ آپا... ہمیں۔" وہ کہہ رہا تھا اور کوئی دھیمے سے اس کے اندر بولا تھا۔

"بس تم یتیم کے ساتھ سختی نہ کرنا۔"

"آپا! آرزو آپا نے خودکشی کر لی ہے۔ آج ہمایوں بھائی نے ان کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اماں سنبھل نہیں پا رہیں۔ ہمیں بددعا مت دینا آپا۔"

"جاؤ معیز! میں نے تمہیں معاف کیا۔ سب کچھ معاف کیا۔"

وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"آپا دعا کرو آرزو آپا بچ جائیں۔ ان کے لیے بددعا مت کرنا۔"

"میں دعا کروں گی' تم جاؤ معیز' ان کا خیال رکھنا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے' بلکہ تم نے تو مجھے انسانوں کی محبت اور وفا کی حقیقت دکھائی ہے۔ تمہارا شکریہ معیز۔ تم جاؤ۔"

اور وہ ویسے ہی الٹے قدموں پلٹ گیا۔

"کیا تم ہمیں معاف کر سکتی ہو محمل؟" وہ شکست خوردہ ٹوٹا ہوا شخص آغا فواد ہی تھا۔

"میں نے معاف کیا' سب معاف کیا۔" وہ اب بھی پیچھے نہیں مڑی تھی۔

"آغا جان کو آدھے جسم کا فالج ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ممی ان کے غم کی وجہ سے نہ زندوں میں رہی ہیں' نہ مردوں میں۔ سدرہ کے شوہر کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور اس کے وہ خاندانی سسرال والے اس کو میکے نہیں آنے دیتے۔ وہ اور اس کے یتیم بچے اپنے گھر میں اس سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں جو تم نے اور مسرت چچی نے گزاری تھی۔ مہرین کو......"

"مجھے کچھ مت بتائیں فواد بھائی۔ پلیز' میں نے معاف کیا۔ سب معاف کیا۔ مجھے یہ سب بتا کر اور دکھ نہ دیں۔ ابھی مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" اس کے نرم لہجے میں منت تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اور یہ۔ تمہارا حصہ ہے ان تمام سالوں کے منافع سمیت۔ فرشتے کا حصہ میں اسے ادا کر چکا ہوں۔ ہو سکے تو ہمارے لیے دعا کرنا۔" وہ ایک فائل اور ایک مہر بند لفافہ اس کے بیڈ کی پائینتی پہ رکھ کر واپس مڑ گیا تھا۔

محمل نے گردن پھیر کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے' نادم' شکستہ حال جا رہا تھا۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ آغا فواد کا کیا انجام ہوا؟ مگر یہ دنیا انجام کی جگہ تھوڑی ہے؟ یہ تو امتحان کی جگہ ہے' اپنے گناہ نظر آنا بھی ایک امتحان ہے' اصل فیصلہ تو روز حساب ہی ہو گا۔

اس کے بیڈ کی پائینتی پر چند کاغذ رکھے تھے۔ وہ کاغذ جو کبھی اس کی زندگی کا محور تھے' مگر آج اس نے ان پہ دوسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ ان ہی کاغذوں کے لیے اس نے فواد کا جھانسہ قبول کیا تھا' آج فواد نے اسے خود لا دیے تھے' مگر کتنی بھاری قیمت تھی اس غلطی کی جو اسے چکانی پڑی تھی۔

کچی عمر کے کچے سودے۔

بارش دھیمی ہو چکی تھی۔ کھڑکی کی جالیاں گیلی ہو چکی تھیں۔ ان سے مٹی کی سوندھی خوشبو اندر آ رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھی خوشبو سونگھتی رہی۔ اسے لاشعوری طور پہ اس کا انتظار تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اس کے کمرے میں ضرور آئے گا۔

کان کھلے بہت گئے تو اس نے چوکھٹ پر آہٹ سنی۔ وہ آہستہ سے مڑی۔

ہمایوں تھکا ہارا سا دروازے میں کھڑا تھا۔ یہ وہ دروازہ تھا جو اس نے محمل کی موجودگی میں کبھی پار نہیں کیا تھا۔ یہ وہ چوکھٹ تھی جس پہ وہ کبھی سوالی بن کر نہیں آیا تھا۔ مگر آج وہ آیا تھا۔

اس کے تھکے تھکے ٹوٹے قدم آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئے تھے۔

"محمل!" ٹوٹی ہوئی آواز میں اس نے پکارا تھا۔ اور پھر وہ پورے قد سے' گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں آن گرا تھا۔

"مجھے معاف کر دو محمل!" اس کی آنکھیں سرخ تھیں' اور چہرے پہ صدیوں کی تھکان تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔ میں بہت دور چلا گیا تھا۔"

اس نے تاسف سے ہمایوں کو دیکھا۔ پہلے بھی وہ سب اس سے اس کا سب کچھ چھین کر لے گئے تھے۔ آج بھی وہ مانگ ہی رہے تھے' مانگنے ہی آئے تھے۔

ہر ایک کو اپنے ضمیر کے بوجھ سے نجات چاہیے تھی۔ محمل ابراہیم تو کہیں بھی نہیں تھی!

"میں نے صرف فرشتے کی بات پر... اور آج وہ کہہ رہی ہے کہ تم نے اس سے صرف ایک مسئلہ پوچھا تھا' اس نے خود غلط اخذ کیا۔ میں نے صرف فرشتے کی وجہ سے۔"

"کیا آپ نے پہلے زندگی کے سارے فیصلے فرشتے کے دماغ سے کیے تھے ایس پی صاحب؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔ "آپ چھوٹے بچے تھے جو یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے رشتے دار میرے کھلے دشمن ہیں؟ آپ ان پڑھ جاہل تھے جو یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایسی تصویریں تو ہر گلی محلے میں بن جاتی ہیں۔"

"محمل' یقین کرو' میں۔"

"ایک منٹ ایس پی صاحب! میں نے کئی مہینے صرف آپ کی سنی ہے۔ آج آپ میری سنیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے فرشتے کے کہے پہ یقین کر لیا؟ آج میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ آپ نے فرشتے سے پوچھا ہی کیوں؟ آپ میری طرف سے اتنے بدگمان تھے کہ آپ کو دوسروں سے پوچھنا پڑا؟ کیوں نہیں آپ نے وہ تصاویر معیز کے منہ پہ دے ماریں؟ کیا آپ بہت قابل پولیس آفیسر نہیں تھے؟ کیا آپ کو کھرا اور کھوٹا الگ کرنا نہیں آتا تھا؟ کیا آپ آرزو کی خصلت کو نہیں جانتے تھے؟ یا شاید آپ کی دلچسپی ایک بیمار' بے ہوش عورت میں ختم ہو گئی تھی۔ شاید آپ کو میری خدمت سے دور بھاگنے کا ایک موقع چاہیے تھا۔ آپ آزاد ہونا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیتے۔ ایک بار تو پوچھتے کہ کیا تم نے ایسا کیا ہے؟ مگر آپ خود بھی مجھ سے تھک گئے تھے۔ آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا ہمایوں کہ اگر میری جگہ آپ یوں بیمار ہوتے اور میں آپ کے ساتھ یہی کرتی تو آپ کی کیا حالت ہوتی؟"

بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ تب ہی کھلے دروازے سے تیمور بھاگتا ہوا اندر آیا۔ شور سن کر وہ نیند سے جاگا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا اور اس

کے گھٹنوں سے لپٹ گیا۔ مگر ہمایوں اور محمل اس کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

"محمل، مجھے معاف کردو۔ میں رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔" ہمایوں نے اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر محمل ایک دم پیچھے کو ہوئی۔

"لیکن اب میں ایسا نہیں چاہتی۔ ٹوٹے دھاگے کو دوبارہ جوڑا جائے تو اس میں ایک گرہ رہ جاتی ہے۔ ہمارے درمیان بھی وہ گرہ رہ گئی ہے، سو اس دھاگے کو ٹوٹا رہنے دیں۔"

"محمل!" وہ بے یقین تھا۔ معافی کے لیے جڑے اس کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ محمل نے گہری سانس لی۔

"میں نے آپ کو معاف کردیا ہے ہمایوں! دل سے معاف کردیا ہے۔ مگر اب رجوع کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ فرشتے سے شادی کریں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ درمیان میں، میں آگئی تھی۔"

"مگر محمل یہ... تم..." وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر آج وہ نہیں سن رہی تھی۔

"مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ ہمایوں۔ میرا بیٹا میرے پاس ہے۔ فواد نے مجھے میرا حصہ بھی دلا دیا ہے۔ میں لوگوں کی محتاج نہیں رہی۔ آپ فرشتے سے شادی کرلیں۔ وہ آپ کا انتظار کررہی ہے۔"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ہمایوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

فرشتے وہاں کھڑی رو رہی تھی۔ ہمایوں کو گردن موڑتے دیکھ کر، وہ منہ پہ ہاتھ رکھے باہر کو بھاگی تھی۔

"آپ اس کا اور امتحان نہ لیں۔ اس سے شادی کرلیں۔ میں اور تیمور ایک دوسرے کو بہت ہیں۔ ہمارا تیسرا اللہ ہے۔ آپ ہمیں جانے دیں۔ اب ہمارا ساتھ ناممکن ہے۔"

وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تمہاری قدر نہیں کی، محمل!" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھا، اور شکستہ قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

"دروازہ بند کرجایئے گا۔"

اس کے الفاظ پہ وہ ذرا دیر کو رکا، مگر پلٹا نہیں۔ اب شاید وہ پلٹنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔

بہت آہستہ سے وہ باہر نکلا اور کمرے کا دروازہ بند کیا۔

وہ محمل کی زندگی سے جاچکا تھا۔

دو آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹے اور گردن پہ لڑھک گئے۔

فرشتے کہتی تھی کہ اس نے سنا نہیں جب وہ برسوں پہلے اس ہسپتال میں "کچھ" بتانا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ منظر تو اسے آج بھی یاد تھا۔ وہ جو نرس کے پکارنے پہ اٹھی تھی، فرشتے کی ادھوری بات سن کر ہی اٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ فرشتے ہمایوں کو پسند کرتی ہے۔ مگر جب فرشتے نے خود اپنے رویے سے یقین دلایا تو وہ بھی بظاہر خود کو مطمئن کرنے لگی کہ بھلا فرشتے ایسے جذبات کیوں رکھے گی، مگر دور اندر وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔ اگر آرزو کو درمیان میں نہ دیکھا ہوتا تو وہ کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتی کہ ہمایوں کس سے شادی کررہا ہے۔ ہاں، وہ جانتی تھی کہ فرشتے کیوں ان کی شادی کے بعد باہر چلی گئی تھی۔

وہ سب جانتی تھی۔ یہ بھی کہ اب وہ معذور ہوگئی تھی۔ ایک بے کشش عورت بن گئی تھی۔ ہمایوں نادم ہو کر پلٹا تو تھا۔ مگر تھا تو مرد ہی۔ کب تک اس سے بندھا رہتا؟ جو کانوں کا اتنا کچا تھا کہ اس فون کال میں ایک انگوٹھی کا ذکر اس کی سمجھ میں آیا۔ اور اس کی مسلسل "فواد بھائی" "فواد بھائی" کی تکرار میں "بھائی" کا لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ کب تک اس کا رہتا؟ ایک نہ ایک دن وہ پھر کسی دوسری عورت کی طرف چلا جاتا۔ تب بھی وہ اکیلی رہ جاتی مگر تب وہ شاید برداشت نہ کرپاتی۔ اس میں بار بار ٹوٹنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ سو اس نے ٹوٹا ہوا برتن بننے کا سوچا۔ فرشتے نے اعتراف کیا تھا، معافی نہیں مانگی تھی۔ ہمایوں نے معافی مانگی تھی مگر اعتراف نہیں کیا تھا۔ اور وہ دونوں سمجھتے تھے کہ

وہ بری الذمہ ہوگئے ہیں۔ خیر!

"تیمور!" اس نے گود میں سر رکھے تیمور کے نرم بھورے بالوں کو پیار سے سہلایا۔

"ہوں؟" وہ کچی نیند میں تھا۔

"تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یوسف علیہ السلام کے ذکر پہ اداس کیوں ہوجاتی ہوں، ہے نا؟"

"جی ماما!" وہ نیم غنودہ سا بولا۔

"پتا ہے میں کیوں اداس جاتی ہوں؟" اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ "کیونکہ وہ بہت صبر کرنے والے تھے اور وہ اپنے والد کے بہت پیارے تھے۔" اسے بولتے ہوئے کچھ اور بھی یاد آرہا تھا۔

"مگر ان کے اپنے بھائیوں نے ان کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔" اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ مناظر تیزی سے چل رہے تھے۔

"پھر ان کو درہم کے عوض مصر میں بیچا گیا۔ ان پہ بہتان لگایا گیا۔ ان کو برسوں قید میں رکھا گیا۔ اور پھر ایک دن آیا جب وہ اسی مصر کے خزائن کے منتظم بنے جس میں کبھی ان کو بیچا گیا تھا۔ ان کو اپنا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ اور وہ جنہوں نے ان پہ تہمتیں لگائی تھیں۔ اور وہ جنہوں نے ان کو ان کے گھر سے بے دخل کیا تھا، وہ ان کے پاس معافی مانگنے آئے۔ مگر اس ہستی نے کچھ نہیں جتایا، کچھ نہیں گنوایا، سب کو معاف کردیا۔ میں اس لیے اداس ہوتی ہوں تیمور کہ میں صبر کے اس مقام پہ کبھی نہیں پہنچ سکی۔ کیا تم سن رہے ہو؟" اس نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا۔ اور پھر جھک کر اس کے بالوں کو چوما۔

تیمور گہری نیند سوچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی لاؤنج کی مرکزی دیوار پہ بڑی سی پلازمہ اسکرین لگی تھی۔ اس پر ایک خوبصورت منظر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

روشنیوں سے منور ایک بڑا سا ہال، ہزاروں لوگوں

کا مجمع۔ اسٹیج پہ بیٹھی نامور دینی شخصیات اور روسٹرم پہ کھڑا وہ شخص جو لیکچر دے رہا تھا۔

ٹی وی کے سامنے صوفے پہ بیٹھے ہمایوں داؤد نے ریموٹ اٹھا کر آواز اونچی کی۔ والیوم کے بڑھتے نقطے اسکرین پہ موجود شخص کے کوٹ پہ نمودار ہوئے تھے۔

ہمایوں نے ریموٹ رکھ دیا۔ اب وہ بنا پلک جھپکے ساکت بیٹھا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ فیصلہ آج نہیں ہوا تھا، بلکہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہی ہو گیا تھا کہ قرآن صرف عربی کا قرآن ہے۔ اس کے تراجم قرآن نہیں ہیں۔"

وہ روشن چہرے والا شخص اپنے خوبصورت انگریزی لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پہ نفاست سے تراشیدہ داڑھی تھی، اور سر پہ سفید جالی دار ٹوپی اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ کانچ سی بھوری، چمکتی ہوئی۔ اور مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔ کچھ تھا اس کی مسحور کن شخصیت میں کہ ہزاروں لوگوں سے بھرے ہال میں سناٹا تھا۔ سب سانس روکے اس کی بات سن رہے تھے۔

"آج کے دور کا مسلم جب قرآن کھولتا ہے تو کہتا ہے کہ اسے اس میں وہ انداز کلام نظر نہیں آرہا جس کے قصے وہ بچپن سے سنتا آیا ہے وہ انداز کلام جسے سنتے ہی عرب کے لوگ لاجواب ہو جاتے تھے، سجدے میں گر جاتے تھے، فوراً" ایمان لے آتے تھے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس قرآن کا لاکھ انکار کرنے کے باوجود ابو جہل بن ہشام جیسے لوگ بھی چھپ چھپ کر اسے سننے آتے تھے؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہمیں اس میں وہ بات نہیں نظر آتی جو ان عربوں کو نظر آتی تھی؟ ہمیں کیوں یہ صرف قصوں کا مجموعہ لگتا ہے جن کے درمیان چند نصیحتیں ہیں اور نماز روزے کے احکام؟"

ہمایوں نے ریموٹ اٹھا کر دوبارہ آواز اونچی کی، اور پھر مضطرب انداز میں اسے واپس رکھ دیا۔

کیا آپ نے ڈاکٹر موریس بکائی کا واقعہ سنا ہے؟"

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا اور پورے ہال پہ نگاہ دوڑائی۔ سب دم سادھے اس کو سن رہے تھے۔

"ڈاکٹر موریس بکائی ایک فرنچ ڈاکٹر تھے۔ وہ اپنے پاس آنے والے ہر مسلمان مریض سے کہتے تھے کہ قرآن حق نہیں ہے بلکہ ایک من گھڑت کتاب ہے۔ مریض بے چارے آگے سے خاموش ہو جاتے۔ پھر ایک دفعہ جب شاہ فیصل ان کے پاس زیر علاج تھے۔ انہوں نے یہی بات شاہ فیصل سے کہی تو انہوں نے پوچھا "کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟" ڈاکٹر بکائی نے کہا کہ "ہاں پڑھا ہے" شاہ فیصل نے پوچھا کہ کیا پڑھا ہے تو انہوں نے بتایا کہ قرآن کا ترجمہ پڑھا ہے اس پر شاہ فیصل نے کہا "پھر تم نے قرآن نہیں پڑھا کیونکہ قرآن صرف عربی میں ہے۔"

ڈاکٹر بکائی نے اس کے بعد دو سال لگا کر عربی سیکھی، اور پھر جب انہوں نے اصل قرآن پڑھا تو وہ فوراً" مسلمان ہو گئے۔ بات در اصل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں نے قرآن نہیں پڑھا ہوتا۔ جو عربی ہم پڑھتے ہیں اس کا لیٹرل ورڈ مینگ litrered word meaning ہمیں نہیں آتا ہوتا اور اس کا جو اردو ترجمہ ہم پڑھتے ہیں وہ اللہ نے نہیں اتارا ہوتا۔ کسی حد تک یہ تراجم اثر کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی قرآن کا اصل جاننا چاہتا ہے۔ تو اسے چاہیے کہ وہ عربی کا قرآن پڑھے۔"

ہمایوں کے صوفے کے پیچھے جانے کب آہستہ سے فرشتے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ بنا پلک جھپکے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"اب اس کے دو طریقے ہیں، یا تو آپ پوری عربی سیکھیں، یا آپ صرف قرآن کی عربی سیکھیں اور صرف قرآن کی عربی سیکھ کر بھی آپ بالکل درست طور پہ اصل قرآن سمجھ سکتے ہیں۔ اینی کوئسچن؟"

اس نے رک کر ہال پہ نگاہ دوڑائی۔

اسٹیج کے سامنے نیچے لگے مائیک کے قریب کھڑی ایک پاکستانی لڑکی فوراً" آگے بڑھی اور مائیک تھاما۔

"السلام علیکم ڈاکٹر تیمور۔"

"وعلیکم السلام!" وہ سر کے خفیف اشارے سے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"سر! مجھے آپ کی بات سن کر یہ سب بہت مشکل لگ رہا ہے۔ عربی بہت مشکل زبان ہے اور پیچیدہ اور یہ ہماری مادری زبان نہیں ہے۔ عام آدمی اسے کیسے سیکھ سکتا ہے؟"

وہ ذرا سا مسکرایا، اپنا اور پرہ مائیک کے قریب لایا۔

"بالکل ایسے جیسے ہمارے ملک کے عام آدمی نے دنیا کے علوم حاصل کرنے کے لیے انگریزی سیکھی ہے۔ وہ بھی ہماری زبان نہیں ہے۔ مگر ہمیں آگئی ہے۔ کیا نہیں آئی؟

عربی سیکھنا تو زیادہ آسان اس لیے بھی ہے کہ یہ اردو سے بہت قریب ہے۔"

لڑکی نے لاجواب ہو کر گہری سانس بھری پیچھے پورے ہال میں ایک تبسم بکھر گیا۔

"سر! ایک کنفیوژن ہے سر!" ایک نوعمر لمبا سا لڑکا مائیک پہ آیا۔ "میں نے آپ کے پچھلے لیکچر سے متاثر ہو کر قرآن سیکھنا شروع کیا تھا مگر قرآن پڑھتے اب مجھ پر پہلے والی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ دل میں گداز نہیں پیدا ہوتا، میں قرآن پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بھٹک رہا ہوتا ہے۔"

تیمور نے مائیک قریب کیا، پھر بغور اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کہیں جھوٹ تو نہیں بولتے؟"

"جی؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ایک بات یاد رکھیے گا، قرآن صرف صادق اور امین کے دل میں اترتا ہے۔

میں نے اس کتاب کے بڑے بڑے علماء کو دیکھا ہے جو امانت کی راہ سے ذرا سے پھسلے، اور پھر ان سے قرآن کی حلاوت چھین لی گئی، اور پھر کبھی وہ اس کتاب کو ہاتھ نہ لگا سکے۔"

ہمایوں کی کانچ سی بھوری آنکھوں میں ایک کرب ابھرا تھا۔ اس کے صوفے کی پشت پہ ہاتھ رکھے فرشتے ساکت کھڑی تھی اس کے پیچھے دیوار میں شیلف بنا تھا۔ ایک طرف میز تھی۔ میز پہ تازہ تہہ کی ہوئی جائے نماز ابھی ابھی رکھی گئی تھی۔

ساتھ شیلف کے سب سے اوپر والے خانے میں احتیاط سے غلاف میں لپٹی ایک کتاب رکھی تھی۔ اس کا غلاف بہت خوبصورت تھا۔ سرخ ویلوٹ کے اوپر سلور ستارے مگر گزرتے وقت نے غلاف کے اوپر گرد کی ایک تہہ جما دی تھی۔

اور وہ شیلف اتنا اونچا تھا کہ اس تک اسٹول پہ چڑھے بغیر ہاتھ نہیں جاتا تھا۔

"جس شخص میں صداقت اور امانت ہوتی ہے اور وہ واقعی قرآن حاصل کرنا چاہتا ہے تو قرآن اس کو دے دیا جاتا ہے۔" اسکرین وہ پہ روشن چہرے والا شخص کہہ رہا تھا۔

"ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عرب معاشرے کے بارے میں عمومی تاثر یہ رکھتے ہیں کہ وہ بہت جاہل گنوار لوگ تھے، اور بیٹیوں کو زندہ دبانے والے وحشی تھے، لیکن ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ مہمان نواز تھے عہد کی پاس داری کرتے تھے۔ جہاں تک بیٹیوں کو زندہ در گور کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام عرب کے کچھ غریب قبائل کرتے تھے اور اس وقت بھی انسانی حقوق کی تنظیمیں تھیں جو فدیہ دے کر ان بچیوں کو چھڑاتی تھیں۔ اور رہی بات صداقت کی تو عرب معاشرے میں جھوٹ بولنا انتہائی قبیح عمل سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس شخص پہ حیران ہوتے تھے جو جھوٹ بولتا ہو، اسی لیے ان لوگوں کو قرآن دیا گیا تھا اور اسی لیے ہم لوگ اس کی سمجھ سے محروم کر دیے گئے ہیں کیونکہ نہ تو ہم سچ بولتے ہیں، اور نہ ہی امانت کا خیال رکھتے ہیں، بھلے وہ کسی ذمہ داری کی امانت ہو، کسی کی عزت کی، یا کسی کے راز کی۔"

محمل مسکرا کر ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

وہ سیمینار ملائیشیا سے لائیو آرہا تھا۔ سیمینار ختم ہوتے ہی تیمور نے فلائٹ لینی تھی اور وہ جانتی تھی کہ رات کھانے پہ وہ ان کے ساتھ ہو گا۔ ابھی اس نے

تیمور کے لیے اسپیشل ڈش کی تیاری بھی شروع کرنا تھی سو وہ پروگرام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

تیمور کے لیے کھانا وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے خود تیار کرتی تھی۔ ایک ایک سبزی خود کاٹتی تھی ہاں، آغا جان کا پرہیزی کھانا ملازمہ بنالیتی تھی۔

وہ سیڑھیوں کے ایک طرف سے نکلتی ہوئی آغا جان کے کمرے کے دروازے کے باہر رکی اور اسے ہولے سے کھٹکھٹا کر کھولا۔

"آغا جان! آپ نے ناشتا کرلیا؟"

وہ بیڈ پہ لیٹے تھے۔ ان کے ہونٹ فالج کے باعث ذرا ٹیڑھے ہوگئے تھے۔ اس کی آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

جب سے وہ اپنی اولاد پہ بوجھ بنے تھے، محمل انہیں اپنے پاس لے آئی تھی۔

"تیمور کہہ رہا تھا، وہ رات تک پہنچ جائے گا۔"

وہ آگے بڑھی اور کھڑے کھڑے ان کا ہاتھ نرمی سے تھامے بتانے لگی۔

"میں رات کو کچھ اسپیشل بنانے کا سوچ رہی ہوں، کتنے دنوں بعد ہم تینوں اکٹھے کھانا کھائیں گے، ہے نا؟"

آغا جان نے پھر مسکرانے کی سعی کی، اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے۔

"آپ فکر مت کیا کریں، میں ہوں نا آپ کے پاس۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی آپ کو بھی دے گا۔" اس نے نرمی سے ان کے آنسو صاف کیے۔ "اچھا، مجھے مسجد میں ایک لیکچر دینا ہے، بس گھنٹہ لگے گا، میں ابھی چلتی ہوں، جلدی آنے کی کوشش کروں گی، پھر ڈنر کی تیاری بھی کرنی ہوگی۔" وہ گھڑی دیکھتی جانے کے لیے مڑی۔

آغا جان اب سسک سسک کر رو رہے تھے۔

باہر آکر وہ سیڑھیوں کے پاس لگے آئینے کے سامنے رکی۔ سامنے ٹیبل پہ اس کی پونی ٹنگی تھی۔ اس نے پونی اٹھائی اور لمبے بال سمیٹ کر اونچی پونی میں جکڑے، پھر ایک نظر آئینے میں خود کو دیکھا اور مسکرادی۔

وہ آج بھی اتنی ہی صبیح، تروتازہ اور خوب صورت تھی جتنی برسوں پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ اونچی پونی آج بھی اس پہ اتنی ہی خوب صورت لگ رہی تھی جتنی پہلے لگتی تھی۔ اور آج بھی ہر صبح وہ وہیں جاتی تھی جہاں پہلے جایا کرتی تھی۔

اس نے ٹی وی بند کیا۔ (تیمور کا پروگرام ختم ہوچکا تھا) اور میز سے اپنا بیگ اور سفید جلد والا قرآن اٹھائے "آغا ہاؤس" سے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

وہ مسجد جانے سے قبل پندرہ منٹ کے لیے بس اسٹاپ ضرور جایا کرتی تھی۔ اسے کئی برسوں سے اس سیاہ فام لڑکی کی تلاش تھی جس نے اس تک قرآن پہنچایا تھا۔ وہ ایک دفعہ اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

سنہری سی صبح اتری ہوئی تھی۔ اور کہیں پرندے بول رہے تھے، وہ دھیمی رفتار سے چلتی سفید جلد والا قرآن سینے سے لگائے بینچ پہ آبیٹھی۔ ہر صبح کی طرح آج بھی وہ اسی موہوم سی امید پہ ادھر آئی تھی کہ شاید وہ لڑکی آجائے۔

رات خوب بارش ہوئی تھی۔ سرمئی سڑک ابھی تک گیلی تھی۔ وہ سر جھکائے اداس سی بیٹھی سڑک پہ چلتی چیونٹیاں دیکھ رہی تھی۔

پندرہ منٹ ختم ہونے کو آئے تھے مگر وہ لڑکی کہیں بھی نہیں تھی۔

مایوس ہو کر محمل نے جانے کے لیے بیگ اٹھایا۔

تب ہی اسے سڑک پہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اس نے بے اختیار سر اٹھایا۔

ایک لڑکی دور سے چلی آرہی تھی۔

کندھے پہ کالج بیگ، ہاتھ میں موبائل، شولڈر کٹ بال کیچر میں جکڑے ہوئے جینز پہ کرتا پہنے چیونگم چباتی، قدرے جھنجلائی ہوئی سی وہ دھپ سے آکر اس کے ساتھ بینچ پہ بیٹھی۔

محمل یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ لڑکی روز اس وقت ادھر آتی تھی، مگر آج سے پہلے وہ اسے دیکھ کر اتنی چونکی نہیں تھی۔ اب وہ باؤس جھلاتی ہوئی اکتا کر موبائل کے بٹن پریس کررہی تھی۔

"پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو۔" زیر لب غصے سے بڑبڑا کر اس نے ایک بٹن زور سے دبایا اور موبائل بیگ میں پھینکا۔

وہ ابھی تک یوں ہی اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ بہت دیر سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

وہ لڑکی ادھر ادھر گردن گھماتی تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ "دفعتاً" محمل کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کرکے وہ چونکی۔

محمل نے ذرا سنبھل کر نگاہیں جھکالیں۔ نیچے اس لڑکی کا بیگ پڑا تھا، جس پہ جگہ جگہ چاک سے اس کا نام لکھا تھا۔

"عشاء حیدر۔"

وہ زیر لب مسکرادی بہت کچھ یاد آگیا تھا۔

"ہیلو بیگ ایکسکیوز می!" اس نے چیونگم چبانا روک کر ایک دم محمل کو مخاطب کیا۔ محمل نے نرمی سے نگاہیں اٹھائیں۔

"جی؟"

"میں روز آپ کو دیکھتی ہوں اور......" اس نے محمل کی گود میں بیگ کے اوپر رکھے سفید کور والے قرآن کی طرف اشارہ کیا۔ "اور آپ کی اس بک کو بھی۔ آپ اتنی کیئر سے اسے رکھتی ہیں، اس میں کیا کچھ خاص ہے؟"

محمل نے سر جھکا کر سفید قرآن کو دیکھا، جس کی سافٹ جلد اب خستہ ہوگئی تھی اور جھلکتے صفحے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ دیکھنے سے کوئی بہت قدیم کتاب لگتی تھی۔

"خاص تو ہے۔" اس نے مسکرا کر سر اٹھایا۔

"اچھا۔ واٹس سو اسپیشل؟" وہ متجسس ہوئی۔

"اس میں کسی عشاء حیدر کا ذکر ہے، اس کی زندگی کی کہانی ہے اور اس کے لیے کچھ میسجز ہیں۔ اس لیے اسپیشل تو ہے۔"

وہ لڑکی یک ٹک منہ کھولے اسے دیکھے گئی۔

"کون...... کون عشاء حیدر؟" بہت دیر بعد بمشکل وہ بول پائی تھی۔

"ہے ایک اس زمین پہ بسنے والی لڑکی جس کو لوگوں کی باتیں غمگین کرتی ہیں، جس کے کہنے سے قبل کوئی اس کے دل کی بات نہیں سمجھتا اور جس کو زندگی سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے۔"

اسی لمحے بس نے ہارن بجایا۔ محمل نے بات روک کر دور سے آتی بس کو دیکھا۔

"میں چلتی ہوں، تمہاری بس آگئی ہے۔" وہ سفید جلد والی کتاب اور بیگ اٹھائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لڑکی ابھی تک ششدر سی بیٹھی تھی۔

بس قریب آرہی تھی۔

محمل چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بینچ سے دور جانے لگی۔

"سنیں...... بات سنیں، ایک منٹ رکیں۔" یک دم وہ بے چینی سے اٹھی اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

☼

بشریٰ سعید

سفال گر

جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مدِ نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رشتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کرپاتے اور تڑخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسّر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو، مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی، کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں، میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں، مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

ناول

دسویں قسط

وہ کارل میکارتھی کی آواز تھی۔ اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اس نے آواز پہچاننے میں غلطی کی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" دوسری آواز اجنبی تھی۔

"جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت مدد لے کر واپس آ سکتی ہے۔ اب یہاں رکنا خطرناک ہے۔"

وہ کمرے میں توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ چیزوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"اگر آج وہ ہاتھ آ جاتی تو میں اس کی ایسی فلم تیار کرتا کہ پورے واٹس میں اس کی دھوم ہو جاتی۔ اس کتیا کی مجال دیکھو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے تمہارے منہ سے گھٹیا تمباکو کی بو آ رہی ہے۔ پروم نائٹ پر بھی اس خبطی بوڑھے نے آ کر بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ورنہ تو اب تک وہ میرے پیروں کے تلوے چاٹ رہی ہوتی۔ چلو، اس بوڑھے کو تو سب کے سامنے مجھے ذلیل کرنے کا صلہ مل گیا ہے۔"

"ہاں اس رات تو میں نے مکمل انتظام کیا تھا۔ لائٹنگ سے کیمرے تک، سب تیاری شاندار تھی۔ کمرشل معیار کی فوٹیج ہاتھ آ جاتی۔" کارل کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے کونوں میں گھستی تاریکی بے حد گہری ہو گئی۔ اس تنگ خلا میں اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔

"کہیں وہ بوڑھا مر ہی نہ جائے۔"

"یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ بس تم اپنی کوئی چیز یہاں مت چھوڑنا۔ اب نکلو جلدی۔" کینوس کے جوتے دوڑتے ہوئے دور جا رہے تھے۔ جب مکمل خاموشی چھا گئی تو اس نے بیڈ کا پایا پکڑتے ہوئے خود کو باہر کھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے گرد سے اٹ گئے تھے۔

وہ کمرے سے باہر آئی اور گرانٹ کو فرش پر اوندھے منہ پڑے ہوئے دیکھا اس کے سر سے خون بہہ کر ایک چھوٹے سے تالاب کی صورت فرش پر جمع ہو رہا تھا، صوفیہ اس سے تھوڑی دور چپ چاپ کھڑی ہو کر اس کو دیکھنے لگی اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ گرانٹ بے ہوش نہیں تھا۔ اس کے جسم میں حرکت کے آثار موجود تھے۔ پھر اس نے بمشکل گردن اٹھاتے ہوئے صوفیہ کی جانب بازو لمبا کیا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ کافی دیر وہ بولنے کی سرتوڑ جدوجہد کرتا رہا۔ پھر ایک سرگوشی برآمد ہوئی۔

"خدا کے لیے میری مدد کرو۔"

صوفیہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی۔

"میں خدا کے لیے بھی کچھ نہیں کرتی۔ خدا نے میرے ساتھ جو کیا ہے اس کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گی۔"

وہ خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔

"میں مر رہا ہوں۔ کسی کو مدد کے لیے بلاؤ۔ کچھ کرو۔ میں مر جاؤں گا۔"

خون کے تالاب کا حجم رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ صوفیہ کو خیال آیا کہ کہیں وہ واقعی مر نہ جائے۔ وہ مر جاتا تو صوفیہ کی ایک خواہش تشنہ رہ جاتی۔ اسے اپنی خواہش کی موت گوارا نہیں تھی۔

اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نو کے ہندسے پر انگلی رکھی۔ پھر اسے کچھ عرصہ پہلے کہی ہوئی پولیس آفیسر کی بات یاد آئی کہ سوائے ہنگامی صورت حال کے نائن ون ون پر کال نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے انگلی ہٹالی۔ ایسی بھی ہنگامی حالت درپیش نہ تھی۔ قریب المرگ ہونے کی کوئی نشانی گرانٹ میں نظر نہ آتی تھی۔

ٹیلی فون اسٹینڈ کے نچلے خانے میں پڑی ہوئی ڈائری ہاتھ میں لے کر وہ آہستگی سے اس کے اوراق پلٹنے لگی۔

گرانٹ کے ایک جاننے والے ڈاکٹر کا نمبر اس ڈائری میں کہیں درج تھا۔ صوفیہ بھی اسے جانتی تھی۔ وہ اسے ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر فرڈیننڈ کا اسے مطلوبہ نمبر مل گیا۔ گرانٹ کا بدن اب دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ صوفیہ یوں رک رک کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کا نمبر ملانے لگی جیسے ماضی میں کبھی اسے ٹیلی فون استعمال کرنے کا تجربہ نہ ہوا ہو۔

ڈاکٹر فرڈیننڈ نے آنکھیں موندے لیٹے ہوئے گرانٹ کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ گرانٹ کی آنکھیں اگرچہ بند تھیں لیکن وہ سو نہیں رہا تھا۔ خیر گزری کہ اس کی کھوپڑی چٹخنے سے بچ گئی تھی۔ وہ زخم باعث تشویش نہیں تھا۔ اسے مندمل ہونے میں چند ہی دن لگتے۔ مگر اس سے ہٹ کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کی نظر میں کچھ ایسی بات آئی تھی کہ وہ گرانٹ کے لیے بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ اس کی کلائیوں، پنڈلیوں اور چھاتی پر بے شمار نیلاہٹ مائل سرخ ابھار ایک ڈاکٹر کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجانے کا قوی موجب تھے۔

گرانٹ اور اس کی برسوں سے آشنائی تھی۔ گو ان کے درمیان تعلقات کبھی بھی زیادہ دوستانہ نہیں رہے تھے، پھر بھی ان میں ایک خاص ربط تھا۔ اس کی گرانٹ سے آخری ملاقات ہوئے دو سے تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور اتنی مدت بعد گرانٹ کو دوبارہ دیکھنے پر اسے زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ غیر معمولی حد تک دبلا اور نحیف ہو چکا تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہ پایا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کو اس پر ترس آیا تھا۔

وہ کچھ وقت خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے دھیمی آواز میں گرانٹ کو مخاطب کیا۔

"تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور کسمسا کر ذرا سا اچکنے کی کوشش کی۔

"آرام سے لیٹے رہو۔" ڈاکٹر فرڈیننڈ نے روکا تھا۔ "تمہارے سر پہ ٹانکے لگے ہیں۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں لگی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ Cops تو رات کو ہی تمہارا بیان لینا چاہتے تھے۔ ہم نے انہیں منع کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ آئیں گے۔"

گرانٹ اسے خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا۔

"بہت مدت ہو گئی ہمیں ملے ہوئے، تم نے بھی رابطہ نہیں کیا اور میں بھی اتنا مصروف رہا کہ تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ......"

گرانٹ نے اس کی بات قطع کر دی۔ "کیا اس سے قبل میں تم سے مل چکا ہوں؟ کہاں؟"

ڈاکٹر فرڈیننڈ کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں رینگنے لگیں۔ "تم مجھے نہیں پہچانتے گرانٹ۔"

"کیا مجھے پہچاننا چاہیے؟ مجھے یقین ہے کہ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔" وہ الجھن زدہ نظر آنے لگا۔

"ٹھیک ہے، پریشان مت ہو، سر کی چوٹ کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے۔" ڈاکٹر فرڈیننڈ نے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "کیا اس واقعے سے پہلے بھی کبھی تمہیں چیزیں بھولی ہیں؟"

"ہاں میں کبھی کبھی بھول جاتا ہوں، چند روز پہلے کا قصہ ہے کہ میں کار ڈرائیو کرنا بھول گیا تھا۔ مجھے اس کو اسٹارٹ کرنے کا طریقہ ہی یاد نہیں آ رہا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے نا، لیکن اگر ہم ملتے رہے ہیں تو میں تمہیں کیوں فراموش کروں گا۔ غالباً ہماری ایک آدھ ملاقات ہی ہوئی ہوگی۔ تب ہی مجھے تمہارے متعلق یاد نہیں آ رہا، ایسی ہی بات ہے نا۔"

ڈاکٹر فرڈیننڈ نے تردید نہیں کی تھی۔ "تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اس مسئلے کا علاج موجود ہے۔ کیا تم نے اس بارے میں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا ہے؟"

"نہیں۔ ابھی تک تو نہیں کیا۔"

"اچھا تو صوفیہ کیسی ہے؟ اسے یہاں تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا، لیکن مجھے اطلاع دینے کے بعد اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ تم کہو تو میں اسے فون کر کے بلا لیتا ہوں۔ اس کے یہاں ہونے سے تمہیں اچھا لگے گا۔"

اس کے منہ سے صوفیہ کا ذکر سن کر گرانٹ کی الجھن بڑھ گئی۔ "تم صوفیہ کو کیسے جانتے ہو؟"

"مجھے کیوں معلوم نہیں ہوگا گرانٹ! میں تم سب کو اچھی طرح جانتا ہوں، تمہیں، صوفیہ کو اور البا کو بھی۔"

گرانٹ! تمہارے جسم پر یہ جو چھالے ہیں تم کہیں ان کا علاج کروا رہے ہو؟ آخری بار تم کب ڈاکٹر سے ملے تھے۔" ڈاکٹر فرڈیننڈ نے پوچھا۔

"میں نے کسی معالج کو نہیں دکھایا۔ ڈاکٹروں کی فیس کون ادا کرے۔ میں ایک نادار آدمی ہوں، یہ تو معمولی نشانات ہیں، مجھے ان سے کوئی خاص پریشانی نہیں ہے، کیا مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت ہے؟"

"تم اپنی صحت کی طرف سے بہت لاپروائی برت رہے ہو، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، میں ابھی اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں ریفر کردوں گا۔ اسکن بائیوپسی اور کچھ دوسرے ٹیسٹ کیے جائیں گے، پھر ہی صورت حال واضح ہوگی۔ کیا تمہاری میڈیکل انشورنس ہوئی ہے؟"

اس سوال کا جواب بھی نفی میں آیا تھا۔ "میں ان بکھیڑوں میں کبھی نہیں پڑا۔"

ڈاکٹر فرڈیننڈ چند ثانیے سوچتا رہا تھا۔ "امریکہ میں علاج کی سہولیات بہت مہنگی ہیں، تم صحیح کہتے ہو کئی لوگ تو صرف میڈیکل بلز کی وجہ سے دیوالیہ ہوگئے، میں اس مشکل کا حل میں نکال لوں گا۔ تم اب کوئی غفلت نہ کرنا اور جلد صحت یاب ہو جاؤ۔" ڈاکٹر فرڈیننڈ اس کے بازو کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے نرمی سے مسکرایا۔

"صوفیہ!" اچانک گرانٹ زور سے بولا۔ "صوفیہ کو ان لوگوں نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، وہ ٹھیک تو ہے؟" شاید اب تک یہ پہلو اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوا، میں نے خود فون پر اس سے بات کی تھی۔ وہ بالکل محفوظ ہے، ممکن ہے تھوڑی دیر تک Cops تم سے رات والے حادثے کے بارے میں پوچھنے آئیں، تمہیں جو معلوم ہو انہیں بتا دینا۔ ٹھیک ہے تم آرام کرو، میں اب چلتا ہوں، پھر تم سے ملنے آؤں گا۔"

ڈاکٹر فرڈیننڈ اٹھ کر جانے لگا تو گرانٹ نے اسے آواز دی۔ "تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم کون ہو، مجھے یاد دلانے کی کوشش تو کرو، میں بڑی الجھن محسوس کر رہا ہوں۔"

تب ڈاکٹر فرڈیننڈ نے جو حوالہ دیا اسے سن کر گرانٹ کو یاد آگیا کہ وہ کون تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور منہ دو، تین دفعہ یوں کھل کر بند ہوا جیسے اس کا گلا رندھ گیا ہو۔

جاڑے کی ناتواں دھوپ سکھ چین اور املتاس کے پتوں میں دبک کر بیٹھی تھی۔ اس کا عکس پتھریلی روشوں اور گھاس بھرے میدان پر اترتے ہوئے غیر شفاف ہو جاتا تھا۔ اس بیمار دھوپ نے اسپتال کے در و دیوار پر اداسی مل دی تھی۔ اسپتال کے برآمدوں میں بیٹھے ہوئے اور چلنے پھرنے والے لوگوں کے چہرے ملول تھے۔ ان میں سے بعض مریض تھے اور بعض مریضوں کے لواحقین یا تیمار دار تھے۔ ہر ایک کسی نہ کسی طرح کی پریشانی کا شکار تھا۔

عمر کو ان لوگوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی مصیبت میں مبتلا نظر نہیں آتا جیسی خود اس پر وارد ہوئی تھی۔ مایوسی، شرمندگی، پچھتاوا، تاسف، بے کلی کیا تھا جو وہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جلتی ہوئی آنکھوں پر انگلیوں کی پوریں پھیرتے ہوئے اس نے پاس بیٹھی حکیم بیگم کو دیکھا تھا۔ وہ سنگی بینچ کی پشت سے سر ٹکیے آنکھیں موند کر کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی آواز ایک مدھم بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اس لیے عمر اس کے الفاظ وضاحت سے سن نہیں پا رہا تھا۔

اس وقت وہ گھاس کے اس میدان میں موجود تھے جو اسپتال کی مرکزی عمارت کے دائیں پہلو میں کسی دبیز سبز غالیچے کی مانند بچھا تھا اور جس میں جا بجا سایہ دار درختوں تلے پتھریلی نشستیں نصب تھیں۔ تین دن سے پرنیاں اس اسپتال میں زیر علاج تھی۔ چند گھنٹے انٹینسیو کیئر یونٹ میں رکھنے کے بعد اسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ کلائیوں کے زخموں کی جراحت ہو چکی تھی اور اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ البتہ خون کی شدید کمی کے پیش نظر اسے

خون فراہم کیا جا رہا تھا اور ایک، دو روز میں اسپتال سے فراغت کی امید تھی۔ چند منٹ قبل وارڈ میں معمول کی صفائی کا آغاز ہونے لگا تو مریضوں کے تیمار داروں کو وارڈ سے باہر جانے کی ہدایت کی گئی، لہٰذا وہ اور حکیم بیگم لان میں آکر بیٹھے تھے۔

اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کر کے حکیم بیگم نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر نرم لہجے میں بولی۔

"کاکا! تو نے اک وار بھی اپنی ماں سے بات نئیں کی۔ اس دا حال نئیں پوچھا۔ تو دو لفظ معافی دے بول دے۔ اس دا روح راضی ہو جائے گا (وہ خوش ہو جائے گی) تیرا وی جی ہولا ہو گا۔ (تمہارا بھی دل ہلکا ہو گا) ہن چپ رہن دا ویلا نئیں۔ سینے وا ڈھکن کھول دے۔ اندر دی ہواڑ کو باہر نکلن دے۔"

"بے جی! میں آپا کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جاتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ مجھے بولنا کیا ہے۔ جانے کچھ بولنا بھی ہے یا نہیں۔" اس نے شکستہ آواز میں کہا۔

"میرا سوہنا پتر۔ جے تو اس نوں مندے لفظ بول سکتا ہے تے چنگے بول کہنے میں کی (کیا) اوکھیائی ہے تو ہمت تے کر، جے گرہ لگ جائے تے دھاگہ توڑن توں پہلاں گرہ کھولن دا چارہ ضرور کرنا چاہی دا اے۔"

(میرا پاگل بیٹا، جب تو اس سے سخت باتیں کہہ سکتا ہے تو اچھی باتیں کہنے میں کیا مشکل ہے۔ تو ہمت تو کر، جب دھاگا الجھ جائے تو اس کو توڑنے سے پہلے سلجھانے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے)

وہ جب سے لاہور آئی تھی مسلسل عمر کو پرنیاں کی جانب پیش قدمی کرنے پر آمادہ کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کی تکرار سے اکتا کر دانستہ موضوع بدل دیا۔

"اگلے منگل کو میں امریکہ چلا جاؤں گا تو آپا اکیلی ہوگی۔ جب تک اس کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہ ہو تو اس کے پاس رہنا، شاید وہ تیری مدد لینے سے انکار کرے اور تجھے واپس گاؤں جانے کو کہے، پر تو پروا نہ کرنا۔ وہ چند دن اپنے دونوں ہاتھوں سے کوئی کام نہیں لے سکے گی۔ چھوٹی سے چھوٹی ضرورت پوری کرنے کے لیے اسے کسی دوسرے کی مدد درکار ہوگی تو اس کے ساتھ رہے گی تو مجھے اطمینان رہے گا۔"

اس کے امریکہ جانے کے ذکر پر ہمیشہ حکیم بیگم کبیدہ خاطر ہوتی تھی، اب بھی یہ تذکرہ اسے دکھی کر گیا۔

"تجھے اس کی فکر ہے تو امریکہ جاتا کیوں ہے؟ ارادہ توڑ دے۔ اتھے (ادھر) رہ کے اس کی سیوا کر۔"

عمر نے اس کے چہرے سے نظر ہٹالی۔

"تو جانتی ہے میں پڑھائی کرنے امریکہ جا رہا ہوں، سب طے ہو چکا ہے۔ میں ارادہ بدل نہیں سکتا۔ میرا جانا ضروری ہے۔"

"جو زیادہ ضروری کم ہے وہ کرنا نئیں تو پڑھائی دا بج نہ لا (بہانہ نہ بنا) مجھے بالڑی (بچی) نہ سمجھ تو (بھاگ کر) جا رہا ہے۔ تیری لک جان دی صلاح ہے۔ اکھاں میٹ کے بھل جان دا ارادہ ہے۔ (تمہاری چھپنے کی نیت ہے، آنکھیں بند کر کے بھولنے کا ارادہ ہے۔)"

کچھ دیر تک عمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ خاموشی سے ہاتھوں کو کھولتا اور بند کرتا رہا، پھر اس نے حکیم بیگم کی طرف رخ کیے بغیر کہا۔

"میرا یہاں رکنا بے فائدہ ہوگا۔ میں آپا کی دیکھ بھال صحیح طرح سے کر ہی نہیں پاؤں گا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے تیری موجودگی اس کے لیے زیادہ آرام دہ ہوگی۔ مجھ سے کوئی کام کہتے ہوئے وہ یقیناً جھجکے گی۔"

"وہ کوئی عورت نئیں ہے، تیری ماں ہے بیبا!" حکیم بیگم کے لہجے میں ناراضی تھی۔

"بے جی! میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں، کچھ ہی مہینوں کی بات ہے، پھر تو مجھے لوٹ ہی آنا ہے۔"

"تو پرت کے (واپس) نہ آیا تے میں رو، رو کے مر جاؤں گی۔ میری ہاواں نال پنڈ دے سارے رکھ کملا جان گے۔ (میری آہوں سے گاؤں کے سب پیڑ کمہلا

جائیں گے۔)"

اسے حکیم بیگم کی بھیگی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

اس نے جواب میں کوئی تسلی نہیں دی تھی۔ اس وقت اندر پھیلے خلا میں لفظ ڈھونڈنا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔

وہ دونوں اٹھ کر اندر وارڈ میں جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ عمر نے شوکت صاحب کو بینچ کے نزدیک آتے ہوئے دیکھا۔ ذرا دور ٹھہر کر کھڑے کھڑے انہوں نے رسماً" حال احوال دریافت کیا اور عمر کو اپنے ساتھ آنے کو کہا۔

"بیٹا! تم ذرا علیحدگی میں میری بات سن لو گے؟ میں کل رات بھی آیا تھا، مگر تم ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے ہوئے تھے تو ہماری بات نہ ہو سکی۔"

ایک لحظے کی ہچکچاہٹ کے بعد عمر نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر ان کے ہمراہ لان کے ایک کم چہل پہل والے گوشے کی طرف چل پڑا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی اس پر نفرت کا ایسا طاقت ور غلبہ ہوتا تھا کہ خود پر قابو رکھنا کٹھن ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ اپنی فطری نرم دلی اور کچھ حالات کی مسلط کردہ مصلحت کے ہاتھوں بے بس تھا، ورنہ وہ اسے کوئی زک پہنچا کر ہی دم لیتا۔

پرنیاں کے اسپتال آنے کی خبر شوکت صاحب کو یوں ہوئی تھی کہ وہ لگاتار دو، تین دن بغیر اطلاع کے اسکول سے غیر حاضر ہوئی اور ٹیلی فون کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود پرنیاں کے گھر چلے گئے اور وہاں جانے پر ایک پڑوسن کی زبانی معلوم ہوا کہ گزشتہ رات اسے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ بہر کیف اس خبر کا ان تک پہنچنا ایک لحاظ سے اچھا ثابت ہوا تھا۔

اسپتال کی انتظامیہ خودکشی کا معاملہ ہونے کے باعث متعلقہ پولیس اسٹیشن کو مطلع کرنا چاہتی تھی۔ یہ شوکت صاحب ہی تھے جنہوں نے اپنے مراسم کے بل بوتے پر انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ دراصل یہ ہی وہ احساس تھا جس نے عمر کو انہیں برداشت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے لیے عمر کے جذبات جو بھی رہے ہوں مگر حقیقت تھی کہ ان کی کوششوں سے وہ لوگ ایک بڑی الجھن میں پھنسنے سے محفوظ رہے تھے۔

"تمہاری آنٹی کی طبیعت تو خدا کے فضل سے اب بہت اچھی ہے، اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ بہت جلد انہیں اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ خدا انہیں لمبی زندگی دے، میں تو یہ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ انہوں نے آخر ایسا کیا ہی کیوں؟ ڈاکٹر کے پوچھنے پر انہوں نے یہ ہی جواب دیا کہ اپنی کلائیاں انہوں نے خود کاٹی ہیں۔ مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا، کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی اور نے انہیں زخمی کر دیا ہو اور وہ گھبراہٹ میں اس کے بارے میں بتا نہ پا رہی ہوں۔ انہوں نے حقیقت اور تخیل کو گڈمڈ تو نہیں کر دیا؟ ان جیسی معتدل مزاج خاتون سے ایسے عمل کی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔ تمہیں تو ان کے ہاں آئے ہوئے زیادہ سے زیادہ دو سال ہوئے ہوں گے، مگر میں پچھلے چودہ، پندرہ سالوں سے ان سے واقف ہوں۔ انہوں نے آج تک اپنے کسی طالب علم سے بھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ وہ ایسی نفیس اور لائق احترام خاتون ہیں کہ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

شوکت صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو گفتگو میں بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عمر کو ایسے لوگ ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ شوکت صاحب کی باتوں سے اسے سخت چڑ ہو رہی تھی۔

"ویسے تو یہ آپ لوگوں کا گھریلو معاملہ ہے اور اتنا تجسس ظاہر کرنا مجھے زیب نہیں دیتا، پھر بھی میں اصرار کروں گا کہ تمہیں اس بارے میں کچھ بھی معلوم ہو تو مجھ سے مت چھپاؤ۔ بے شک میرا ان سے کوئی خون کا رشتہ نہیں، مگر میں انہیں اپنی سگی بہن کی طرح ہی عزیز جانتا ہوں۔"

عمر کو ان کی زبان سے لفظ سن کر دھچکا لگا تھا۔ بڑے سے بڑا منافق بھی اپنے مفاد میں اس رشتے کی آڑ لیتے ہوئے سو بار سوچتا ہے۔ اس نے شوکت صاحب کے چہرے پر ریاکاری تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں، میں جب گاؤں سے واپس

آیا تو وہ... اس وقت وہ بے ہوش پڑی تھیں۔"

اس نے بدقت خود کو جواب دینے پر مائل کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسی حرکت ان سے کیوں سرزد ہوئی؟ ان سے بتانے کے لیے اصرار کرنا بھی موزوں نہیں' ان کی ذہنی کیفیت ہی ابھی نارمل نہیں ہے۔ زیادہ حیرانی مجھے اس وجہ سے بھی ہے کہ اسلام آباد سے واپسی پر وہ بے حد خوش تھیں' بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے کبھی انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا' پھر یکایک کیا ہو گیا کہ..."

"آپ کی بیوی نے بھی تو خودکشی کی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ اسکول میں آکر آپ سے جھگڑتی تھیں۔ آپ پر چیختی چلاتی تھیں۔ کیا انہیں کوئی ذہنی عارضہ تھا؟"

عمر نے جھجکتے ہوئے انداز میں کہا۔ یہ بات کہنے سے اس کا مقصد شوکت صاحب کو طعنہ دینا نہیں تھا۔ یہ اس کی فطرت میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ تو محض انہیں خاموش کروانے کے لیے یہ چبھتی ہوئی بات کہہ گیا تھا اور اسے اپنے کہے پر فوراً ہی پشیمانی بھی ہوئی تھی۔ "کاش اس نے ضبط کیا ہوتا' کیسی گھٹیا حرکت ہوئی تھی اس سے۔"

"شگفتہ کی بات کر رہے ہو' تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟ تمہاری آنٹی نے بتایا ہوگا' مگر وہ ایسی بے بنیاد بات کیوں کہیں گی' وہ تو شگفتہ کی بابت تمام حقیقت سے واقف ہیں۔ ہاں بیٹا اسے ایک نفسیاتی بیماری تھی' لیکن جانے تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ وہ اسکول میں آکر مجھ سے جھگڑا کرتی تھی۔ وہ ایسا کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ ہماری شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی وہ بیمار پڑ گئی تھی' اسے ڈپریشن کے شدید دورے پڑتے تھے۔ کئی کئی روز وہ کسی سے بات چیت کیے بنا کمرے میں بند ہو کر گزار دیتی۔ شادی سے پہلے ہی سال اس نے چار دفعہ خودکشی کی کوشش کی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی کیفیت میں ایک بدلاؤ آنے لگا۔ اسے اتنا شدید غصہ آنے لگا کہ بعض اوقات اسے اپنے حواس پر قابو ہی نہ رہتا۔ ایسی حالت میں وہ مقابل کو جسمانی نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ہماری گھریلو ملازمہ کے بیٹے کا بازو توڑ دیا۔ کئی بار میری نیند کے دوران اس نے میرا گلا دبایا' میرے منہ پر تکیہ رکھ کر میرا دم گھونٹنے کی کوشش کی۔ ہم نے بہت علاج کروایا' پر اس کے مرض کی مناسب تشخیص ہی نہیں ہو پائی۔ دو' تین سالوں میں اس کی ذہنی ابتری اس حد تک بڑھ گئی کہ اسے گھر میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ بالآخر میرے گھر والوں اور شگفتہ کے ماں' باپ کی باہمی رضامندی سے ایک سائیکاٹرک انسٹی ٹیوٹ میں داخل کر دیا گیا۔ اپنی باقی ماندہ زندگی کے تمام برس اس نے اسی ادارے میں بسر کیے۔"

شوکت صاحب کی وضاحت نے عمر کو مخمصے میں ڈال دیا۔ اسکول میں اس نے دو عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ شوکت صاحب کی بیوی بنا پیشگی اطلاع کے اسکول آگئی تھی اور اچانک پرنسپل آفس کا دروازہ کھول کر پایا اور شوکت صاحب کو اندر جانے کس حال میں دیکھ لیا تھا کہ روتے ہوئے لوٹ گئی تھی۔ اور اس واقعے کے بعد اس نے خودکشی کی تھی۔

"لیکن میں نے سنا تھا کہ وہ اسکول میں آئی تھیں اور کسی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔" اسے اپنی آواز کھوکھلی اور اپنا سوال بودا لگا۔

"تم نے غلط سنا ہے بیٹا' میرے اس اسکول کا چارج لینے سے قبل ہی شگفتہ انسٹی ٹیوٹ کی چار دیواری میں بند ہو گئی تھی اور اپنی موت تک ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے باہر نہیں آئی اور وہ انسٹی ٹیوٹ پاکستان میں بھی نہیں ہے' بلکہ لندن میں ہے۔"

وہ ہکا بکا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے پورے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اچانک ایک عجیب سا خوف اس کے اندر سرایت کرنے لگا۔ جیسے اس نے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہو' لیکن وہ غلطی کیا تھی' اس بارے میں اس کا ذہن واضح نہیں تھا۔ شوکت صاحب کے مسلسل ہلتے ہوئے ہونٹوں نے اسے باور کرایا کہ وہ ان کی باتوں سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ان کی آواز پر کان دھرنے کی کوشش کی۔

"برخوردار! اس قصے کو رہنے دو' باتوں کے دوران اصل بات تو مجھے بھول ہی گئی۔ دراصل میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں' میرے علم میں آیا ہے کہ چند دنوں تک تم امریکہ جا رہے ہو۔"

اس نے گردن کی جنبش سے تصدیق کی۔

"ویسے تمہیں اپنی آنٹی کو اس حال میں چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہیے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تم کچھ عرصہ رک جاؤ۔"

"آپ کسی ضروری کام کا ذکر کر رہے تھے۔" عمر نے ان کا مشورہ نظر انداز کیا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہیں موزوں لگے۔ میں تمہیں فورس تو نہیں کر سکتا' ضروری کام یہ ہے کہ اپنی فلائٹ سے پہلے جب بھی تمہیں وقت میسر ہو' میرے ساتھ وکیل سے ملنے چلو۔"

"وکیل سے ملنے؟ کس لیے؟" اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

شوکت صاحب ذرا سا مسکرائے تھے۔ "وکیل سے کیوں ملا جاتا ہے؟ ظاہر ہے یہ وکیل لوگ قانونی معاملات طے کرتے ہیں تو بس ایسا ہی ایک معاملہ ہے۔"

"میرا تو ایسا کوئی قانونی معاملہ نہیں ہے' آپ کھل کر بتائیے تو۔"

شوکت صاحب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "بہتر ہوتا کہ یہ اچھی خبر تمہیں تمہاری آنٹی کی زبانی سننے کو ملتی' بہرکیف اب حالات ہی اس نوعیت کے ہو گئے ہیں تو کیا کیا جائے۔ تمہاری آنٹی نے ایک مکان خریدا ہے جسے وہ تمہارے نام کر رہی ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ تمہارے امریکہ جانے سے پہلے ہر صورت یہ کام ہو جائے اور انہوں نے کر کے چھوڑا۔ یوں تو کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ انہوں نے تمہیں اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے مالکانہ حقوق مل جائیں' پھر وہ تمہیں خبر دیں گی۔"

شوکت صاحب اسے تفصیل بتانے لگے اور وہ لفظ نہیں تھے' پگھلے ہوئے سیسے کی بوندیں تھیں جو شوکت صاحب ایک تواتر سے اس کے کانوں میں انڈیل رہے تھے۔ اذیت سے بے حال ہوتے ہوئے وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

"تو آپا آپ کی بہن سے ملنے مری گئی تھیں؟"

اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہاں' وہ ثروت کو برف باری دیکھنے کا شوق چرایا تو مری جا کر بیٹھ گئی اور بے چاری تمہاری آنٹی' وہ اتنی مسافت طے کر کے اسلام آباد تک اس کے پیچھے گئی تھیں۔ مجبوراً انہیں مری بھی جانا پڑا۔ تمہیں پتا نہ ہو شاید کہ تمہاری آنٹی برف سے مر جانے کی حد تک خوف کھاتی ہیں۔ مری ان کے ناپسندیدہ ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ وہ کبھی وہاں کا رخ نہ کرتیں' اگر انہیں تمہاری خوشی مقصود نہ ہوتی۔ صرف تمہاری وجہ سے انہوں نے یہ زحمت اٹھائی اور وہاں چند گھنٹے ٹھہرنے سے ہی ان کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں تمام راستہ چھینکتی رہیں' مگر ایکسائٹڈ بہت تھیں کہ عمر یہ خبر سن کر زیادہ خوش ہو گا یا زیادہ حیران اور تم حیران تو ضرور لگ رہے ہو' خوش غالباً ذرا دیر میں ہو گے جب تمہیں اس بات کی سچائی پر ایمان آجائے گا۔"

عمر کو یاد آرہا تھا کہ لوٹتے وقت آپا کی آنکھیں متورم اور ناک سرخ تھی۔ اس نے بتایا بھی تھا کہ وہ مری جا کر بیمار ہو گئی تھی اور اس نے آپا کو بیٹھ کر تھوڑی دیر ستانے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ اس کی باتوں سے آپا کو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ پہلی بار صحیح معنوں میں اسے ادراک ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور اس کے وجود کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ کر دے۔

آپا کے اسلام آباد جانے کے بعد اس نے کیا' کیا نہیں سوچا تھا۔ اس کے مری جانے کی خبر سن کر اس کے تخیل نے کیسی کیسی گندگی آپا کے کردار پر پوتی تھی۔

اسے کیا حق تھا کہ وہ منصف بن کر گناہ گاروں اور معصوموں میں تفریق کرنے لگے۔

اسے کس نے اختیار دیا تھا کہ وہ کسی کو مغضوب قرار دے۔

"گندا' چوہڑا۔" حکیم بیگم کے مارے ہوئے طمانچے کا درد اب اس کے گال کو جلا رہا تھا۔

"لگی ہوئی نوم واسطے گوڈ پھولنا چور دا کم ہے تو چور کیوں بنا۔" (چھپے ہوئے زیور کے لیے میلے چیتھڑوں کو کھنگالنا چور کا کام ہے تو چور کیوں بنا۔)

وہ چور تھا' اسے کھوج لگانے کی لت کہاں سے پڑی تھی؟ وہ معاف کرنے کے ہنر سے کیوں نا آشنا تھا؟

"یہ آپ کا جہنم ہے' جو آپ کے سامنے جل رہا ہے۔"

اپنا کہا ہوا جملہ اس کی سماعت میں گونج رہا تھا۔ کسی کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کرنے کا حق انسان کو کب دیا گیا تھا۔ اللہ کے سوا کون ہے جو یہ تعین کر سکے۔ اس نے زندگی میں بہت سی ذلتوں کا سامنا کیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کبھی ایسی ذلت اور شرمندگی سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

اپنی نظر میں ذلیل ہونے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلت نہیں' کیونکہ خود سے چھپنے کے لیے کوئی اوٹ نہیں ہوتی' کوئی پردہ نہیں ہوتا' سب کچھ ایسا صاف ہوتا ہے جیسے کانچ کی شفاف دیوار کے ایک طرف بیٹھ کر دوسری طرف کا منظر دیکھ رہے ہوں۔

اس کے پاس آپا کے خلاف ثبوت ہی کیا تھے جن کی بنا پر اس نے اتنی رکیک باتیں آپا کی ذات سے منسوب کر دی تھیں۔ اس نے ثبوتوں کو شمار کرنا شروع کیا اور ایک ایک کر کے وہ سارے غیر حقیقی اور خود ساختہ نظر آنے لگے۔

دو ان دیکھی' اجنبی عورتوں کی حسد میں کی ہوئی باتیں کس لحاظ سے معتبر ہو سکتی تھیں۔ ان کی صداقت کو جھٹلانے کے سو دلائل ہو سکتے تھے' مگر تب وہ کسی دیگر خطوط پر سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شک کو اپنا رہنما بنایا تھا۔

شک' جو محدب عدسے کی طرح کام کرتا ہے' جو ایک معمولی چیونٹی کو بھی بھیانک مخلوق بنا کر دکھا سکتا ہے۔

اس نے شک کے سنگریزوں سے جو دیوار اساری تھی' حقیقت کے ایک ہی دھکے سے زمین بوس ہو گئی تھی اور وہ خود اس کے بوجھ تلے دب گیا تھا' اس کی سانسوں میں ریت اڑ رہی تھی۔ وہ گردو پیش سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ اندر کی آوازوں کا شور اتنا بلند تھا کہ باہر کا شور معدوم ہو گیا تھا۔ وہ گویا بہرہ ہو گیا تھا۔ شوکت صاحب نے اس کا کندھا تھام کر ہلایا تو وہ یوں چونک گیا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔

"برخوردار! تم تو یوں کھو گئے جیسے میں نے تمہیں سات مرلے کے مکان کی ملکیت کی خبر نہ سنائی ہو' بلکہ بکنگھم پیلس کی چابیاں تمہارے حوالے کر دی ہوں۔"

عمر ساکن پلکوں سے انہیں ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔

"تو کل شام چھ بجے کا وقت مناسب رہے گا وکیل صاحب سے ملاقات کے لیے؟ تیار رہنا' میں کل شام کو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا' کوئی لمبا چوڑا کام نہیں ہے۔ بس ایک دو گھنٹوں کی فرصت کافی ہو گی۔"

وہ چپ چاپ کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا۔

شوکت صاحب اس کی خاموشی کو اقرار سے تعبیر کرتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ "میں ذرا تمہاری آنٹی کو دیکھ آؤں' تم سے ان شاء اللہ کل دوبارہ ملاقات ہو گی۔"

وہ شبنم آلود گھاس پر آنکھیں گاڑے کتنی ہی دیر وہیں رکا رہا۔ حکیم بیگم کی آواز پر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔

"کاکا! نرس بلانے آئی تھی تجھے۔ اندر جا کے ڈاکٹر دی گل سن آ' تے اس نوں پچھ (پوچھ) لے کہ تیری ماں دے کھان واسطے کیہڑی (کون سی) شے ٹھیک رہے گی۔"

(اندر جا کر ڈاکٹر کی بات سن لے اور اس سے پوچھ بھی لینا تیری ماں کو کھانے کے لیے کیا چیز ٹھیک رہے گی۔)

عمر نے تھوک نگلتے ہوئے گلا تر کیا اور فرو ترین آواز میں بولا۔

"بے جی! دعا کر کہ میں نے جو غلط کر دیا ہے' وہ صحیح

ہو جائے' دعا مانگ کہ مجھے سکون مل جائے۔ اللہ سے کہہ کہ وہ مجھے سکون دے دے' اس سے میرے لیے مانگ' اس سے کہہ دے کہ مجھے کھوجی نہیں بننا' مجھے چور نہیں بننا' مجھے ظالم بھی نہیں بننا' مجھے رحم کرنے والا بننا ہے' مجھے معاف کرنے والا بننا ہے' مجھے شکر کرنے والا بننا ہے۔"

✡ ✡ ✡

جہاز کے سفر میں اس کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ زیادہ وقت وہ آمنہ اور یوسف کی نومولود بیٹی بارینہ کے متعلق سوچتا رہا۔ ان دونوں نے اتنے برسوں میں اولاد پانے کی غرض سے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے تھے اور بالآخر اللہ نے ان کی آس پوری بھی کر دی تھی' مگر پیدا ہونے والی بچی' قبل از وقت پیدائش سے جڑی کئی بیماریوں میں مبتلا تھی۔

پیدائش کے وقت سے ہی ایک بے حد مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں این آئی سی یو کے نامور ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے تھے اور اب تک بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ دن بدن اس کی زندگی کی امید کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔ سب دنیاوی وسائل ہوتے ہوئے بھی تقدیر کے مقابل انسان کی ازلی بے بسی سے کوئی مفر نہیں تھا۔

وہ بچی آمنہ اور یوسف کی زندگی میں ایک انقلاب لے کر آئی تھی۔ وہ چلی جاتی تو بھی ایک انقلاب برپا کر جاتی' البتہ دونوں تبدیلیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

پچھلے کچھ ماہ میں جب بھی اس کی ان دونوں میاں بیوی سے بات ہوئی' وہ ایک عجیب ہیجان کے زیر اثر محسوس ہوئے۔ شادی کے بیس سال بعد پہلی دفعہ اولاد کی آمد کی امید بندھنے پر شاید دنیا کا کوئی بھی جوڑا ایسے ہی ہیجان میں گرفتار ہو جاتا۔ آمنہ اور یوسف جو عام طور پر سنجیدہ اور بردبار قسم کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے' ان دنوں چھوٹے بچوں کی مانند جذباتی اور ہنسوڑ ہو گئے تھے۔ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے معمولی

معمولی باتوں پر وہ اس قدر ہنستے کہ کئی مرتبہ عمر کو انہیں ٹوکنا پڑتا۔

یوسف اسے متوقع اولاد کے لیے اپنے منصوبوں سے آگاہ کرتا رہتا کہ بیٹی ہوئی تو اسے یہ بناؤں گا' بیٹا ہوا تو اسے وہ بناؤں گا اور فون کے اختتام تک وہ دس بار ان چنے ہوئے پیشوں میں تبدیلی کرتا۔ ہر فون کال میں اس کے منصوبوں میں ترمیم جاری رہتی۔ آمنہ کے پاس بتانے کو اپنے ہی بیسیوں موضوعات تھے۔ وہ اسے نرسری کی آرائش اتنی باریکیوں سے سمجھاتی کہ وہ عاجز آ جاتا۔ بچے کے لیے کی جانے والی خریداری کی تفصیلات سنتے سنتے اس کا سر دکھنے لگتا۔

آمنہ نے کچھ ایسے کھلونے بھی ابھی سے خرید لیے تھے جنہیں چار' پانچ سال سے کم عمر کے بچے استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے' اس کی فون کالز اتنی طویل ہوتیں کہ بعض اوقات عمر کو منت کر کے فون بند کروانا پڑتا۔ جب اس کے خیال میں گفتگو کا اختتام آ جاتا تو آمنہ کو کوئی نئی بات یاد آ جاتی اور کال کی طوالت بڑھ جاتی۔

اور حکیم بیگم کی خوشی بھی تو دیدنی تھی۔ اس کی دعاؤں کو قبولیت ملی تھی۔ اللہ نے اس کی عرضی منظور کر لی تھی۔ اس جوش و خروش کو زوال تب آیا تھا جب آمنہ کی گائنا کولوجسٹ نے بچی کی صحت کے بارے میں تشویش ناک باتیں کرنا شروع کیں' یوں جیسے تیار شدہ لذیذ پکوان میں راکھ اڑ کر پڑ گئی ہو۔

ایئرپورٹ پر آمنہ اور یوسف میں سے کوئی بھی اسے لینے نہیں آیا تھا۔ یوسف کے ایک کولیگ نے عمر کے نام کا کارڈ اٹھا رکھا تھا جسے دیکھ کر عمر اس کے قریب چلا آیا اور اپنا تعارف کروایا۔ ایئرپورٹ سے آمنہ اور یوسف کے گھر تک کم و بیش ایک گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ یوسف گھر پر ہی موجود تھا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے عمر کو خوش آمدید کہا تھا۔

"سوری عمر! میں تمہیں ریسیو کرنے ایئرپورٹ نہیں آ سکا۔ بس میرے سر میں بہت درد تھا۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟ اور تمہارا سفر آرام دہ رہا نا؟" اس نے

رسما" معذرت کی تھی۔

"نہیں۔ برا کیوں لگے گا؟ آپ اپنے دوست کو نہ بھی بھجواتے تو میں ٹیکسی لے کر خود آسکتا تھا۔ آپ نے خوامخواہ زحمت کی۔" عمر کو اپنی اہمیت جتانے کا شوق کبھی نہیں رہا تھا اور موجودہ حالات میں تو تکلفات جیسی چیزوں کی توقع رکھنے کو وہ بے حسی تصور کرتا تھا۔

"آمنہ باجی کہاں ہیں؟" یوسف کی تقلید میں سٹنگ روم میں آتے ہوئے عمر نے سوال کیا۔

"وہ اسپتال میں ہے' وہ دن کا زیادہ حصہ وہیں پر ہوتی ہے۔"

"تو پھر ہم بھی اسپتال چلتے ہیں۔ میں بارینہ کو دیکھ لوں گا اور آمنہ باجی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔" عمر نے اپنا سوٹ کیس دیوار کے سہارے ٹکاتے ہوئے مڑ کر یوسف سے کہا۔

"نہیں۔ تم تھکے ہوئے ہو گے' تھوڑی دیر آرام کر لو' میں شام کو تمہیں لے چلوں گا۔ میڈ دو دن سے نہیں آ رہی تو تمہارے لیے گیسٹ روم کی صفائی بھی نہیں ہو سکی۔ فی الحال تم اسی کمرے میں رہو' یہ واش روم ہے۔"

اس نے داہنی دیوار میں نصب دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"بھوک لگ رہی ہے تو بتاؤ' میں تمہارے لیے کوئی چیز بنا لاتا ہوں۔"

"ابھی اس کی ضرورت نہیں' میں نے فلائٹ میں کچھ کھا لیا تھا۔"

"تو ٹھیک ہے تم ریسٹ کرو' اس کمرے سے باہر نکلو گے تو کوریڈور میں پہلا دروازہ کچن کا ہے۔ تمہیں جب بھی کھانے پینے کو کچھ چاہیے ہو تو جھجکے بغیر لے لینا۔ میک یور سیلف ایٹ ہوم۔"

اس نے نہا کر کپڑے بدلے۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر ظہر کی نماز ادا کی' پھر سونے کی نیت سے کاؤچ پر لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تھا' لیکن نیند نہیں آئی' بارینہ کو دیکھنے کے تصور سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ آمنہ کے سامنے آنے سے قبل وہ ذہن میں ان الفاظ کو مرتب کر رہا تھا جو اس موقع پر اسے آمنہ سے کہنے تھے۔ بہت سوچنے کے باوجود اسے کوئی ایک موزوں تشفی آمیز جملہ بھی نہیں مل سکا۔ حکیم بیگم نے بارینہ کے حوالے سے جو کام اسے سونپا تھا اسے پورا کرنا بھی ایک مسئلہ تھا' اسے خدشہ تھا کہ آمنہ کو اس پر اعتراض ہو گا' وہ شش و پنج میں تھا کہ کیسے اسے قائل کرے گا۔ دراصل اسے رخصت کرتے ہوئے حکیم بیگم نے کانچ کی ایک چھوٹی سی بوتل اس کے سپرد کی تھی' جس میں سادہ پانی بھرا ہوا تھا۔

"کاکا! لکھ درداں دی اک دوا ہے اللہ۔" (لاکھوں دردوں کی اک دوا ہے اللہ)

کوئی بیماری' کوئی روگ ایسا نہیں جس کو وہ قدرتاں والا ٹال نہ سکے۔ اس پانی تے میں نے ان گنت واری (بے شمار دفعہ) اللہ دا ناں پڑھ دیا ہے۔ جنی وی (جتنی بھی) میری اوقات تھی' بسم اللہ پڑھ کے اس کا اک قطرہ میری دو ہتری (نواسی) کو پلا دے جا کے۔ شفا ہو گی تے یقین پکا کر کے شک نہ کرنا اس وی رحمت وچ۔ ڈاکٹر تے یقین ہوتے فیر ہی دوا شفا دیتی ہے۔ آمنہ بڑی دسواسن (وہمی) ہے۔ وہ سوجھتاں کرے گی' کہے گی کہ حکیم بیگم کو تھری (صفائی سے بے بہرہ) ہے۔ اس کو ذرا اتھاں دا پتا نئیں۔ تو بتا دینا کہ میں نے گیس والے چولہے تے پانی کو ابالا دے دیا ہے۔ بوتل بھی نویں ستھری ہے' کوئی وہم نہ کرے۔ میں پینڈو (دیہاتی) ہوں' پر کملی (پاگل) نیئں۔ جا میرا پتر تے تجھے خیر کی خبر پہنچا۔" عمر نے ہامی تو بھر لی تھی' مگر یہاں آنے کے بعد آمنہ کی متوقع مخالفت کا سوچ کر وہ متذبذب ہو گیا تھا۔

کروٹیں بدلتے بدلتے عصر کی نماز کا وقت ہو گیا اور اس پر ذرا سی غنودگی بھی نہ چھائی' اس نے اٹھ کر نماز پڑھی' کچن میں جا کر ایک گلاس دودھ کے ساتھ دو توس سینک کر کھا لیے اور یوسف کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سات بجے کے قریب اپنے بیڈ روم سے تیار ہو کر نکلا تھا۔ عمر پہلے سے ہی تیار تھا۔ وہ دونوں اسپتال چلے گئے۔ رت جگوں کی ماری ہوئی' ستے ہوئے چہرے والی آمنہ اسے دیکھ کر تھکن گزیدہ آواز میں بولی۔

"تم آج آنے والے تھے' جانے کیوں ذہن سے محو ہو گیا۔ آج کل کسی شے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ تم ٹھیک ہو؟ بے جی اور تمہاری امی کیسی ہیں؟"

جوابا" عمر نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"بارینہ کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"آؤ! میں تمہیں لے چلتی ہوں۔" آمنہ نے مڑتے ہوئے کہا تھا۔

یوسف ان کے ساتھ جانے کے بجائے وہیں ٹھہر گیا تھا۔

"یوسف اتنا بزدل ہے کہ حد نہیں۔ بارینہ کو دیکھنے سے ڈرتا ہے۔ اسپتال آ بھی جائے تو کونوں کھدروں میں چھپتا پھرتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اگر میری آنکھوں کے سامنے وہ مر گئی تو ساری زندگی یہ منظر مجھے haunt کرتا رہے گا۔ مجھے غصہ آنے لگتا ہے اس پر۔ کوئی مرد اتنا کم حوصلہ بھی ہوتا ہے۔" اس کے ساتھ چلتے ہوئے آمنہ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

انہیں بارینہ کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چند فٹ کی دوری پر رک کر ایک کانچ کے دروازے سے وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ عمر نے کبھی بارینہ جتنا کم وزن بچہ نہیں دیکھا تھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کی لمبائی بمشکل بارہ انچ تھی۔ اس کی کھال اتنی باریک تھی کہ اس کے جسم کی ساری ہڈیاں بغیر کسی دقت کے گنی جا سکتی تھیں۔ اس کے بدن پر بے شمار ابھری ہوئی نسیں تھیں جو تیزی سے دھڑک رہی تھیں۔

"میں گھنٹوں یہاں کھڑی اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ اس ڈر سے کہیں جاتی نہیں کہ میرے جانے کے بعد وہ مر نہ جائے۔ بے وقوفی ہے میری' میرے رکنے سے بھی کب وہ زندہ رہے گی۔ پر میں کیا کروں' مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے ایک لمحے کی بھی چوک ہو گئی تو میں دوبارہ اسے دیکھ نہیں پاؤں گی' یوسف کہتا ہے میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میں کیوں پاگل نہیں ہوں گی؟ کئی سالوں سے ہم نے طے کر رکھا تھا کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام اسد اور بیٹی ہوئی تو بارینہ نام رکھیں گے۔ بارینہ آرش نام ہے۔ اس کا مطلب ہے پہاڑی کی چوٹی۔ کتنی مضبوط' اونچی اور شان دار ہوتی ہے پہاڑی کی چوٹی' میری بیٹی کو دیکھو یہ کتنی لاچار اور حقیر ہے' پھر بھی میں نے اس کا نام بارینہ رکھا ہے۔ یہ نہ رہی تو میں کسے بارینہ کہوں گی۔ اسے کچھ ہو گیا تو زندگی کا کیا کروں گی میں؟"

وہ گویا دیوانگی کے عالم میں خود کلامی کر رہی تھی۔ اس کا لباس شکن آلود اور بال الجھے ہوئے تھے۔ گہرے سانولے چہرے پر زردیاں کھنڈی تھیں۔ جانے کتنے دنوں سے وہ نہانے اور لباس تبدیل کرنے جیسی ضرورتوں سے کنارہ کش تھی۔ عمر کو اس پر ترس آیا۔ اسے الفاظ ڈھونڈنے میں سخت ناکامی ہو رہی تھی۔ زندگی ہر گام پر ایسے مشکل سوال پیش کرتی ہے کہ عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔

"آپ اتنی مایوس نہ ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ہمت کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"مایوس نہ ہوں؟" وہ تڑخ کر بولی۔ "کبھی ڈاکٹر کہتے ہیں یہ دو دن مزید جیے گی' کبھی وہ ایک دن کی مہلت بڑھا دیتے ہیں۔ کل صبح پورے بیس سیکنڈز تک اس نے سانس نہیں لیا۔ میں موت کے پروں کی سرسراہٹ کو اس اسپتال کے کوریڈورز میں سنتی ہوں۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھی مجھ پر ہنستی ہے۔ وہ مجھ سے بارینہ کو چھیننے آئی ہے اور میں اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ امید تو کہیں ہے ہی نہیں۔ میں ایک ناموجود شے کو کیسے پکڑوں؟"

"اللہ کوئی راہ نکالے گا۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔" اس نے پھر آمنہ کو دلاسا دینا چاہا۔

"اللہ آسمان پر ہے اور ہم زمین پر رہتے ہیں۔ زمین اور آسمان کے بیچ کتنا فاصلہ ہے' کوئی اندازہ ہے تمہیں؟"

عمر کو اس کی بات سے دکھ ہوا۔ "آپ کو دعا مانگنی چاہیے' اس سے بے چینی کم ہو جاتی ہے۔ بے جی ہر وقت بارینہ کی زندگی کی دعا کرتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ..."

اسے حکیم بیگم کا سونپا ہوا کام یاد آیا تو اس نے اوپر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کانچ کی چھوٹی سی بوتل کو گرفت میں لے لیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں بے جی؟" آمنہ نے قدرے تلخی سے کہا۔ "ان کے پاس کہنے کو ہے ہی کیا؟ فون پر مجبور کر رہی تھیں کہ میں ان کا دم کیا ہوا پانی بارینہ کو پلاؤں، میں نے جواب دیا کہ میں ایسی چیزوں پر یقین نہیں کرتی تو انہوں نے اس قدر بحث کی کہ تنگ آکر میں نے کال کاٹ دی۔ انہیں کوئی کیسے سمجھائے کہ بارینہ کی ایک ایک دھڑکن اور ایک ایک سانس جدید آلات کے ذریعے مانیٹر کی جاتی ہے۔ یہاں ان کے دم کیے ہوئے پانی کی کوئی گنجائش نہیں۔

Her ignorance is all - she knows she is an old naive village woman

(اپنی جہالت کے سوا وہ کوئی علم نہیں رکھتیں۔ وہ ایک بوڑھی، سادہ لوح دیہاتی عورت ہیں۔)"

حکیم بیگم کے بارے میں کہے گئے ان حقارت بھرے الفاظ نے عمر کو بہت تکلیف دی۔ آمنہ کو شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

She may be naive but she is not ignorant

(وہ سادہ لوح ہو سکتی ہے، مگر وہ جاہل نہیں ہے۔)

آمنہ نے کوئی دھیان نہیں دیا اور بولتی رہی۔ "وہ کسی طور اپنی ضد سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہی نہیں تھیں، کہنے لگیں کہ عمر کے ہاتھ وہ پانی تمہیں بھجوا دوں گی۔ اور وہ پانی اتنا کراماتی ہے کہ اس سے سر درد سے لے کر کینسر تک ہر قسم کی بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔"

جیب کے اندر بوتل پر جما ہوا عمر کا ہاتھ پسینے سے بھیگنے لگا تھا۔

"بھلا بتاؤ، اس دور میں بھی اتنی جہالت کا مظاہرہ ممکن ہے۔ بے جی کی باتیں سن کر بسا اوقات مجھے لگتا ہے کہ وہ اسٹون ایج میں رہتی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس جہالت پر فخر بھی کرتی ہیں۔"

ہتھیلی میں نمی کے سبب بوتل اس کے ہاتھ سے پھسل رہی تھی۔

"شکر ہے کہ بے جی تمہیں اپنے جیسا بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔" "تمہیں دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ پیدائش سے لے کر جوانی تک تم ایک پسماندہ گاؤں میں رہے ہو۔ تم بھی میری طرح ہو، مجھے تم پر فخر ہے عمر۔

I see a great deal of myself

(مجھے تم میں اپنا پرتو دکھائی دیتا ہے۔)"

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس تعریف پر خوش ہونا چاہیے یا شرمسار۔

"تم نے امریکہ آنے کا فیصلہ کر کے گویا اپنی تقدیر بدل ڈالی ہے۔ بے جی کے پاس تمہیں دینے کے لیے دقیانوسی نظریات سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے، مجھے یقین ہے، دم والے پانی کی بات سن کر تمہیں بھی اتنا ہی غصہ آیا ہو گا جتنا مجھے آیا تھا۔"

اس نے بوتل پر سے انگلیاں ہٹاتے ہوئے آہستگی سے ہاتھ کو جیب سے باہر نکال لیا۔ اگلی صبح اسے بیدار ہوئے کچھ لمحے ہی بیتے ہوں گے کہ یوسف سٹنگ روم میں داخل ہوا۔

"میں اسپتال جا رہا ہوں، اگر تمہیں بھی جانا ہے تو جلدی تیار ہو جاؤ۔ میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" عجلت میں کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

مقدور بھر پھرتی سے لباس تبدیل کر کے عمر باہر آیا۔ یوسف کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس جل رہی تھیں۔ آسمان پر ستارے ابھی بجھے نہ تھے۔ اس کے دل میں کھدبد سی ہونے لگی۔ اس وقت انہیں اسپتال جانے کی کیا مجبوری تھی؟ دعا مانگتے ہوئے تیز قدموں سے چل کر وہ کار میں بیٹھ گیا۔

لکڑی کا پھاٹک پار کر کے جب کار سڑک پر آگئی تو یوسف نے کسی جذبے سے عاری آواز میں کہا۔

"بارینہ مر گئی ہے۔"

☼ ☼ ☼

جب یوسف حکیم بیگم کو بارینہ کی موت کی خبر دے چکا تو اس نے عمر سے بات کرنے کو کہا تھا۔ یوسف کے ہاتھ سے ریسیور لیتے ہوئے خدا جانے کیوں اس پر بدحواسی چھا رہی تھی۔ ان مانے جی سے اس نے سلام کیا۔

"بے جی! جو ہونا ہوتا ہے، وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ تو بے حوصلہ نہ ہونا۔ جس کے بس میں جو تھا، وہ اس نے کر دیا، لیکن اللہ کی رضا تو ماننا پڑتی ہے۔"

دوسری جانب بوجھل خاموشی تھی۔ غالباً وہ رو رہی تھیں، مگر عمر کو اس کے رونے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ممکن تھا اس نے ہاتھ پیس اپنے منہ سے دور ہٹا دیا ہو۔ بہت دیر بعد حکیم بیگم نے ایک مختصر جملہ کہا جو عمر کو کسی چابک کی طرح لگا۔ وہ حیرت سے گنگ ہو گیا تھا۔ حکیم بیگم نے کہا تھا۔

"تو نے شک کیا تا پتیا!"

وہ یہ کیسے کہہ سکتی تھی۔ وہ کیسے جانتی تھی کہ اس بار بھی وہ یقین کے امتحان میں ناکام رہا تھا۔ کیا حکیم بیگم کا یقین اتنا اٹل تھا کہ وہ بارینہ کے مرنے کی کوئی دوسری وجہ قبول کرنے پر تیار ہی نہیں تھی۔ پوچھے بغیر بنا ہی اس نے جان لیا تھا کہ عمر سے لغزش ہو گئی تھی۔ وہ منوں وزنی سل کے نیچے پسا جا رہا تھا۔

"پر بے جی! مہلت کتنی ہو گی یہ تو اس نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے۔ اللہ ہی موت کو بھیجتا ہے اور اللہ نے ہی اس کا وقت طے کر رکھا ہے۔ موت کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔"

"تو اللہ دی گل کرتا ہے تے فیر نئیں، وی کہتا ہے اللہ اگے نئیں۔ (تو اللہ کی بات کرتا ہے اور نہیں بھی کہتا ہے اللہ کے آگے نہیں کا کیا کام۔) یہ نئیں، تیرے میرے لیے ہے، تجھے تو بس یقین کرنا تھا، تجھ سے وہ بھی نہ ہوا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر وہ حکیم بیگم اور اپنے یقین کا موازنہ کرنے لگا۔ حکیم بیگم نے جب بھی اللہ سے کچھ مانگا تھا، کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا ناممکن جبکہ وہ خود ہمیشہ اسی حساب کتاب میں الجھا رہتا تھا۔ اللہ سے وہ چیز کیوں مانگی جائے جو ہو ہی نہ سکتی ہو۔ وہ کبھی بھی ممکن اور ناممکن کے پھیر سے آزاد نہیں ہو پایا تھا۔

"میرا یقین آدھا ادھورا کیوں ہے؟ وسوسوں کا ڈسا ہوا، راہ بھٹکا ہوا، سوتا جاگتا، میں نظر کے فریب میں کیوں آجاتا ہوں؟ نظر آسمان تک دیکھ سکتی ہے، لیکن آسمان پر کائنات ختم نہیں ہوتی، کوئی حد ہے تو میری نظر کی ہے۔ کائنات کی کوئی حد نہیں، جو میری آنکھ سے اوجھل ہے وہ غیر موجود نہیں اور جو مجھے نظر آتا ہے وہ کل نہیں۔ جہاں اوجھل اور ظاہر ملتے ہیں، جہاں وجود اور عدم میں دوئی مٹتی ہے، جہاں کل اور جزو ہم آغوش ہوتے ہیں، اس سرحد کو پار کرنے سے ہی بات بنتی ہے، بندھن وہیں ٹوٹتے ہیں، آزادی وہیں ہے۔"

بارینہ کے مرنے کے بعد کئی راتوں تک وہ پرسکون نیند نہیں سو سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے مکان کی تختی پر کندہ الفاظ کو غور سے دیکھا، پھر جیب سے خط کا لفافہ نکال کر اس پہ لکھا ہوا پتا پڑھا اور مطمئن ہو گیا، یہ مکان ڈھونڈنے میں اسے کافی مشکلات کا سامنا ہوا تھا، کیونکہ اتنے برسوں میں بے تحاشا نئی تعمیرات ہوئی تھیں۔ کچھ نئی سڑکیں وجود میں آگئی تھیں۔ بلاکس کی حد بندی میں ردوبدل ہوا تھا۔ لہٰذا یہاں تک پہنچنے میں اسے خاصا تردد کرنا پڑا تھا۔ اطلاعی گھنٹی کا جواب دینے ایک ادھیڑ عمر کا کیشین (caucasian) مرد آیا تھا۔ دروازے سے باہر آکر وہ اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ عمر نے دو قدم آگے آتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

"یہاں مسٹر داؤد رہتے ہیں، مجھے ان سے ملنا ہے۔"

اس آدمی کا سر نفی میں ہلنے لگا۔ "یہ نہیں تھا، وہ

رہتا تھا' یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے۔"
عمر کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔
"تو کیا مجھے ان کا نیا پتا مل سکتا ہے؟" "تمہیں یقیناً" معلوم ہو گا کہ اب ان کی رہائش گاہ کہاں ہے۔ دیکھو میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے' میں انہیں تلاش نہ کر سکا تو ایک بے حد اہم کام ہونے سے رہ جائے گا۔ انسانیت کے ناتے تم میری مدد کرو۔" اس نے منت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

"میرا اس سے کوئی ذاتی تعلق تو نہیں ہے' میں نے یہ گھر ایجنٹ کے ذریعے خریدا تھا' البتہ میں ایک' دوبار اس سے ملا ضرور ہوں۔"

"پھر میں ان سے کیسے ملوں؟ کیا رابطہ ہو سکتا ہے؟"

اس کے مخاطب نے شانے اچکا دیے۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" وہ پلٹ کر اندر چلا گیا تو عمر بے بسی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔

"ذرا رکو نوجوان۔" عقب میں آواز سن کر وہ دوبارہ مڑا تھا۔

"میں بھی ابھی ایک بات مجھے یاد آئی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ مکان کے attic میں جو اخروٹ کی لکڑی کا صندوقچہ پڑا ہے' وہ بعد میں کبھی آکر لے جائے گا' کیونکہ ٹرک میں اسے رکھنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ اب تک وہ اسے لینے نہیں آیا' لیکن اس کے رابطہ کرنے کا امکان تو ہے' ایسی صورت میں اسے تمہارا پیغام میں دے دوں گا' تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

"محمد عمر پاکستان سے۔" اس نے شکریہ ادا کیا اور اپنا رابطہ نمبر دیتے ہوئے ایک مختصر سا پیغام بھی لکھوا دیا۔

"میں پرنیاں آئزک کا بیٹا ہوں' اگر یہ نام آپ کے نزدیک کوئی معنی رکھتا ہے تو جتنا جلدی ہو سکے' مجھ سے رابطہ کیجئے۔"

اس گھر کا پتا اس خط میں درج تھا جو اسے پرنیاں کے ٹرنک سے ملا تھا۔ خط کے متن سے صاف ظاہر تھا کہ داؤد یا تو پرنیاں کا رشتہ دار تھا یا کم از کم اس کے گھر والوں کو جانتا تھا۔ داؤد کو تلاش کرنے سے اس کا مقصد محض اتنا تھا کہ اس کے ذریعے پرنیاں کے گھر والوں کا سراغ پا سکے۔ اپنے اصل سے کٹ کر جیتے ہوئے آپا کو ایک عمر بیت گئی تھی۔ وہ کب سے تنہائی کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اسے اب اس قید سے نجات ملنی چاہیے تھی۔ آپا کی خاطر وہ اتنا تو کر ہی سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے عکس پر نظریں جمائے ہوئے صوفیہ دیوار کے قریب سے آئینے کی سیدھ میں چل کر آئی۔ آئینے کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے اسٹول پر بکھری سنگھار کی مختلف اشیاء میں سے ایک سرخ لپ اسٹک منتخب کر کے احتیاط سے ہونٹوں پر لگائی اور ہونٹوں کو آپس میں ملا کر دباتے ہوئے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے آئینے کی طرف کمر کر دی اور گردن گھما کر پشت سے خود کو دیکھنے لگی۔ اس نے سفید ٹیوب ٹاپ کے ساتھ سرخ رنگ کا ٹراؤزر پہن رکھا تھا اس کے پیروں میں اس کے سرخ stiletto ہوتے تھے' اس کا سراپا اتنا فسوں خیز لگ رہا تھا کہ کوئی مرد اسے آنکھ بھر کر دیکھ لیتا تو اسے نظر پھیرنے کی جرات نہ ہوتی۔ خواہ وہ مرد کیسا ہی خشک مزاج اور پتھر دل کیوں نہ ہوتا اور وہ یہ ہی چاہتی تھی کہ مردوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکیں' اس کی بے اعتنائی پر تھم جائیں۔

یہ اہتمام اس نے مردوں کے لیے ہی کیا تھا۔ آج وہ خود کو دنیا کے مردوں کے سامنے پیش کرنے جا رہی تھی۔

کارل میکار تھی کا نام اس نے cops سے کیوں مخفی رکھا تھا' یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اسے زبان سے محض چند الفاظ ادا کرنے پڑتے اور کارل لمبے عرصے کے لیے جیل چلا جاتا۔ لیکن صوفیہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اسے معاف کرنا نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی معاف نہیں کی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ کارل سے بدلہ لینے پر خود کو آمادہ نہ کر پائی۔ اس کے اندر جیسے کسی جذبے کی موت ہو گئی تھی۔ غصہ اٹھا ہی نہیں' خون ابلا ہی نہیں' گویا جائے کی بھاپ اڑاتی پیالی میں کسی نے برف کی ڈلی پھینک دی ہو۔ کارل زندہ رہتا یا مر جاتا' دونوں باتیں یکساں طور پر غیر اہم تھیں۔

کارل کے ہاتھوں زخمی ہو کر ہاسٹل جانے کے بعد گرانٹ چند دنوں کے لیے گھر آیا تھا۔ پھر دوبارہ اسپتال گیا تو اس کی واپسی نہیں ہوئی۔ تنہا ہوتے ہی صوفیہ نے اسی بزا پارلر میں جاب شروع کر دی تھی۔ جس کا بروشر دکھا کر اس نے گرانٹ سے وہاں کام کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور جواب میں بے لچک انکار سنا تھا۔ پارلر میں روزانہ اس کا بھانت بھانت کے مردوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں سے اپنے لیے کسٹمرز تلاش کرنا ذرا بھی دشوار نہ تھا۔ لیکن وہ ایک وقت میں ایک ہی پیشہ اپنانے کے اصول پر عمل پیرا تھی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایک سے زائد سمتوں میں منقسم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ مرد کسٹمرز کے معنی خیز فقروں اور کنایوں سے محظوظ ہوتی تھی۔ ایک' دو نے اسے ڈیٹ پر جانے کی دعوت بھی دے ڈالی تھی۔ ایسی دعوتیں قبول کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنی آئندہ زندگی کا جو نقشہ تصور کیا تھا اس میں ان مردوں کی کوئی جگہ نہیں تھی جو قیمت ادا کیے بغیر اس سے کسی مہربانی کی توقع کرتے' اس کی ترجیحات قدرے مختلف تھیں۔

اسے بزا پارلر کی ملازمت کرتے تقریباً" تین ماہ گزر چکے تھے اور اب وہ اس معمول میں زیادہ کشش نہیں پاتی تھی' پھر اسے گرانٹ کی صحت کا تیز انحطاط بھی تشویش میں ڈال رہا تھا۔ وہ مزید تاخیر کرتی تو ممکن تھا کہ گرانٹ ایک دردناک اذیت سے روشناس ہوئے بغیر ہی دنیا سے چلا جاتا اور گرانٹ کو اس تکلیف سے محروم رکھنا اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے آج رات ہی یہ فریضہ انجام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ طویل مدت سے جس کی منتظر تھی' اس وقت کی آمد پر اس کا گھبرانا ایک فطری امر تھا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور چھوٹے چھوٹے کش لینے لگی۔

باہر گہرا ہوتا ہوا اندھیرا اعلان کر رہا تھا کہ اب جانے کا وقت آپہنچا تھا۔ اصل کام پر کمربستہ ہونے سے قبل اسے گرانٹ سے ملنے اسپتال بھی جانا تھا یا غالباً" گرانٹ سے ملنا ہی اصل کام تھا۔

سگریٹ کا جلتا ہوا سرا اس کی انگلیوں کے قریب آگیا تھا۔ بائیں ابرو کے کنارے سے باہر پھیلی ہوئی آئی پنسل کی مدھم سیاہی کو انگلی سے مسل کر صاف کرتے ہوئے اس نے آخری کش کھینچا اور دھوئیں کا مرغولہ آئینے کی سطح پر اچھال دیا۔ لمحاتی طور پر اس کا عکس یوں دکھائی دیا تھا جیسے وہ دھوئیں میں لپٹی ہوئی جل رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

صوفیہ نے شروع سے خود کو دو نیم پاگل افراد میں گھرا ہوا پایا۔ گرانٹ اور البا جو اس کے ماں' باپ تھے ایک گھر میں اکٹھے کیوں رہتے تھے' یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن طلوع ہوا ہو جب البا گرانٹ کے ہاتھوں مار کھانے سے محفوظ رہی ہو۔

وہ اسے اتنی بے دردی سے مارتا جیسے کسی پتھر یا لکڑی کو مار رہا ہو۔ اس کے باوجود البا نے کبھی گھر چھوڑنے یا گرانٹ کو گھر سے نکالنے کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب صوفیہ نے اس سے سوال کیا کہ وہ گرانٹ سے الگ کیوں نہیں ہو جاتی تو اس نے کراہتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں کیا پتا کہ محبت کتنی بڑی لعنت ہے۔ دنیا کی کوئی تکلیف اس تکلیف کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو مجھے گرانٹ کو نہ دیکھنے سے ہوتی ہے۔ کوکین کی بڑی سے بڑی ڈوز بھی وہ سرور پیدا نہیں کرتی جو اس کی قربت سے پیدا ہوتا ہے۔"

صوفیہ کو اس کی یہ توجیہہ سن کر اس پر طیش آیا تھا۔ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان ایسی باتیں کر سکتا تھا۔

ان کے گھر کے بیرونی دروازے کے اوپر پھیلے ہوئے سائبان پر سرخ اور سنہری روغن سے گرانٹ اور البا کا Love nest لکھا تھا۔ اسے ان الفاظ سے اتنی چڑ تھی کہ آتے جاتے اس کی نظر ان پر پڑتی تو اس کا

خون کھولنے لگتا۔ قریب کے گھروں میں رہنے والے بچے ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اس کی تضحیک کرتے تھے۔ وہ سب واقف تھے کہ صوفیہ کے ماں، باپ میں کتنا پیار تھا۔ کوئی بچہ اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا اور بناوٹی حیرت کے ساتھ دوسرے بچوں سے پوچھتا۔

"یہ تو وہی ہے نا۔ Love nest کی باسی، پیار کرنے والے پنچھیوں کی بیٹی ننھی پیاری چڑیا۔"

اور وہ سب قہقہے لگاتے۔ پھر یوں ہوا کہ کچھ شیطان لڑکوں نے Love nest کے پہلے ایل L اور آخر والے تین حروف پر سیاہی پھیر دی۔ اب جو نیا لفظ بنا وہ Oven تھا۔ اپنے گھر کے لیے یہ نام صوفیہ کو موزوں لگا تھا۔ گھر کی فضا کسی اوون کی طرح ہی حبس زدہ اور جھلسانے والی تھی۔ چند روز یہ بات بھی چٹکلوں کا موضوع بنی رہی۔ پھر بچے بھول بھال گئے اور صوفیہ کی زندگی سے کم از کم ایک تلخی دور ہو گئی۔

وہ البا اور گرانٹ دونوں سے متنفر تھی۔ دونوں سے نفرت کرنے کی مختلف وجوہات تھیں۔ البا کے نزدیک اس کا وجود اور عدم موجودگی مختلف باتیں نہیں تھیں۔ کسی روز اگر اسکول سے واپس گھر آنے کے بجائے وہ کسی دوسری جگہ چلی جاتی تو البا احساس تک نہ ہوتا۔ وہ اس سے ایک جملہ تک نہ کہتی۔

ایک بار کھیل کے دوران اسکول کی ایک لڑکی کے دھکا دینے پر گرنے کے باعث اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے، لیکن البا کو اس کا سوجا ہوا ہونٹ اور خون آلود مسوڑھے اس لیے دکھائی نہ دیے کہ اس کے رونے کی آواز سن کر اس نے بند دروازے کے پیچھے سے ہی چیختے ہوئے اسے دفع ہو جانے کو کہا تھا۔ وہ کمرے کے اندر اپنے ایک موسیقار دوست کے ساتھ اس کی بنائی ہوئی دھنیں سن رہی تھی۔

گرانٹ اور کوکین کے سوا کسی تیسری شے کی البا کو پروا نہ تھی۔ اسے تو صوفیہ کی تاریخ پیدائش تک یاد نہیں تھی۔ کبھی کبھی اسے شک ہونے لگتا کہ البا سے اس کا خون کا رشتہ تھا ہی نہیں، اس نے بری سے بری ماؤں کو بھی اپنے بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کم سے کم وہ اتنا ضرور جانتی تھیں کہ ان کے بچوں کی عمریں کتنی تھیں، وہ اسکول میں کس کلاس میں پڑھتے تھے اور وہ دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے یا بائیں ہاتھ سے۔

گرانٹ کا معاملہ اس کے یکسر برعکس تھا۔ وہ اس کی ایسی کڑی نگرانی کرتا کہ اس کی نظروں سے چھپ کر کچھ کر لینا صوفیہ کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اس کے اٹھتے ہوئے قدم گنتا، اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظ شمار کرتا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ اسے اپنی مرضی سے سانس لینے کی اجازت بھی نہ دیتا۔

گرانٹ مسلمان تھا، وہ صوفیہ کو بھی اپنے مذہب پر چلا رہا تھا۔ دن بھر کی عبادات اور روزانہ قرآن پڑھنا اسے بہت مشکل لگتا تھا۔ وہ جان چھڑانے کے کئی حیلے کرتی، مگر گرانٹ کسی صورت اسے بخشنے پر تیار نہ ہوتا۔ اس کے خیال میں صوفیہ ایک ناپاک مخلوق تھی۔ اسے مصفا اور خالص بنانا ہی گرانٹ کی سب سے اہم ذمہ داری تھی۔ اسے سدھارنے کی غرض سے وہ ہر طرح کے حربے آزماتا تھا۔ اس سدھار میں زبانی ڈانٹ پھٹکار سے جسمانی سزائیں تک شامل تھیں۔

گرانٹ اور البا کے اوون میں وہ دھیرے دھیرے جھلس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس تنگ اور تاریک خلا میں سمٹی ہوئی بدقت سانس لے رہی تھی۔ اس قدر گاڑھا اندھیرا تھا کہ اسے اپنے ہاتھ تک نظر نہ آتے تھے، جن سے وہ لکڑی کی ٹھوس دیوار پر لگاتار دستک دے رہی تھی۔

"مجھے باہر نکال دو، میرا سانس بند ہو رہا ہے، میں مر جاؤں گی۔"

ہذیانی انداز میں روتے ہوئے وہ ایک جیسے لفظوں کی تکرار کیے جاتی تھی۔ اگر باہر سے گرانٹ کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی نہ دے رہی ہوتیں تو وہ خوف سے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

گرانٹ نے بطور سزا کچھ دیر قبل اسے الماری کے خانے میں گھسیڑ کر پٹ بند کر دیا تھا۔ پچھلے کئی منٹوں سے وہ گرانٹ سے التجائیں کر رہی تھی کہ وہ اسے باہر نکال دے، مگر اب تک اس کی رائے تبدیل نہ ہوئی تھی۔

گرانٹ نے آج صبح اسکول جانے سے پہلے اسے قرآن کی ایک طویل سورت زبانی یاد کرنے کی ہدایت کی تھی، جس کا امتحان اسے شام کو لینا تھا۔ صبح ہی صوفیہ کی اسے یاد کرنے کی نیت نہیں تھی۔ کیونکہ اسے وہ طویل سورت اتنی کم مہلت میں حفظ کرنا ناممکن لگ رہا تھا اور پھر اسکول سے آتے ہی وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن ہو گئی تو گرانٹ کی ہدایت اس کے ذہن سے نکل گئی۔ اپنے مقرر کیے ہوئے وقت پر جب گرانٹ نے اسے وہ سورت سنانے کو کہا تو وہ گونگوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگی۔

اب وہ الماری میں بند اسی کوتاہی کی سزا بھگت رہی تھی۔ روتے روتے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔

"اندر اندھیرا ہے نا؟" گرانٹ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں اندازہ ہوا کہ اندھیرا کتنی خوف ناک شے ہے، وہ کیسے انسان کو ڈراتا ہے؟ قبر کا اندھیرا اس اندھیرے سے ہزار گنا زیادہ ڈراؤنا ہو گا۔ اللہ سے بغاوت کرنے کی تمہیں جرات کیسے ہوئی؟ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ایک مسلمان ہو کر تم اپنی مرضی کی بے لگام زندگی گزارو گی۔" اشتعال میں گرانٹ الماری کے پٹ پر زور، زور سے ہاتھ مارنے لگا۔

"مجھے معاف کر دو، میں اب نہیں کروں گی، میں معافی مانگتی ہوں، اب ایسا نہیں ہو گا، ایک بار مجھے معاف کر دو۔" ہچکیوں کے دوران وہ بے ربط جملے بول رہی تھی۔

"مجھ سے نہیں خدا سے معافی طلب کرو، وہ تمہیں معاف کرے گا تو عذاب تم سے دور ہو گا۔ اونچی آواز میں سو دفعہ کہو کہ اے میرے خدا میرا گناہ معاف کر دے۔"

وہ تیزی سے اس کا بتایا ہوا فقرہ دہرانے لگی تھی۔

"اونچی آواز میں کہو، مجھے سنائی نہیں دے رہا۔"

اس نے گرانٹ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آواز بلند کر دی تھی۔

"اور اونچا۔ اتنی اونچی آواز میں معافی مانگو کہ تمہاری آواز آسمان تک جائے۔ شاباش دہراتی رہو، میں گن رہا ہوں، ابھی تمہیں چالیس دفعہ اور کہنا ہے۔"

☼ ☼ ☼

اس کی انگلش کی ٹیچر نے اس کے والدین میں سے کسی ایک کو اسکول بلوایا تھا۔ لہٰذا گرانٹ اس کے اسکول آیا تھا۔ ٹیچر مارشا نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر گرانٹ کے حوالے کیا۔

"یہ صوفیہ نے لکھا ہے، تم اسے پڑھ لو تو اس کے متعلق بات کرتے ہیں۔"

گرانٹ نے کاغذ کی تحریر پر نظر ڈالے بغیر اسے ٹیچر مارشا کو لوٹا دیا اور قدرے ترش لہجے میں بولا۔ "اگر تم مجھے اس میں سے گرامر اور ہجوں کی غلطیاں نکالنے کو کہہ رہی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ یہ تمہارا کام ہے، اگر پڑھائی میں صوفیہ کی کارکردگی تسلی بخش نہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے صوفیہ ذہین ہے اور سیکھنے کے معاملے میں بھی زیادہ بری نہیں۔ دراصل میں نے کلاس کے بچوں کو تخلیقی لکھائی کا کام دیا تھا۔ ہر بچے کو کسی دوسرے کی مدد لیے بنا ایک مضمون تحریر کرنا تھا۔ جس کے لیے موضوع کا چناؤ بھی اسے خود کرنا تھا۔ صوفیہ کے مضمون کا موضوع ہے خدا۔"

"یہ تو بڑی عمدہ بات ہے، اس سے اچھا موضوع کیا ہو گا۔" گرانٹ نے صوفے کے کونے میں سہم کر بیٹھی ہوئی صوفیہ کو خوشی بھری نظروں سے دیکھا۔

"موضوع تو بلاشبہ بہترین ہے، لیکن مسئلہ موضوع میں نہیں ہے، مجھے صوفیہ کے خیالات جان کر تشویش ہوئی ہے، بلکہ میں کہوں گی کہ میں اس لڑکی کے لیے پریشان ہو گئی ہوں، دس سطروں کے اس مضمون میں

جہنم، عذاب، آگ، قبر، قیامت جیسے لفظوں کی بھرمار ہے۔"

گرانٹ کے چہرے پر فخر کا تاثر ابھرا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ یہ صوفیہ کی سمجھ داری کا ثبوت ہے۔ وہ خدا کو پہچان رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری تربیت بالکل ہی رائیگاں نہیں جارہی۔"

اس تبصرے نے ٹیچر مارشا کو حیران کردیا تھا۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایک نودس سال کی بچی کا اس طرح سے سوچنا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے کہ وہ تمام منفی حوالوں سے خدا کو شناخت کرتی ہے۔ اللہ کے تصور سے اس کے دماغ میں صرف سزا اور عذاب جیسی چیزیں ہی کیوں آتی ہیں۔ پورے مضمون میں کسی ایک جگہ بھی اس نے اللہ کے محبت کرنے والے روپ کا ذکر نہیں کیا۔ کیا اسے ذرا بھی اندازہ نہیں کہ اللہ اپنی مخلوقات سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے خدا کے وجود سے دہشت زدہ ہونا سیکھ لیا ہے۔ خدا سے ڈرنا اور خدا سے دہشت کھانا دو جدا کیفیات ہیں یقیناً" تم دونوں میں تمیز کرسکتے ہو۔ آگے چل کر اس کے دماغ میں نفسیاتی کجیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس کی شخصیت مسخ ہونے کا امکان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم نے اسے خدا کی محبت سے روشناس نہیں کروایا۔ محبت ہی تو خدا کا اصل تعارف ہے۔ شاید تمہیں صوفیہ کی تربیت کے طریقے میں بدلاؤ لانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ میں سنجیدگی سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔"

گرانٹ نے نخوت سے ہنکارا بھرا تھا۔

"تمہاری مذہبی فلاسفی اور ہمارے دینی عقائد میں بہت فرق ہے۔ یہ محبت محبت کی گردان کرکے شتر بے مہار پھرنے کا نظریہ تمہیں ہی مبارک ہو۔ تمہیں اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں۔" اس نے ٹیچر مارشا کے کرسچن ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیچر مارشا کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

"دیکھو بات مذہبی فلاسفی کے مختلف ہونے کی نہیں ہے۔ صوفیہ کے اندر جو منفی خیالات پنپ رہے ہیں وہ اس کی شخصیت کے توازن کو بگاڑ دیں گے۔" ٹیچر مارشا نے تحمل سے کہا۔

"اب اس بحث کو سمیٹ دو تو بہتر ہے۔ صوفیہ کی پرورش کیسے ہونی چاہیے، یہ مجھے کسی سے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میری رائے میں اس کی سوچ کا بہاؤ بالکل درست سمت میں ہے، کیا اس کے علاوہ کسی اور مسئلے پر بھی تم مجھ سے بات کرنا چاہو گی یا میں جاؤں۔" گرانٹ نے چڑچڑے پن سے کہتے ہوئے گفتگو کا اختتام کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

گرانٹ فلموں میں معمولی نوعیت کے کردار ادا کرتا تھا۔ جب بھی اس کی فلم ریلیز ہوتی تو اسے مفت ٹکٹ ملتے۔ بعض اوقات وہ اسے اور البا کو اپنی کوئی فلم دکھانے بھی لے جاتا تھا۔ انہیں پوری فلم میں ان چند سیکنڈز کا انتظار کرنا پڑتا جن میں گرانٹ اسکرین پر دکھائی دیتا۔ گرانٹ کو باقاعدگی سے کام نہیں ملتا تھا، کبھی وہ دو، تین ہفتے مسلسل مصروف رہتا اور کبھی مہینوں گھر سے باہر جانے کی نوبت نہ آتی۔

البا نے بھی گنتی کی چند فلموں میں بطور ایکسٹرا کام کیا تھا، لیکن یہ صوفیہ کی پیدائش سے پہلے کا قصہ تھا۔ ان دنوں اس کے ذرائع معاش کیا تھے اور وہ ان کے بارے میں غلط بیانی کیوں کرتی تھی، یہ غور طلب معاملے تھے۔ وہ ہمیشہ بلند و بانگ دعوے کرتی کہ کاسٹنگ ڈائریکٹرز اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور فلمی حلقوں میں کئی اہم ناموں سے اس کی شناسائی تھی، البتہ صوفیہ کو ان بیانات کی تائید میں کبھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

وہ اتنی ہی معروف اداکارہ ہوتی تو ٹیلی ویژن پر کبھی تو اس کے متعلق کوئی خبر آتی، کسی دن تو ان کا کوئی ہمسایہ دروازہ کھٹکھٹاتا اور کہتا کہ "اداکارہ البا اتنے عرصے سے میرے پڑوس میں رہتی ہیں اور میری بدقسمتی دیکھو کہ مجھے خبر ہی نہیں۔" یا راہ چلتے کوئی اسے پہچان کر آٹوگراف کا تقاضہ کرتا۔ وہ روزانہ رات کو کہاں جاتی تھی اور رات بھر گھر سے کیوں غائب رہتی تھی۔ یہ معمہ بہت عرصہ تک صوفیہ سے حل نہ ہوا۔

اسے شبہ ضرور تھا کہ البا کوئی ایسا کام کرتی تھی جس کا عام لوگوں سے پردے میں رکھنا ضروری تھا۔ غالباً وہ کوئی بار ڈانسر تھی۔ یا پھر Prostitute بھی ہوسکتی تھی۔ دوسری بات کے امکانات زیادہ تھے، کیونکہ گرانٹ کسی بات پر لعنت ملامت کرتا تو البا کے لیے اس کے منہ سے ایسے الفاظ بارہا ادا ہوئے۔

"اس عورت کے سائے سے بھی دور بھاگو۔ وہ تمہیں بھی اپنے جیسی Prostitute بنا کر دم لے گی۔"

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا شک پختہ ہوتا جارہا تھا کہ یہ محض گرانٹ کے غصہ اتارنے کا ایک انداز نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ بھی تھی، ورنہ وہ اتنی باقاعدگی سے ان باتوں کو کیوں دہراتا۔ پھر البا نے اپنے معمول میں تبدیلی کی اور اپنے کسٹمرز کو گھر میں لانا شروع کردیا تو صوفیہ کا گمان یقین میں ڈھل گیا۔

کچھ مرد صوفیہ میں غیر ضروری دلچسپی ظاہر کرتے اسے زبردستی اپنے پاس بٹھائے رکھتے، عجیب انداز سے چھوتے اور ایسی نظروں سے دیکھتے کہ اس کا دل وہاں سے دور بھاگ جانے کو مچلنے لگتا۔ البا کو اس کی بے چینی کی کوئی پروا نہ ہوتی۔ وہ ان لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے انہیں بڑھاوا دیتی رہتی اور چھچھوری باتیں کرتی رہتی۔ صوفیہ کو جتنی کراہت ان گھناؤنی سانسوں والے مردوں سے آتی اس سے کئی گنا زیادہ گھن وہ البا کے لیے محسوس کرتی۔ وہ جھوٹی، تصنع کی پتلی اور اخلاقی گراوٹ کا نمونہ تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ سب گرانٹ کی لاعلمی میں ہورہا تھا۔ اکثر یوں ہوتا کہ وہ گھر پر ہی ہوتا اور البا کسی مرد کو لے آتی۔ ایسے مواقع پر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بند ہوجاتا تھا۔ البتہ اس کی موجودگی سے اتنا فرق ضرور پڑتا کہ البا کی مجال نہ ہوتی کہ صوفیہ کو اپنے پاس بلالے۔ ان مردوں کی آمد کا ایک مفید پہلو بھی تھا۔

صوفیہ چونکہ البا کے کمرے میں سوتی تھی۔ اس لیے جب وہ رات کے پچھلے پہر گھر لوٹتی تو صبح تک صوفیہ کو اس کی صحبت برداشت کرنا پڑتی۔ وہ نیند میں دانتوں کو پیستی رہتی۔ وہ آواز اتنی نفرت انگیز ہوتی کہ صوفیہ کی نیند اچاٹ ہوجاتی۔ کئی بار البا اسے سوتے میں جھنجوڑ ڈالتی اور پوچھنے لگتی۔

"میری کھال کے نیچے کیڑے رینگ رہے ہیں۔ دیکھو، کیا میرے بازوؤں اور ٹانگوں پر تمہیں ان کی حرکت محسوس ہوتی ہے؟ وہ میرے جسم کے اندر کیسے گھس گئے ہیں۔ وہ میرا گوشت کھا رہے ہیں۔ ذرا میری پنڈلیوں پر زور، زور سے تھپڑ مارو، یہ مجھے سونے نہیں دیتے۔"

صوفیہ کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دونوں علامتیں کوکین کے دیرینہ اور مسلسل استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ بہرکیف ان راتوں میں صوفیہ کو کسی دوسری جگہ سونا پڑتا۔ گرمیوں کا موسم ہوتا تو وہ den میں سوتی اور سردیوں میں کچن کے فرش پر۔ اس طرح وہ البا کی پریشان کن عادتوں کا سامنا کرنے سے بچ جاتی تھی۔

ان ہی دنوں میں اس پر انکشاف ہوا کہ گرانٹ اس کا حقیقی باپ نہیں تھا، بلکہ وہ تو اس کا سوتیلا باپ بھی نہیں کہلا سکتا تھا، کیونکہ گرانٹ اور البا نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ دراصل یہ بات گرانٹ نے خود اپنی زبان سے اسے بتائی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ وہ کسی غلطی کو لے کر حسب عادت صوفیہ پر برس رہا تھا تو غصے کی حالت میں اس نے کہا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو کہ میں نے خون کا رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی تمہاری تربیت کا بیڑہ اٹھا لیا ہے۔ میں تمہارے حال پر رحم نہ کھاتا تو نہ تم مسلمان ہوتیں اور نہ ہی عزت سے جی رہی ہوتیں۔ تمہاری رذیل ماں تمہیں کسی ڈمپسٹر میں پھینک کر تم سے جان چھڑا چکی ہوتی۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، پھر بھی میں تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔ اس کے بدلے مجھے تم سے کیا

توقع ہو سکتی ہے۔ صرف اللہ مجھے میری اس نیکی کا اجر دے گا۔"

"میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں؟ کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" صوفیہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"بکواس مت کرو، جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر کان دھرو، نہ تم میری بیٹی ہو اور نہ تمہاری ماں میری بیوی ہے۔ میرا تم دونوں سے کوئی رشتہ نہیں اور اس کے لیے میں اللہ کا شکر گزار ہوں۔"

وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا، مگر صوفیہ کا ذہن اسی ایک نکتے پر اٹک گیا تھا۔ آخر کار یہ عقدہ کھل ہی گیا تھا کہ اسکول میں اس کا لاسٹ نیم گرانٹ کیوں نہیں درج کروایا گیا تھا۔

وہ اتنی خوش ہوئی کہ اگلے روز اسکول میں جا کر اپنے ایک ایک ہم جماعت کو پکڑ کر بتاتی رہی کہ گرانٹ اس کا باپ نہیں تھا۔ اس کے سر سے جیسے کوئی الزام اتر گیا تھا۔ کیا ہی خوب ہوتا اگر البا بھی اس کی اصل ماں نہ ہوتی۔



اس روز اسکول سے واپس آتے ہوئے اس کی سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ گھر اس جگہ سے کم و بیش دو میل دور تھا۔ پریشان ہوتے ہوئے وہ ڈھیلے قدموں سے پیدل چلنے لگی تھی۔

وہ ایک بے حد گرم دن تھا۔ آسمان کے کنارے دھوپ سے بھرے ہوئے تھے۔ سائیکل کو جس کے ہتھے سے بھاری اسکول بیگ لٹکا ہوا تھا، اپنے ساتھ گھسیٹ کر چلنے کی مشقت سے تھوڑی ہی دیر میں وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ ان کے جمناسٹک کے استاد نے آج کچھ مشکل قسم کی نئی ورزشوں کی مشقیں کروائی تھیں، جس کی وجہ سے وہ پہلے ہی خاصی تھکی ہوئی تھی۔ اب رہی سہی کسر تیز دھوپ اور بار برداری کی اضافی محنت نے پوری کر دی تھی۔ پیاس کے مارے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی پانی کی بوتل میں ایک گھونٹ بھی نہ تھا۔

خود پر جبر کر کے وہ چلتی رہی تھی۔ جب تھکن اور پیاس حد سے تجاوز کر گئیں تو مجبوراً" سائیکل کو سڑک کے کنارے زمین پر لٹا دیا اور خود قریب ہی صنوبر کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ اس نے سڑک کے موڑ سے آرلسٹ کو جسے پیار سے آرنی پکارا جاتا تھا، کو سائیکل پر اسی سمت آتے دیکھا۔ آرنی اور صوفیہ کے گھروں کے بیچ صرف ایک پتلی سڑک تھی۔

صوفیہ کے گھر کی کھڑکی سے آرنی کے گھر کا لان نظر آتا تھا۔ وہ مسز پر گنز امیک گریگور کا پوتا تھا۔ وہ اکثر کھڑکی میں سے آرنی کو ایک بڑے سے کتے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتی تھی۔ آرنی اس سے ایک سال چھوٹا تھا اور اس کے اسکول میں پڑھتا تھا، البتہ اس کے اور صوفیہ کے درمیان کبھی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

اس وقت اس کی آمد پر صوفیہ کو خیال آیا کہ اسے روک کر مدد مانگے، پھر وہ جھجک گئی کہ جانے آرنی کس نوعیت کا رد عمل ظاہر کرے۔ آرنی کی سائیکل جب اس کے نزدیک پہنچ گئی تو اس نے جان بوجھ کر اپنی نظریں فٹ پاتھ پر مرکوز کر لیں۔

"کیا ہوا صوفیہ؟ تم گھر کیوں نہیں جا رہی ہو؟"

آرنی کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ "ٹائر پنکچر ہو گیا ہے اور میں بہت تھک گئی ہوں، مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔" اس نے آرنی کو بتایا جو ہمدردی بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم میرے ساتھ آ جاؤ، میں تمہیں لے چلتا ہوں۔"

خوش ہوتے ہوئے وہ زمین سے اٹھ گئی تھی۔

"لیکن میں اپنی سائیکل یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"

"ٹھیک ہے، ہم اسے یہاں نہیں چھوڑیں گے۔" آرنی نے کہا۔ "اس کی ایک ترکیب ہے، میں سائیکل چلاتا ہوں اور تم میرے پیچھے بیٹھ کر اپنی سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر کھینچتی رہنا، ایسا کرنے میں تمہیں مشکل تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں، میں یہ کر لوں گی، لیکن میرا بیگ مجھ سے سنبھالا نہیں جائے گا۔ میرے کندھوں میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے ایک اور پریشانی بتائی۔

"کوئی بات نہیں، اسے میں سنبھال لوں گا۔ میرا خیال ہے، تمہیں پانی پینا چاہیے، تمہاری بیٹھی ہوئی آواز سننے میں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی۔"

اس نے اپنی پانی والی بوتل صوفیہ کے ہاتھ میں تھمائی۔ جھینپ کر مسکراتے ہوئے صوفیہ نے شکریہ کہا تھا۔ پھر آرنی نے اپنا بیگ کیریئر سے اتار کر کندھوں پر لادا اور صوفیہ کا بیگ اپنی سائیکل کے ہتھے سے لٹکا دیا۔ راستہ بھر وہ نہایت احتیاط سے سائیکل چلاتا رہا۔ گھر کے سامنے پہنچ کر خدا حافظ کہتے ہوئے جانے لگا تو اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ اس نے آرنی کو رکنے کو کہا۔ صوفیہ پر مہرباں ہونے والے لوگوں کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آرنی کے احسان نے اس کا دل ممنونیت سے معمور کر دیا تھا۔ اچانک وہ آگے آئی اور آرنی کا گال چوم لیا۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ مڑی ہی تھی کہ اپنے سامنے گرانٹ کو پا کر ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شرارے دھوپ سے بڑھ کر تند تھے۔ دھاڑتے ہوئے اس نے آرنی کو گالی دی۔

"ملعون لڑکے! دوبارہ تم مجھے صوفیہ کے آس پاس دکھائی دیے تو میں تمہاری یہ سفید کھال کھینچ لوں گا، تمہارے ہاتھوں اور پیروں کے دس ناخنوں سمیت۔"

آرنی ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ گرانٹ نے صوفیہ کے سر کی پشت اور کندھوں پر لگاتار کئی تھپڑ مارے اور اسے دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔

"میں نے تمہیں لڑکوں سے دور رہنے کو کہا تھا۔ تم کون سی زبان سمجھتی ہو؟" غصے سے کھولتے ہوئے گرانٹ نے اس سے بازپرس شروع کی۔

"وہ صرف گیارہ سال کا ہے۔" صوفیہ نے خوف سے مغلوب ہوتے ہوئے آرنی کی عمر ایک سال کم کر کے اپنا جرم گھٹانا چاہا۔

"تم تو تیرہ سال کی ہو، کتنی ڈھیٹ اور بے حیا ہو تم، مجھے سب سے زیادہ خوف اسی چیز سے آتا ہے کہ کہیں تم اپنی ماں کی طرح Prostitute نہ بن جاؤ اور تم میرے اس خوف کو سچ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ اس عمر میں تمہاری ایسی حرکتیں ہیں۔ اس لڑکے کے ساتھ جڑ کر کھڑی تم کیا کر رہی تھیں؟"

"کچھ بھی نہیں، میرا یقین کرو، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری سائیکل خراب ہو گئی تھی تو وہ مجھے اپنی سائیکل پر گھر لے آیا۔ میں صرف اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔" صوفیہ نے لرزتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"مکار، جھوٹی، تم مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہی ہو، میں نے خود تمہیں اس لڑکے کو چومتے ہوئے دیکھا ہے۔"

خوف سے صوفیہ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ "ایسا نہیں ہوا، میں سچ کہتی ہوں، میں تو بس اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میری اس سے دوستی بھی نہیں ہے۔ میری کسی بھی لڑکے سے دوستی نہیں ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس کی زبان میں لکنت آ گئی۔

گرانٹ نے جھپٹ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔ "تم خدا کے نام پر جھوٹ بولتی ہو، تمہیں معلوم ہے اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اپنے ایک گناہ کو چھپانے کے لیے تم اس سے بڑا گناہ کرتی ہو۔ جہنم جو تمہارا منتظر ہے۔ اسے شاید تم مذاق سمجھتی ہو، آؤ میں تمہیں دنیا میں جہنم کا نمونہ دکھاتا ہوں۔"

باقی آئندہ شمارے میں

مریم فردوس

یادیں ہماری

رمضان کے چاند نے سوگوار ماحول کی پراسراریت کچھ کم کی تھی یا مجھے ہی لگی تھی! پچھلے کافی دنوں سے میں محسوس تو کر رہی تھی کچھ عجیب سا ہے یا ہونے کو ہے، مگر میں اپنے احساسات کو کوئی نام نہ دے پاتی تو وہم سمجھ کے سر جھٹک دیتی، مگر بہت کچھ تھا جو کسی انہونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

رمضان کے آنے سے پہلے اسے خوش آمدید کہنے والی صفائیاں ستھرائیاں۔

روزہ کشائیوں۔ ختم تراویح۔ افطاری کی دعوتوں میں پہننے کے لیے آدھا آدھا درجن کپڑوں کی سلائیاں۔

افطاریاں بھجوانے میں سبقت لے جانے کے لیے اضافی راشن کی لسٹوں کی تیاریاں۔

اس دفعہ ایسا کچھ نہیں تھا۔

میری دونوں چھوٹی نندیں اپنی ساری شوخیاں بھلائے خاموشی سے اپنی زندگی کے خوش رنگ دن پھیکے انداز میں گزارنے لگی تھیں اور میری ساس چپ کی چادر اوڑھے بس ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے پر دانے گرائے جاتیں اور میں سارے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔

"امی! یہ چادر آپ کی مسہری پر اب اچھی نہیں لگتی۔ میں نئی لا دوں؟"

وہ ایک نظر مجھ پر ڈالتیں پھر ہاتھ میں پکڑی اپنی تسبیح کو دیکھتیں اور میں ان کی خاموشی سے کوئی نتیجہ نہ اخذ کر پاتی۔ رضامندی۔ یا....؟

"ثوبیہ! کیا عید کی شاپنگ اس دفعہ چاند رات کو کرنا ہے۔" میں نندوں کو اکساتی وہ ادھر ادھر ہو جاتیں۔

"سب مجھ سے اتنا کٹ کیوں رہے ہیں؟" میں سوچتی رہتی۔ سوچتی رہتی.... پھر وہم سمجھ کر کاموں میں مگن ہو جاتی۔

"توصیف سے میری بات ہر دوسرے دن ہو جاتی تھی، مگر پچھلے ہفتے سے کوئی پابندی سے نہ ہو پائی تھی۔ ان کا فون تو ایک آدھ بار ہی آیا تھا۔ میں فون کرتی تو وہ ہوں ہاں میں جواب دے کر جلدی سے بند کر دیتے۔

اتنی جلد بازی تو اس گھر کے مکینوں میں مجھے ان دو سالوں میں نظر نہیں آئی تھی۔ میں حیران ہی ہوتی۔

پھر میری امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی تو میں تین چار دن کے لیے وہاں چلی گئی۔ ان دنوں میں تو توصیف سے بالکل بات نہ ہو پائی۔ سسرال آ کر سب سے پہلے میں نے اپنی ساس سے توصیف کے متعلق ہی پوچھا تھا۔

"ہاں! ابھی کل بات ہوئی ہے میری۔ سب ٹھیک ہے۔ تم سے دو چار روز میں بات کر لے گا۔"

وہ بات کرتے کرتے مجھے گلے لگا لیتیں۔ اور یہ پچھلے کچھ دنوں سے ہی ہو رہا تھا۔ محبت تو وہ مجھ سے کرتی تھیں، مگر آج کل مجھے لگتا تھا ان کی محبت بڑھ رہی ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

اپنی شادی کے ان دو سالوں میں میں نے اپنے شوہر کے ملک سے باہر ہوتے ہوئے بھی اپنے سسرال میں بہت حسین یادوں کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ اور ابھی دو سال مزید توصیف کے بغیر گزارنے تھے۔ توصیف چار سال کے کانٹریکٹ پر ابوظہبی گئے ہوئے تھے۔

اکلوتی ہونے کی وجہ سے میں نے کبھی اپنے گھر میں بہن بھائیوں کا شور شرابا، ہلا گلا نہیں دیکھا تھا۔ توصیف اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بہنیں بھی تھیں۔

اور اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مجھے کیا چاہیے تھا دو بہنیں۔

جب بھی یہ مثال میرے ذہن میں آتی ہے، مجھے خود ہنسی آ جاتی ہے، مگر پھر بھی میں اسے ہی بیان کرتی ہوں۔

میری نندیں واقعی میری بہنیں تھیں۔ میں نے بڑے پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی بھرپور عزت دی۔ اس دو طرفہ محبت نے ماحول خوشگوار کر رکھا تھا۔ وہ کالج کی ہر ہر بات مجھ سے ساتھ شیئر کرتی تھیں۔ میری ساس بھی کوئی سخت گیر روایتی ساس نہیں تھیں۔ وہ مجھ میں اور ثوبیہ، نادیہ میں کوئی فرق نہ کرتی تھیں۔

اور ابا میاں، میرے سسر وہ تو تھے ہی بہت شاندار انسان۔ وہ واقعی شاندار تھے۔ ظاہری اور باطنی دونوں اطوار میں۔

وہ ہم تینوں کے جیسے دوست تھے۔ مگر آج کل وہ بھی بہت کم گو ہو گئے تھے۔ اپنے سسرال کا اتنا خوبصورت ماحول شوہر کے نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے کھینچتا تھا۔

میں بہت کم میکے جاتی تھی۔

✲ ✲ ✲

آج رمضان کا چاند دیکھ کر میں نے کیا دعا کی؟ میرے لبوں پر کوئی دعا ہی نہیں آئی بس ایک نام آیا تھا۔

"توصیف۔" اس سے زیادہ میں کچھ سوچ ہی نہیں سکی۔

توصیف مجھے بے تحاشا یاد آ رہے تھے، حالانکہ مجھے پتا تھا، وہ عید پر ہی آئیں گے یعنی ایک مہینہ، مطلب تیس دن اور!

انتظار ہمیشہ ہی کتنا کٹھن ہوتا ہے۔

چاند دیکھ کر میں نے اپنے برابر میں دیکھا۔ ثوبیہ، نادیہ وہاں نہیں تھیں۔ چھت پر میں اکیلی ہی تھی۔ وہ نیچے جا چکی تھیں۔ اپنی اتنی بے خبری پر میں خود ہی ہنستی نیچے اتر آئی۔

امی نادیہ سے سحری کے سالن کے لیے گوشت دھونے کو کہہ رہی تھیں۔ ابا میاں کھجلہ پھینی یاد کر رہے تھے اور ثوبیہ، وہ تراویح کے لیے ہلکان ہو رہی تھی۔ اتنی لمبی لمبی نمازوں سے وہ ہمیشہ ہی کتراتی تھی۔

ساری آوازیں ایک ساتھ مل کر بہت خوش گوار منظر پیش کر رہی تھیں۔ یعنی وہی رونقیں، وہی خوشیاں مگر پھر خاموشی۔ ایک جامد چپ۔

سوگواریت کے ساتھ پراسراریت بڑھتی ہی گئی۔

سحری میں امی نے مجھے بتایا کہ "رات توصیف کا فون آیا تھا۔ میں نے کہا تمہیں اٹھا دیتی ہوں۔ مگر اس نے منع کر دیا کہ نیند خراب مت کریں۔ میں بعد میں بات کر لوں گا۔"

میرے دل پر سناٹا سا چھا گیا۔ ہر چیز سے دل بیزار ہو گیا۔ کتنے دن ہو گئے مجھ سے بات کیے ہوئے۔ میں فون کرتی ہوں تو ملتا ہی نہیں اور خود فون کرتے ہیں تو مجھ سے بات نہیں کرتے۔ میں بری طرح الجھ گئی۔

میں یہی سوچتی رہی کہ سب کا رویہ اتنا عجیب سا ہے، توصیف کا بھی۔

"کہیں توصیف نے وہاں شادی....." اس خیال نے میری روح کھینچ لی۔ میں بے جان جسم کے ساتھ بیڈ پر گر گئی۔

افطاری سے کچھ دیر پہلے ہی کمرے سے باہر آئی۔ سب نے اپنی الجھنوں میں میرے رویے پر غور ہی نہیں کیا۔ ابا میاں نے مجھے ایک ڈبہ پکڑایا۔ بند ڈبہ۔

"توصیف کا کوئی دوست دے گیا ہے۔ اس نے



تمہارے لیے بھجوایا ہے اپنے دوست کے ہاتھ۔"

میں نے لے کر ایک کونے میں رکھ دیا۔ روزہ کھول کے کچھ حواس بحال ہوئے تو ڈبہ کھولا۔

آسمانی کلر کا بہت خوبصورت جارجٹ کا سوٹ۔ سفید نگوں نے اس میں جان سی ڈال دی تھی۔ بہت دیر تک میں اسے لیے بیٹھی رہی مگر توصیف کی دوسری شادی کا خیال میرا پیچھا نہ چھوڑ رہا تھا۔

میرا عبادت میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے توصیف کو فون ملایا۔ انہوں نے اٹھایا ہی نہیں۔ میں خود کو گھسیٹتی باہر آئی اور امی کے کمرے میں جھانکا۔ انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی، پھر تلاوت میں مشغول ہو گئیں۔ وہ سمجھیں میں ایسے ہی آئی ہوں۔ میں پریشان چہرہ لیے ان کے پاس ٹک گئی۔ وہ چونکیں پھر قرآن پاک میں نشانی لگا کر اسے بند کیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

وہ زبان کا استعمال کم کرتی تھیں اسی لیے اس کے شر سے خود بھی محفوظ تھیں اور دوسرے بھی۔

"امی! وہ اتنے دن ہو گئے توصیف سے بات نہیں ہوئی۔ میرا دل پریشان ہو رہا ہے۔" میں اٹک اٹک کر ان سے کہتی گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ مجھے اپنے کاندھے پر نمی سی محسوس ہوئی تو میرے رونے میں بھی شدت آ گئی۔

انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور اپنے سفید براق دوپٹے میں اپنے آنسو جذب کیے۔ میں نے بھی چہرہ اپنے ہاتھوں سے رگڑ ڈالا۔

"تھوڑے دن ہیں، پھر وہ آ ہی جائے گا، پریشان کیوں ہوتی ہو۔" انہوں نے مسکرا کر مجھے مضبوط لہجے میں بتایا۔ میں کچھ مطمئن ہوئی، مگر ان کا رونا سمجھ میں نہ آ سکا۔ میں بوجھل سی اپنے کمرے میں آ گئی۔

میں اس پوری رات بے چین رہی۔ نیند میرا چین مجھے نہ لوٹا سکی۔

اس دن کے بعد سے میں کسی کی "چپ" کیا نوٹ کرتی، خود ہی چپ ہو گئی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

بے شک ان بیس دنوں میں توصیف سے میری کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ ان کا فون آتا تو تھا مگر ہمیشہ اس وقت جب میں سو رہی ہوتی.... اس عرصے میں ان کی طرف سے مجھے تین بار تحفے موصول ہوئے۔ بیس دن میں تین تحفے بھی حیرت کی بات تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ابا میاں مجھے ڈبہ پکڑاتے ہوئے یہی کہتے کہ توصیف نے کسی دوست کے ہاتھ بھیجا ہے۔ ان تحفوں سے نہ میرا دل بہلتا، نہ میں مطمئن ہوتی۔

دو دن تھے ابھی متوقع چاند رات میں، جب افطاری کے بعد امی نے مجھے بتایا۔ بیٹا! شاید توصیف اس عید پر نہ آ سکے۔" ان کا ندامت بھرا انداز مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔

"ان کو کس بات کی ندامت؟ وہ تو توصیف کو ہونا چاہیے۔ اس بات کی اطلاع بھی مجھے بھجوائی گئی تھی، یعنی میں اس قابل بھی نہیں کہ مجھ سے بات ہی کر لی جاتی۔" بہت برے دل کے ساتھ میں برتن دھو رہی تھی۔

"جس عید کے دن کا اتنا انتظار کیا، وہ ہی ایسا روکھا پھیکا ہو گا۔" میرے اندر خالی پن اترنے لگا۔ میں نے انہیں فون کرنے کے لیے نمبر ملایا، پھر لائن کاٹ دی۔

"جب انہوں نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا تو پھر میں کیوں بار بار ان کے لیے فکر مند ہوتی رہوں۔"

وہ دو دن اسی طرح کال ملاتے اور پھر لائن کاٹتے توصیف کے فون کے انتظار میں گزر گئے۔



آج متوقع چاند رات تھی۔

یعنی چاند رات کا دن تھا آج!

سوگوار ماحول پر اسرار ہونے کو تھا میں بے دلی سے کام نبٹاتی رہی۔ دل میں یہ بھی خدشہ تھا کہ اب توصیف آئے تو یقیناً ان کی دوسری بیوی بھی ساتھ ہی ہو گی۔ عید کا چاند نظر آیا تو میں بے زار سی چھت پر آ گئی۔ چاند دیکھ کر میں کوئی دعا ہی نہ کر سکی۔ بس ایک کسک سی محسوس ہوئی۔

"میری عید تو تب ہوتی جب توصیف آتے۔"

میں نے اپنی اڑتی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کر کے نماز کے انداز میں دوپٹہ باندھ لیا.... کہ مجھے خاموشی میں ابھرتی آوازوں بلکہ سوگواریت میں پھیلتی خوشیوں نے متوجہ کر لیا تھا۔ میں ابھی چند قدم ہی سیڑھیاں اتری تھی کہ نادیہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے قدم من من بھر کے ہو گئے۔

"کیا سرپرائز دیا ہے آپ نے بھائی ہم کو...."

ثوبیہ کی آواز اور پھر... توصیف کی آواز.... وہ آواز میرا نام لے رہی تھی۔

"میرا الوژن میری خواہش۔" میں نے سر جھٹکا۔ مگر دیکھا تو سچ مچ سامنے توصیف کھڑے تھے۔

میں خوشی سے سکتے میں آ گئی۔ وہ ہی میرا ہاتھ تھام کر مجھے نیچے لائے۔

سوگواریت کی پر اسراریت اب ڈھول بن گئی تھی، مگر یہ میرا وہم تھا۔ اسرار تو کھلنے کو بے تاب تھا۔

"توصیف، آپ نے مجھ سے ایک مہینے تک کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ میں سمجھی، آپ نے کہیں وہاں شادی تو نہیں کر لی۔" میں ان کو اپنے خدشات بتانے لگی۔

"سمجھو! بس ہوتے ہوتے رہ گئی۔" وہ اداسی سے بولے۔

ان کی بات نے مجھے گنگ کر دیا۔

"ارے چھوڑو۔ سب مذاق ہے۔ بس اب تمہارا توصیف ہمیشہ تمہارے پاس...."

میں پھر ٹھٹک گئی۔ "ہمیشہ۔"

"میں نے کانٹریکٹ ختم کر دیا۔ کچھ سیلری ہی چھوڑنا پڑی نا۔ کوئی بات نہیں۔"

"مگر کیوں؟" خوشی کے ساتھ بے یقینی تھی۔

وہ چند ثانیے مجھے گھورتے رہے، پھر بولے۔

"تمہارے لیے۔" مگر ان کے انداز نے ان کے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔

مگر پھر عید کی خوشیوں میں وہ سب باتیں دب گئیں۔

پھر کتنی عیدوں، کتنے رمضانوں کے چاند ہم نے ساتھ دیکھے۔ توصیف نے یہیں ایک کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ گزارا آسانی سے نہیں تو مشکل سے بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس بیچ بیچ تھا مگر ان دنوں کی اسرار بھری خاموشی میرے دماغ میں اٹک گئی تھی۔

اور آج اس سال پھر رمضان کا چاند میں نے توصیف کے ساتھ ہی دیکھا ہے۔ بہت خوشیوں کے سنگ۔ توصیف کسی کام سے باہر گئے ہیں۔

ماریہ، میری بہو کچن میں اٹھا پٹخ کر رہی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ شوہر ملک سے باہر ہو تو خوشیاں بھی سرد سی ہوتی ہیں۔ وہ دو بچوں کی ماں بن چکی ہے، مگر ازدواجی زندگی کے یہ اوائل دن اگر یادگار نہ ہوں تو بڑی خلش رہتی ہے، اسی لیے میں اس کی سہیلی کی طرح رہتی ہوں۔ اس کے غم کو ہلکا کرتی ہوئی۔

اس کی اٹھا پٹخ کو نظر انداز کر کے میں نے توصیف کا بریف کیس کھولا۔

کتنے سال مٹی کی گرد اس پر اپنی چادر بچھاتی رہی اور یہ اوپر دو چھتی پر پڑا ان چادروں میں لپٹا گیا۔

کل ہی مجھ سے ماریہ نے فرمائش کی تھی کہ میں اسے اپنی شادی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں دکھاؤں۔ یہ تمام چیزیں اسی بریف کیس میں جمع رہتی تھیں۔ میں نے بریف کیس کھولا۔ صبح ماریہ نے خود اسٹول پر چڑھ کر اوپر سے اتارا تھا۔ سارا دن پھر موقع نہ مل سکا۔

"چلو ماریہ کا موڈ کچھ تو ٹھیک ہو گا۔"

میں نے ساری تصویریں نکالیں۔ پھر اور کچھ چیزیں.... پرانی یادیں.... تحریریں سب دیکھتی چلی گئی۔ ایک لفافہ تھا جو میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا ہے۔" اپنی یادداشت پر زور دیتے میں نے اس میں سے کاغذ نکالے.... اور پھر میرے سر پر آسمان آ گرا۔

توصیف آ گئے۔ میرے ہاتھ میں وہ کاغذات دیکھ کر مسکرائے۔

"میں نہیں چاہتا تھا، تمہیں اس سب کا پتا چلے، مگر خیر اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تو وہ تحفے پر تحفے۔ ابامیاں اپنی طرف سے دیتے رہے۔۔۔ اور امی کو فون پر فون۔۔۔ سب جھوٹ تھا۔"

وہ میری سوچیں پڑھ گئے۔ "ہاں یار! بس وہاں اتنا سب کچھ ہو گیا، مگر تمہیں بتانے سے میں نے سب کو منع کیا تھا۔ ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی، پھر ایسی کوئی ذہنی قربت بھی نہیں تھی۔ انسان بدگمان ہو سکتا ہے۔" میں حق دق انہیں دیکھ رہی تھی۔

"غبن کا الزام لگانے والا کوئی اور نہیں، میرا اپنا دوست ہی تھا۔ دس دن میں۔" وہ رکے "میں اریسٹ بھی رہا۔ وہاں کے قانون کا تو تمہیں پتا ہے۔ پھر وکیلوں کے چکر میں سارا پیسہ بھی گیا، مگر شکر ہے بدنامی نہیں ہوئی۔ عزت سے لوٹا ہوں۔"

"آپ کبھی تو بتاتے۔"

"پھر تم کیا کرتیں؟"

"اور اگر اللہ نہ کرے آپ پر جھوٹا الزام ثابت ہو جاتا تو۔" میں نے بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"وہاں جھوٹ کو سچ ثابت کرنا ذرا مشکل ہے۔ اور اگر ہو جاتا تو پتا ہے کیا ہوتا؟" وہ ڈرامائی انداز میں بولے۔

"سب تمہیں یہ بتاتے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔" ان کا قہقہہ کمرے میں گونجا۔ میں مسکرائی۔

میری نظر دروازے پر پڑی۔ ماریہ ایک سالہ انس کو گود میں لیے کچھ کہنے آئی تھی۔ ہمیں اس طرح ہنستے دیکھ کر جھینپ گئی۔

"آؤ ماریہ! دیکھو یہ تصویریں۔"

اس نے میرے ہاتھ سے تصویریں لیں۔ وہ اشتیاق سے ان "بلیک اینڈ وہائٹ" تصویروں میں اپنی مسکراہٹوں کے رنگ بھرنے لگی۔ توصیف ان تصویروں پر لطیف تبصرے کرنے لگے۔

میں نے وہ کاغذات۔۔۔ مقدمے کے کاغذات تہہ کر کے واپس بریف کیس میں رکھے۔

"تو یہ اسرار آج کھلنا تھا۔"

"اور امی اور ابامیاں۔" مجھے وہ ٹوٹ کر یاد آئے۔ "اپنے غم میں ڈوبے وہ مجھے ہی سنبھالتے رہے۔" میں ماریہ پر نظریں جمائے سوچ گئی۔

"آج میں بھی تو امی کی جگہ پر ہوں اور ماریہ میری جگہ پر۔"

وہ میری نظروں کے ارتکاز پر چونکی، پھر تصویریں ہاتھ سے نیچے رکھیں۔ اسے کام یاد آ گئے۔ شاید سب بہوؤں کو ساسوں کی گھوریوں سے کام یاد آتے ہوں گے۔ مجھے اس کا تجربہ نہیں۔

"میں۔۔۔ وہ سالن ہی دیکھنے جا رہی تھی۔" وہ وضاحت دیتی انس کو توصیف کی گود میں دے کر اٹھ گئی۔

"میں کچن میں ہی جا رہی ہوں۔ تم بیٹھو! میں دیکھ لوں گی۔" میرے نرمی سے کہنے پر وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

"میری ساس اور میرے سسر جو وہ میرے لیے کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا۔ اب جو مجھ سے ہو سکا، میں ماریہ کے لیے کروں گی۔ احسان کا بدلہ ہمیشہ محسن ہی کو تو نہیں دیا جاتا۔ کسی کے ساتھ بھی اچھا کر کے وہ احسان لوٹایا جا سکتا ہے۔"

کمرے سے باہر آنے سے پہلے میں نے بریف کیس میں سے مقدمے کے کاغذات نکال کر الماری میں رکھے۔ اس سے مجھے یاد دہانی ہوتی رہے گی۔ کبھی کسی نے مجھ پر جذباتی احسانات کیے ہیں۔ مجھے جذباتی سہارے دیے ہیں۔ خود پریشان رہ کر مجھے پریشانیوں سے بچایا ہے۔

یہی سوچتی میں کمرے سے باہر آ گئی۔

ماریہ اپنے سسر کے ساتھ تصویروں پر تبصرے کرنے میں مگن تھی۔

بہوؤں کو اچھا رکھنے کے لیے سسرالی ماحول کو اچھا رکھنا پڑتا ہے۔

میرے چہرے پر اطمینان کے سائے کھل کر لہرائے تھے۔

اسرار تو کھل گیا تھا۔ کئی احسانوں کے آشکار ہونے کے ساتھ!

☆

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو



میری عزیز بہنو۔۔ السلام علیکم

تقریباً چار سال بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہوں۔ چار سال ایک طویل عرصہ ہے اور کسی بھی مصنفہ کے لیے اتنا عرصہ اپنے قارئین سے دور رہنا کس قدر مشکل ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اس دوران میں نے لکھا ہی نہیں۔ میں اس ناول کی کئی قسطیں لکھ چکی ہوں۔

پھر اس غیر حاضری کی وجہ؟

میں صرف اور صرف خواتین ڈائجسٹ میں لکھنا چاہتی ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ نے مجھے پہچان دی، شہرت دی اور مجھے لاکھوں ذہنوں تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں اور لکھ کر تسلی نہیں اور تشنگی رہتی۔ خواتین ڈائجسٹ سے میرا گہرا قلمی اور قلبی رشتہ اٹوٹ ہے۔ ہر ماہ اس ڈائجسٹ کے صفحات الٹتے ہوئے میں خود بھی نگہت عبداللہ کو تلاش کرتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے مجھے اور ہر اس مصنفہ کو جس نے آج کوئی بڑا نام اور مقام پایا ہے لمحہ بہ لمحہ راہنمائی کی۔ کرداروں پر کہانی پر اس قدر محنت کروائی اور کی کہ ہر تحریر چھپنے کے بعد مصنف نے دلی سکون محسوس کیا۔

آج پھر سے ایک نئے ناول کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہوں اور امید کرتی ہوں کہ میرے گذشتہ ناولوں کی طرح یہ ناول بھی آپ کے دل کو چھو لے گا۔ آپ کی آرا ہمیشہ میرے لیے مقدم رہی ہیں۔ اسی طرح ناول کے ہر موڑ پر مجھے ادارۂ خواتین ڈائجسٹ اور انشل کی راہنمائی کی ضرورت رہی ہے۔ امید کرتی ہوں کہ مجھے آپ بہنوں، ادارے اور انشل کا تعاون حاصل رہے گا۔

نگہت عبداللہ

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب توصیف احمد کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہو کر رک گئی۔ پھر پہلے انہوں نے خود کو ضبط کے کڑے پہروں میں مقید کیا' اس کے بعد گاڑی سے اتر کر اندر آئے تو انہیں دیکھتے ہی یاسمین نے پیشانی پر بل ڈال کر طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

"آ گئے آپ......" یاسمین کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا' جب ہی وہ نظرانداز کر گئے اور ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

"آپ تشریف رکھیے توصیف احمد! بچے بھی آجائیں گے۔" یاسمین کا انداز ہنوز تھا۔

"ویسے بچے اب کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ اریبہ میڈیکل کے دوسرے سال میں' سارہ تھرڈ ایئر میں اور حماد کا میٹرک کا رزلٹ آج کل میں آنے والا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" توصیف احمد آرام سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اچھا......!" یاسمین اچھا کو لمبا کھینچ کر بولیں۔ "آپ کے بچے تو سنا ہے ابھی پرائمری کلاسوں میں ہیں۔"

"یاسمین!" توصیف احمد غالباً "تنبیہہ کرنا چاہتے تھے کہ سارہ کو آتے دیکھ کر ہونٹ بھینچ گئے۔

"السلام علیکم ڈیڈی!" سارہ نے قریب آتے ہوئے سلام کیا' پھر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام کیسا ہے میرا بیٹا؟" توصیف احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں ڈیڈی۔ آپ کب آئے؟"

"بس ابھی۔ اریبہ اور حماد کہاں ہیں؟" توصیف احمد سارہ سے بات کرتے ہوئے یاسمین کو یکسر نظرانداز کر گئے تھے۔

"اریبہ اپنے کمرے میں اور حماد کرکٹ کھیلنے گیا ہے۔ آپ چائے پئیں گے یا کھانا لگاؤں؟" سارہ نے جواب کے ساتھ پوچھا تو توصیف احمد سے پہلے یاسمین بول پڑیں۔

"کھانے کا پوچھ کر اپنے باپ کو شرمندہ مت کیا کرو' بیٹا تو ہے ان کے چھوٹے بچے ان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ کیوں توصیف احمد! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔"

توصیف احمد سارہ سے نظریں چرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بیٹا! میں چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی' اریبہ سے نہیں ملیں گے۔ میں بلاتی ہوں اسے۔" سارہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھی اور جانے لگی تو وہ بھی اس کے ساتھ چلے آئے۔

اریبہ بیڈ پر نیم دراز ٹانگ پر ٹانگ رکھے' بہت دھیمی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ سارہ کے ساتھ توصیف احمد اندر آئے تو اس نے اٹھنے میں بہت سستی دکھائی جس پر سارہ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہنے لگی۔

"کیا بات ہے بیٹا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" توصیف احمد کے نرم لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے ڈیڈی! آپ بیٹھیں' میں آپ کے لیے اچھی سی چائے لاتی ہوں۔" سارہ نے زبردستی توصیف احمد کو بٹھایا' پھر اریبہ کو گھورتی ہوئی چلی گئی۔

"چمچی۔" اریبہ نے سر جھٹکا' پھر توصیف احمد کے سامنے آکر براہ راست ان سے پوچھنے لگی۔ "یہ سارہ آپ کی اتنی چمچہ گیری کیوں کرتی ہے ڈیڈی؟"

"جسے آپ چمچہ گیری کہہ رہی ہو' وہ اس کی محبت ہے۔" توصیف احمد مسکرائے۔

"آپ کے خیال میں صرف وہی آپ سے محبت کرتی ہے؟" اریبہ کے لہجے میں ناگواری سمٹ آئی۔

"نہیں' میرے سب بچے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ البتہ اظہار کا سلیقہ صرف سارہ میں ہے۔ وہ سب کو اپنا بنانا

جانتی ہے۔" توصیف احمد نے دھیرج سے کہا تو وہ فوراً بولی تھی۔

"حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ نقصان ہی نقصان ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہو؟" توصیف احمد اس کی بات پر چونکے تھے۔

"اس لیے کہ اپنوں ہی سے دکھ ملتے ہیں اور نقصان بھی اپنے ہی پہنچاتے ہیں۔" وہ کچھ جتا نہیں رہی تھی۔ اس کا لہجہ صاف گو تھا۔

"میں آپ سے اختلاف نہیں کروں گا لیکن بیٹا......!" سارہ کے آنے سے توصیف احمد خاموش ہو گئے کیونکہ وہ اریبہ کی بحث اور جرح سے پریشان ہو جاتی تھی۔

"ڈیڈی! میں نے اسپیشل چائے بنائی ہے۔ یہ آپ کو فائیو اسٹار ہوٹل کا مزا دے گی۔" سارہ نے چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے کہا' پھر دوسرا کپ اٹھا کر اریبہ کی طرف بڑھا دیا۔

توصیف احمد خاموشی سے چائے پینے لگے۔

"ہما اور فہد کیسے ہیں ڈیڈی؟" سارہ نے پوچھا۔ توصیف احمد چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بس اثبات میں سر ہلا دیا' پھر چائے کا آخری سپ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"او کے بیٹا! میں چلتا ہوں اور ہاں آپ کو کوئی پرابلم تو نہیں ہے' کسی چیز کی ضرورت؟" انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھا تو اریبہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

"جی ڈیڈی! مجھے بائیک چاہیے۔"

"بائیک!" توصیف احمد حیران ہوئے' جبکہ سارہ پریشان ہو گئی تھی۔

"جی! کالج آنے جانے کے لیے۔" اریبہ کا انداز ہنوز تھا۔

"تو کیا آپ گاڑی استعمال نہیں کر تیں؟" توصیف احمد نے اریبہ سے پوچھ کر سارہ کو دیکھا جیسے وہ جواب دے گی۔

"گاڑی میں بہت پرابلم ہوتی ہے ڈیڈی' ٹریفک میں پھنس جاتی ہے۔ اکثر میں لیٹ ہو جاتی ہوں۔ میری کلاس مس ہو جاتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے میرا کتنا نقصان ہوتا ہے۔" اریبہ نے اپنی پرابلم بتا کر اصرار کیا۔

"بس آپ مجھے بائیک دلا دیں۔"

"وہ تو میں دلا دوں لیکن بائیک چلائے گا کون؟"

"میں خود۔"

اریبہ کے جواب نے سارہ کو مزید پریشان کر دیا۔ اس نے توصیف احمد کو دیکھا۔ وہ خاموش ہو گئے تھے' پھر خاموشی سے چلے گئے تو پہلی بار سارہ ان کے پیچھے جانے کی بجائے اریبہ سے الجھ پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات وہ بہت دیر تک اسٹڈی کرتی رہی تھی۔ دو تو بج ہی گئے تھے' پھر صبح چھٹی بھی نہیں تھی جو وہ اطمینان سے سوتی' جب ہی صبح جلدی اٹھنے کی ٹینشن کے ساتھ اس نے لائٹ آف کر کے بیڈ پر چھلانگ لگائی تھی اور جلدی سو بھی گئی تھی۔ لیکن آج شاید اس کی قسمت میں سونا نہیں لکھا تھا جو گھنٹے بھر بعد اس کا موبائل میوزک بجانے لگا۔ وہ پہلے کسمسائی پھر ذرا سی آنکھیں کھول کر بیڈ کارنر پر رکھے موبائل کو دیکھنے لگی جس کی اسکرین اندھیرے میں جگمگا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ موبائل کی طرف ہاتھ بڑھاتی میوزک بند ہو گیا۔

"شکر......" اس نے کروٹ بدلی تھی کہ پھر میوزک بجنے لگا۔

"شٹ......" اس نے فوراً موبائل اٹھایا اور بدتمیزی سے پوچھا تھا۔ "کون ہے؟"

"خاکسار کو اجلال رازی کہتے ہیں۔" ہمیشہ والا دلنشیں انداز جو کبھی اس کے اندر ہلچل مچایا کرتا تھا، اب اندر تک سلگا گیا۔

"کہتے ہوں گے اس وقت یعنی رات کے تین بجے فون کرنے کا مقصد؟"

"مقصد تمہاری نیند اڑانا۔۔۔ جو خواب سوتے میں دیکھ رہی تھیں، وہ اب جاگتی آنکھوں میں سجالو۔ سن رہی ہو ناں! میں تمہارے خوابوں کی تعبیر بن کر آرہا ہوں۔" اجلال رازی کے لہجے میں ابھی بھی اس کے لیے بے پناہ چاہت تھی۔

"کیا بکواس ہے۔" وہ ہتھے سے اکھڑنے لگی۔

"کم آن اریبہ! تم شاید نیند خراب ہونے پر ناراض ہو رہی ہو۔ سوری یار میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ میری سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔" اجلال رازی کے لہجے میں حد درجہ یقین تھا، جیسے وہ بے تابی سے پوچھے گی کب، کب آرہے ہو۔

"تو میں کیا کروں؟" اس نے نروٹھے پن سے کہہ کر موبائل آف کر دیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔ کتنی دیر وہ خود کو دھوکا دیتی رہی جیسے وہ سو چکی ہے اور جب تھک گئی تو ایک دم اٹھ بیٹھی۔ تکیہ کھینچ کر گود میں رکھ لیا اور دھیرے دھیرے جھولنے لگی۔ یہ اس کا اندرونی اضطراب تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا۔

"رازی نے اپنے آنے کی اطلاع مجھے کیوں دی ہے۔ کیا تائی امی نے اسے نہیں بتایا کہ میں وہ بندھن توڑ چکی ہوں۔ شاید اس لیے چھپا گئی ہوں گی تاکہ وہاں رازی ڈسٹرب نہ ہو۔ اس کی پڑھائی سے توجہ نہ ہٹ جائے۔ بہت چالاک ہیں تائی امی، لیکن یہاں غلطی کر گئی ہیں۔ اب اچانک رازی کو پتا چلے گا کہ میں نے اس کے نام کی انگوٹھی اتار کر واپس کر دی ہے تو وہ کتنا شاکڈ ہوگا۔"

"ہوا کرے مجھے کیا۔" اس نے پھر خود کو دھوکا دیا تھا۔



"امی، امی......!" ثنا بھاگتی ہوئی ساجدہ بیگم کے کمرے میں آئی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"امی، رازی بھائی آرہے ہیں۔ ابھی ان کا فون آیا تھا۔ بتا رہے تھے سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔"

"اللہ ساتھ خیریت کے لائے۔ کب آرہا ہے۔" ساجدہ بیگم کے اندرونی جذبات کبھی ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ ہمیشہ پرسکون رہتی تھیں۔

"اس مہینے کی بیس تاریخ کو۔ اللہ! امی یہ دن کیسے کٹیں گے۔ میرا دل چاہ رہا ہے بس رازی بھائی ابھی آجائیں۔" ثنا کی بے صبری پر ساجدہ بیگم مسکرا کر رہ گئیں۔

"آپ کو خوشی نہیں ہو رہی۔ پورے پانچ سال بعد آرہے ہیں رازی بھائی۔" ثنا اکثر ان کے سکون پر جھنجلا جاتی تھی۔

"خوشی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم آپے سے باہر ہو جائیں۔ ڈھنڈورا پیٹ کر دنیا کو خبر دیں کہ ہم خوش ہیں۔ جو ہمیں خوشی عطا کرتا ہے ہمیں پہلے اسی کو یاد کرنا چاہیے۔"

ساجدہ بیگم تحمل سے بولی تھیں۔ ثنا یکدم ٹھنڈی پڑ گئی، پھر اچانک کسی خیال کے تحت ان کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

"اچھا امی! وہ اریبہ والی بات کا کیا ہوگا؟"

"جو اللہ کو منظور......" ساجدہ بیگم کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی، گویا دل پر بوجھ تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، جو اللہ کو منظور ہوگا، وہی ہوگا لیکن ابھی جو رازی بھائی کو پتا چلے گا کہ اریبہ نے منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی ہے تو وہ پریشان ہی نہیں ہوں گے بلکہ ناراض بھی ہوں گے کہ آپ نے انہیں اس وقت کیوں نہیں بتا دیا تھا۔ آخر کیوں چھپایا آپ نے ان سے......؟" ثنا نے آنے والی صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا کر سوال اٹھایا تھا۔

"وہ مصلحتاً" چھپایا تھا بیٹی مصلحتاً"۔۔۔ یہ رشتہ تمہارے ابا نے طے کیا تھا۔ میں اسے قائم رکھنا چاہتی ہوں اور اپنی پوری کوشش کروں گی۔ رازی ناراض ہوگا تو مان بھی جائے گا، پھر ہو سکتا ہے وہ اریبہ کو بھی منا لے۔ اس لیے میں نے اس بات کو وہیں دبا دیا تھا۔"

ساجدہ بیگم بظاہر سکون سے بول رہی تھیں، لیکن ان کے چہرے پر فکر مندی کا تاثر صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

"بے کار ہے امی! اریبہ کے اب مزاج ہی نہیں ملتے۔ پتا نہیں کیا سمجھنے لگی ہے اپنے آپ کو۔ بالکل اپنی ماں کی طرح ہو گئی ہے بدمزاج اور بدزبان۔" ثنا نے جلے لہجے میں اریبہ کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔

"ہوں ہوں!" ساجدہ بیگم نے خفگی سے ٹوکا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو۔ بڑوں کے بارے میں اس طرح بات کرتے ہیں۔ یہی سکھایا ہے میں نے تمہیں۔"

"سوری امی!" ثنا اکتاہٹ سے بولی۔ "بس اب آپ مجھے مزید لیکچر مت دیجیے گا۔"

"اچھا جاؤ کچن دیکھو۔ ابھی بلال "کھانا کھانا" کرتے ہوئے آئے گا۔"

ساجدہ بیگم نے ثنا کو وہاں سے اٹھا دیا، لیکن پھر خود اسی نہج پر سوچنے لگی تھیں، یعنی اریبہ کے بارے میں۔ منگنی کی انگوٹھی واپس کرنے کے بعد سے وہ واقعی بہت بدل گئی تھی۔ یہاں آنا تو بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ گزشتہ مہینے انہوں نے اپنی نند انیسہ کے گھر میں اسے دیکھا تھا۔ سلام تک نہیں کیا تھا اس نے اور ان ڈائریکٹ بہت کچھ سنا بھی گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے بہو بنانے پر تیار تھیں، کیونکہ ایک تو یہ رشتہ ان کے مرحوم شوہر نے طے کیا تھا، دوسرے وہ توصیف احمد کو بھی ناراض نہیں کر سکتی تھیں جو ان کا ماں کی طرح احترام کرتے تھے۔

"اے اللہ میں اس معاملے کو تیرے سپرد کرتی ہوں اور تجھ سے اچھی امید رکھتی ہوں تو یقیناً" بہتر کرنے والا ہے۔" ساجدہ بیگم خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے اللہ سے مدد مانگنے لگی تھیں۔



توصیف احمد معمول کے مطابق آفس سے آنے کے بعد فریش ہو کر لان میں آبیٹھے تھے۔ جاتی گرمیوں کی خوشگوار سی شام تھی۔ فضا نے ہوا کی نمی چرا لی تھی۔ توصیف احمد اپنی عمر کی پانچ دہائیاں مکمل کر چکے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز کے باوجود ان کا ذہن سرسبز و شاداب تھا اور احساسات زندہ۔ جب ہی موسموں کا بدلنا محسوس کرتے تھے۔

وہ فطرتاً" محبت کرنے والے بہت نفیس انسان تھے۔ زندگی سے انہیں پیار تھا اور وہ اپنی زندگی محبت اور سکون سے بسر کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ ان کی بدقسمتی کہ پہلے ان کی زندگی میں یاسمین آگئیں۔ یاسمین نے کسی بات پر راضی ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ جتنی حسین تھیں، اس سے کہیں زیادہ بدمزاج اور بدزبان۔ مشتعل ہوتیں تو توصیف احمد کو زمانے بھر میں رسوا کرنے سے نہیں چوکتی تھیں۔ اس کے باوجود زندگی کے خوب صورت سال توصیف احمد نے یاسمین کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش میں گزار دیے، اس امید پر کہ کبھی تو وہ خود کو بدلنے پر تیار ہوں گی۔ ان کے لیے نہ سہی بچوں کی خاطر ہی سہی، لیکن وہ جانے کس مٹی کی بنی تھیں۔ خود کو بدلنا تو دور کی بات

کبھی اپنے رویے پر نادم بھی نہیں ہوتی تھیں۔ آخر توصیف احمد اس زندگی سے تنگ آ گئے۔ پہلے زیادہ وقت آفس میں گزارنے لگے۔ لیکن آفس کے بعد گھر تو جانا ہی ہوتا تھا اور انہیں گھر کے نام سے وحشت ہونے لگی تھی۔

پھر ایک دن وہ اپنے بڑے بھائی حبیب احمد اور بھاوج ساجدہ بیگم کے سامنے باقاعدہ رو پڑے تھے۔

"میں تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے۔ اب مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی، لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتا بھائی صاحب! مجھے بچالیں۔ میں اپنے بچوں کے لیے جینا چاہتا ہوں۔"

حبیب احمد اور ساجدہ بیگم سے ان کے گھریلو حالات ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ انہوں نے اس وقت توصیف احمد کو بہت تسلی دلاسا دیا۔ پھر حبیب احمد نے ہی انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی سالی خالدہ سے ان کی شادی کرا ہی دی تھی اور یہ شادی طویل عرصہ تک راز ہی رہی تھی، کیونکہ یاسمین کو کبھی اس بات سے دلچسپی نہیں رہی تھی کہ توصیف احمد ہر دوسرے ہفتے آفس ٹور پر اسلام آباد جاتے ہیں یا بنکاک اور واپسی میں اتنے دن کیوں لگا دیتے ہیں۔

بہرحال خالدہ سے شادی کے بعد توصیف احمد کو ایک گھر کا سکون میسر آ گیا تھا۔ اس لیے یاسمین کو انہوں نے ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ جو کہتیں خاموشی سے سن لیتے، کیونکہ اریبہ اور سارہ سمجھ دار ہو گئی تھیں اور وہ اپنی طرف سے انہیں اچھا ماحول دینا چاہتے تھے۔

جب اریبہ نے میٹرک کر لیا تو حبیب احمد اور ساجدہ بیگم نے اسے اپنے بیٹے اجلال رازی کے لیے مانگ لیا۔ اجلال اس وقت ایم بی اے کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ یوں اس کے جانے سے پہلے باقاعدہ اریبہ کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی، جس میں دونوں کی رضا شامل تھی اور یاسمین نے بھی کوئی اعتراض نہیں اٹھایا تھا، کیونکہ اجلال کا مستقبل تابناک نظر آ رہا تھا۔ دوسرے اپنے میکے میں وہ اکلوتی تھیں۔

پھر جن دنوں اجلال امریکہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، حبیب احمد دل کے دورے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں کچھ عرصہ کے لیے اس کا جانا ملتوی ہو گیا۔ بلکہ وہ تو پھر جانا ہی نہیں چاہتا تھا، کیونکہ گھر میں اب بڑا وہی تھا، لیکن ساجدہ بیگم نے بہت ہمت سے کام لیا، پھر توصیف احمد نے بھی یہی کہا کہ اسے ضرور جانا چاہیے۔ یہ ان کے مرحوم بھائی کی خواہش تھی۔ یوں اجلال امریکہ چلا گیا۔ وہ گیا تو صرف دو سال کے لیے تھا لیکن پھر ایم بی اے کے بعد اس نے وہیں جاب کر لی۔

یہاں آ کر بھی اسے یہی کچھ کرنا تھا لیکن یہاں اور وہاں کی کرنسی میں فرق تھا، اس لیے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اس نے تین سال مزید وہاں لگا دیے تھے، جس پر توصیف احمد کو کوئی اعتراض نہیں تھا، کیونکہ اریبہ بھی ابھی پڑھ رہی تھی۔ میڈیکل اس کا شوق تھا اور توصیف احمد بچوں کے مثبت شوق کی پذیرائی کرتے تھے۔ بہرحال کچھ عرصہ یعنی چھ آٹھ مہینے پہلے تک سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک بھونچال آ گیا۔ یوں کہ یاسمین کو ان کی دوسری شادی کی خبر ہو گئی جو کہ اب کافی پرانی ہو گئی تھی، یعنی خالدہ سے توصیف احمد کے بچے ہما اور فہد اسکول جانے والے ہو چکے تھے۔

اور یاسمین نے اپنی بے خبری پر ماتم نہیں کیا تھا، نہ توصیف احمد کو دوسری شادی کرنے پر لعن طعن کی ان کا سارا غصہ ساری لعن طعن ساجدہ بیگم پر تھی جنہوں نے اپنی بہن کو ان کی سوتن بنا دیا تھا۔

"چالاک، مکار عورت پہلے دن ہی مجھے دیکھ کر جل گئی تھی۔ سانپ لوٹنے لگے تھے اس کے سینے پر۔ میرا حسن، میری تعلیم اس جیسی عورت سے برداشت ہی نہیں ہوئی اور آخر لے آئی اپنی جاہل گنوار بہن کو۔ بس توصیف احمد اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ جاؤ اسی حرافہ کے پاس۔"

توصیف احمد تو پہلے بھی اس عورت کی زبان پر بند نہیں باندھ سکے تھے اب وہ مزید بے لگام ہو گئی تھی۔ اب

یاسمین نے اپنے ساتھ اریبہ کو بھی ملا لیا تھا۔ اریبہ چونکہ جذباتی لڑکی تھی اس لیے یاسمین اس کے سامنے آنسو بہا کر خود کو مظلوم ثابت کر لیتیں۔ جبکہ سارہ چھوٹی ہونے کے باوجود سمجھ دار تھی۔ وہ ماں کے آنسوؤں پر تسلی دلاسے دے کر فارغ ہو جاتی تھی۔

پھر پورے دو مہینے توصیف احمد نے اس گھر کا رخ نہیں کیا تھا، لیکن وہ ہمیشہ کے لیے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔ بچوں کی محبت انہیں کھینچ لائی تھی۔ اس پر یاسمین نے بہت واویلا مچایا، بہت کوشش کی کہ توصیف احمد پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیں لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ سارہ اور حماد کو باپ کا انتظار رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے اریبہ کو بھی رہتا ہو لیکن وہ ظاہر نہیں کرتی تھی۔ ان ساری باتوں کے باوجود توصیف احمد اپنے اس دوسرے گھر میں خوش اور مطمئن تھے۔ بس ایک خلش تھی کہ وہ اریبہ، سارہ اور حماد کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے۔ انسان مکمل آسودہ تو نہیں ہوتا، کہیں کوئی کمی کوئی خلش تو ہوتی ہی ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی تھا۔

خالدہ چائے لے آئی تھیں۔ توصیف احمد نے ایک کپ اٹھا لیا پھر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

"ان کا ٹیوٹر آیا ہوا ہے۔ آج کچھ لیٹ ہو گیا ہے۔" خالدہ نے جواب دیا تھا کہ اسی پل گیٹ سے باہر گاڑی کا ہارن بجنے لگا، یوں جیسے کوئی ہارن پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گیا ہو۔ توصیف احمد نے انتہائی ناگواری سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ ملازم بھاگتا ہوا جا رہا تھا اور جیسے ہی اس نے گیٹ کھولا، زن سے ایک بائیک نہ صرف اندر آ گئی بلکہ لان میں اتر کر باقاعدہ گول چکر لگانے لگی۔ توصیف احمد فوری طور پر سمجھ نہیں سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ خالدہ اپنی جگہ پریشان ہو گئی تھیں۔ چار پانچ چکر کے بعد بائیک توصیف احمد کے عین سامنے رک گئی۔

"ہو آر یو؟" توصیف احمد نے انتہائی کرخت لہجے میں پوچھا تھا۔

"آئی ایم اریبہ۔" اریبہ نے بتانے کے ساتھ ہیلمٹ اتار دیا۔ توصیف احمد اسے دیکھتے رہ گئے۔

"دیکھ لیا آپ نے میں بائیک چلا سکتی ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نہیں دلائیں گے تو میں پڑھائی چھوڑ دوں گی۔"

"اس سے نقصان کس کا ہو گا؟" توصیف احمد کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"میرا... اور میرے نفع نقصان سے شاید آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ سوچ لیں میں اس سے زیادہ نقصان بھی کر سکتی ہوں، آئی مین اپنا۔"

"آپ مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔" توصیف احمد کو خود پر ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"آپ جو بھی سمجھیں..... او کے۔" اریبہ نے ہاتھ ہلا کر بائیک کو زوردار کک ماری اور جس طرح آندھی طوفان کی طرح آئی تھی۔ اسی طرح واپس چلی گئی۔

توصیف احمد شاکڈ بیٹھے تھے۔



ڈائننگ ٹیبل پر رات کا کھانا لگاتے ہوئے سارہ جھنجلا کر سب کو پکار بھی رہی تھی۔

"آ جاؤ بھئی کھانا لگ چکا ہے۔ مما، حماد، اریبہ! کہاں ہیں بھئی سب؟"

"میں یہاں ہوں۔" سمیر پردہ کھینچ کر سامنے آ گیا۔

"ارے تم کب آئے؟" سارہ کی ساری جھنجلاہٹ غائب ہو گئی تھی۔

"ابھی تم نے پکارا نہیں اور میں آ گیا۔" سمیر کہہ کر ٹیبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ارے کوفتے کس نے بنائے ہیں؟"
"کون بنا سکتا ہے میرے علاوہ۔" سارہ اترائی۔
"اوہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ تمہارے علاوہ اس گھر میں کوئی اور لڑکی ہے ہی نہیں۔" سمیر نے ڈش میں سے ایک کوفتہ اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ اچھل پڑی۔
"کیوں اریبہ نہیں ہے کیا؟"
"اریبہ کو تم لڑکی سمجھتی ہو۔ نہیں، نہیں۔ پوری لڑکا ہے وہ۔ شام میں میں نے اسے شارع فیصل پر بائیک بھگاتے دیکھا تھا۔ یقین کرو میں تو دنگ رہ گیا تھا بالکل اسی طرح جیسے تم..." سمیر نے انگلی سے اس کے کھلے منہ کی طرف اشارہ کیا تو اس نے سٹپٹا کر فوراً" منہ بند کیا، پھر خائف لہجے میں پوچھنے لگی۔
"تم سچ کہہ رہے ہو؟"
"سوفیصد۔ اریبہ سے پوچھ لو وہ تو جھوٹ نہیں بولتی۔" سمیر نے پورا کوفتہ منہ میں رکھ لیا تھا اور اسی کا مزا لے کر بولا تھا۔
"طنز کر رہے ہو یا مذاق اڑا رہے ہو؟" سارہ کا چہرہ بجھ گیا تھا۔
"توبہ کرو! میری اتنی مجال کہاں، ویسے میں نے غلط تو نہیں کہا، یہ تو تم بھی مانو گی کہ اریبہ سچ ہی بولتی ہے۔" سمیر کہتے ہوئے چیئر کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"ہاں کڑوے سچ جو کسی کو ہضم نہیں ہوتے۔" وہ کہہ کر زور سے چیخی تھی۔ "حماد کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
"تو اس میں اتنا چلانے کی کیا بات ہے۔" اریبہ اندر آتے ہوئے بولی۔ اس کے پیچھے حماد اور یاسمین بھی آگئیں۔
"السلام علیکم۔" سمیر، یاسمین کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"تم کیسے آئے۔" یاسمین نے سلام کا جواب نہیں دیا، الٹا نخوت سے پوچھا تھا۔ سمیر، یاسمین کے اس انداز اور ایسی باتوں کا عادی ہو چکا تھا، جب ہی برا مانے بغیر بولا۔
"بس ادھر سے گزر رہا تھا، چلا آیا۔" پھر اریبہ کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "تم نے بائیک کب لی؟"
"ابھی لی کہاں ہے۔ وہ تو دوست کی تھی۔" اریبہ سمجھ گئی تھی وہ اسے بائیک چلاتے دیکھ چکا ہے، جب ہی بے نیازی سے بولی تھی۔
"تمہاری دوست بھی بائیک چلاتی ہے۔" حیرت سے سمیر کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔
"تو اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ چلو کھانا کھاؤ اور دیکھو تعریف ضرور کرنا کیونکہ سارہ نے کوفتوں پر بڑی محنت کی ہے۔"
"واقعی! جواب نہیں۔" سمیر نے فوراً" نوالہ منہ میں ڈال کر کہا، پھر یاسمین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آنٹی! آپ کچھ چپ چپ ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"
"سارہ! چائے میرے کمرے میں بھجوا دینا۔" یاسمین نے ہمیشہ کی طرح سمیر کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اٹھ کر چلی گئیں تو سارہ صفائی پیش کرنے لگی۔
"مما کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔"
"کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ مما اسے برداشت نہیں کرتیں۔" اریبہ نے سارہ کو ٹوکتے ہوئے کہا تو سمیر فوراً" بولا تھا۔
"یہی سچ ہے۔ لیکن مجھے برا نہیں لگتا۔ اصل میں..."

"بس، زیادہ تمہیدیں باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اریبہ کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ سمیر نے ذرا سے کندھے اچکائے، پھر حماد سے پوچھنے لگا۔
"تم کب جاؤ گے؟"
"کہاں؟" حماد سمجھا ہی نہیں۔
"اپنے کمرے میں اور کہاں۔ خیر بیٹھے رہو۔ میں ہی چلا جاتا ہوں۔" سمیر جھنجلا کر اٹھا تھا۔
سارہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ثنا بہت توجہ اور شوق سے رازی کے کمرے کی صفائی ستھرائی اور سیٹنگ میں لگی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ بھائی اتنے عرصے بعد آرہا تھا۔ پانچ سال کم نہیں ہوتے۔ جب وہ گیا تھا تب ثنا آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی اور اب تھرڈ ایئر میں آگئی تھی۔ بچپن کے ساتھ وہ اوٹ پٹانگ حرکتیں بھی رخصت ہو گئی تھیں۔ اب تو وہ خاصی سمجھ داری کی باتیں کرتی تھی۔ آخر ساجدہ بیگم کی بیٹی تھی جن کی بردباری کے سامنے یاسمین جیسی بدزبان عورت بھی خود کو بے بس محسوس کرتی تھی۔ ان کی پیٹھ پیچھے لاکھ برائیاں کرتیں گالیاں دیتیں، لیکن سامنے زبان جیسے تالو سے لگ جاتی تھی۔ البتہ چہرے کے تاثرات چھپانے کی وہ کبھی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ ساجدہ بیگم تو خیر نظرانداز کر جاتیں لیکن ثنا کو بہت غصہ آتا تھا۔ اس وقت رازی کے کمرے میں نئے پردے لگاتے ہوئے وہ یہ ہی سوچ رہی تھی کہ یاسمین چچی کی ساری حرکتیں وہ رازی بھائی کو بتائے گی۔
"تمہاری اب تک سیٹنگ ختم نہیں ہوئی؟" بلال نے کمرے میں داخل ہو کر کہا تو ثنا نے رنگ میں آخری ہک ڈال کر اسٹول سے چھلانگ لگائی، پھر بلال کے ساتھ سمیر کو دیکھ کر اسی سے پوچھنے لگی۔
"آج تم کیسے راستہ بھول گئے۔"
"ابھی بھی میں کھینچ لایا ہوں۔ یہ تو کترا کے نکل رہا تھا۔" بلال نے سمیر کے کندھے پر دھپ مار کر کہا۔
"کترا کے کیوں؟ بلال سے کوئی قرض ورض لیا تھا کیا؟" ثنا اپنی بات پر خود ہی ہنسی، پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
"خیر! یہ بتاؤ پھوپھو کیسی ہیں؟"
"اچھی ہیں۔ کتنے دنوں سے کہہ رہی ہیں بڑے بھائی کے ہاں لے چلو۔ بس مجھے ہی فرصت نہیں ملتی۔" سمیر نے خاصے ڈھیلے ڈھالے انداز میں خود کو صوفے پر گرایا تھا۔
"فرصت نہیں ملتی۔ کیا کوئی کام دھندا شروع کر دیا ہے؟" بلال جو بیڈ پر دراز ہو چکا تھا، فوراً" اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"کام دھندا تو نہیں۔ امتحان سر پر ہیں۔ تمہیں پتا ہے ابو اس معاملے میں کتنے سخت ہیں۔" سمیر بتاتے ہوئے اچانک چونکا، پھر کمرے میں ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "تم نے اپنا کمرہ چینج کر لیا ہے کیا؟"
"جی نہیں! یہ رازی بھائی کا کمرہ ہے۔" ثنا پہلے بول پڑی۔ "اور رازی بھائی آرہے ہیں۔"
"اچھا کب؟" سمیر مشتاق ہو گیا تھا۔
"بیس تاریخ کو صبح چار بجے کی فلائیٹ سے۔"
"اسی مہینے کی بیس کو؟"
"ہاں اسی بیس کو۔ جب ہی تو میں ان کا کمرہ سیٹ کر رہی ہوں۔" ثنا کے لہجے میں بھائی کی محبت چھلک رہی تھی۔
"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ پھر یقیناً" ان کی شادی کا ہنگامہ ہو گا۔ لیکن اریبہ تو شاید ابھی شادی پر آمادہ نہیں ہو گی، کیونکہ اس کے دو سال باقی ہیں۔" سمیر نے اپنی بات کا خود ہی جواب بھی سوچ لیا تھا۔

”ہاں دیکھو! کیا ہوتا ہے۔“ بلال نے اس موضوع کو طول نہیں دیا اور اشارے سے ثنا کو بھی منع کر کے اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ ساجدہ بیگم نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اریبہ کے انگوٹھی واپس کرنے کی بابت ان دونوں کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلنی چاہیے۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ سمیر نے سر اونچا کر کے بلال کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”امی کے پاس۔“

”ہاں میں بھی ممانی جان سے مل لوں پھر چلتا ہوں۔“ سمیر فوراً اٹھ کر بلال کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ثنا پھر نئے سرے سے کمرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

توصیف احمد جان بوجھ کر اس وقت آئے تھے جب یاسمین گھر میں اکیلی تھیں۔ اریبہ اور سارہ اپنے اپنے کالج گئی ہوئی تھیں اور حماد کو خود انہوں نے فون کر کے اپنی بہن امینہ کے گھر بھیجا تھا کہ پھوپھو اسے بہت یاد کر رہی ہیں۔ اس کے بعد گھر آئے تو ان کی توقع کے عین مطابق یاسمین نے انہیں دیکھتے ہی تیوری چڑھالی تھی۔

”اس وقت آنے کا مطلب؟ کیا بھول گئے ہو کہ اس وقت بچے اسکول کالج ہوتے ہیں؟“

”میں کچھ نہیں بھولا۔ تم بھول رہی ہو کہ یہ میرا گھر ہے اور یہاں آنے جانے کے لیے میں کسی وقت کا پابند نہیں ہوں۔“ توصیف احمد کے اندر جانے کس بات کا غصہ تھا جو فوراً ہی ظاہر بھی ہو گیا تھا۔

”اوہ! تو تم یہ جتانے آئے ہو کہ......“

”میں کچھ جتانے نہیں آیا‘ یاسمین! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے اور میں چاہتا ہوں تم آرام سے بیٹھ کر سکون سے میری بات سنو اور سمجھو بھی۔“ توصیف احمد نے فوراً ٹوک کر مضبوط لہجے میں کہا تو یاسمین کھوجتی نظروں سے انہیں یوں دیکھنے لگیں جیسے خود ہی جان لینا چاہتی ہوں کہ وہ کیا بات کرنے والے ہیں۔

”مجھے بچوں سے متعلق بات کرنی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“ توصیف احمد نے اب لہجے کو نرم بنایا اور یاسمین کا بازو تھامنے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا تھا لیکن وہ فوراً جا کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”کہو کیا بات کرنی ہے......؟“

توصیف احمد نے چند لمحے توقف کیا‘ پھر کہنے لگے۔

”میں دیکھ رہا ہوں اریبہ دن بدن ضدی اور خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ تم ماں ہو کنٹرول کرو اسے۔ اگر ابھی تم نے اس پر توجہ نہ دی تو پھر وہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

یاسمین بہت سکون سے انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔ توصیف احمد نے بمشکل خود پر ضبط کیا‘ پھر کہنے لگے۔

”اس روز جب میں آیا تھا تو اریبہ نے مجھ سے بائیک کی فرمائش کی تھی۔ پھر کسی کی بائیک لے کر گھر آ گئی‘ یہ جتانے کہ وہ بائیک چلا سکتی ہے اور میں فوراً اسے بائیک دلا دوں‘ ورنہ وہ اپنا نقصان کرے گی۔ تم بتاؤ کیا یہ اچھی بات ہے؟ نہیں یاسمین! مجھے لڑکیوں کے یہ طور طریقے بالکل پسند نہیں ہیں۔ اس سے کہو صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دے‘ ورنہ میں کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“ آخر میں آپ ہی آپ ان کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

”توصیف احمد! اب کیا سوچو گے۔ سوچنا اس وقت چاہیے تھا‘ جب دوسری شادی کرنے جا رہے تھے۔ اس وقت تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ تمہاری بیٹیاں ہمیشہ بچی نہیں رہیں گی۔ بڑی بھی ہوں گی۔ پھر جن لڑکیوں کے باپ مر جائیں‘ انہیں تو سمجھایا جا سکتا ہے‘ اریبہ اور سارہ کو نہیں۔ کیونکہ اسی شہر میں ان کا باپ اپنے ہر عمل میں آزاد پھرتا ہے۔ پھر وہ کیوں نہ آزاد پھریں۔“ یاسمین نے ان کی بات کو سکون سے سنا ضرور تھا لیکن سنجیدگی سے

نہیں لیا تھا۔ بلکہ انہیں تو ایسا موقع چاہیے ہوتا تھا کہ وہ دل کی بھڑاس نکالیں۔

”دیکھو یاسمین! یہ صرف میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تم بھی پچھتاؤ گی۔“ توصیف احمد نے غصے سے کہا تھا۔

”میں تو تم سے شادی کر کے اب تک پچھتا رہی ہوں۔“ یاسمین سلگ کر بولی تھیں۔

”اپنی بات چھوڑو۔ اب تمہارا نہیں‘ تمہاری اولاد کا وقت ہے۔ میں جانتا ہوں تم صرف میری ضد میں اولاد کو خراب کرنا چاہتی ہو‘ لیکن میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔ تم اگر اریبہ کو سمجھا سکتی ہو تو ٹھیک ورنہ اپنا بوریا بستر سمیٹو اور نکل جاؤ یہاں سے۔“ توصیف احمد بالکل ہی بے قابو ہو گئے تھے۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہاری اولاد کی چوکیداری پر بیٹھنے کا۔ لیکن میں نکلوں گی نہیں۔ کوئی نہیں نکال سکتا مجھے یہاں سے۔ تمہارا باپ بھی نہیں۔ سمجھے تم جاؤ۔ تم نکل جاؤ۔ تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔ آئندہ مت آنا۔“ یاسمین عادت کے مطابق چیخنے چلانے لگی تھیں۔ توصیف احمد کے لیے ان کا یہ روپ نیا نہیں تھا۔ جانتے تھے کہ اب وہ کچھ نہیں سنیں گی‘ اس لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل آئے اور جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا‘ اسی وقت سارہ کالج وین سے اتر کر ان کے پاس آ گئی۔

”السلام علیکم ڈیڈی!“

توصیف احمد اس وقت کچھ بھی بولنے سے قاصر تھے‘ اس لیے سارہ کے سر پر ہاتھ رکھا‘ پھر فوراً گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”ڈیڈی! آپ جا رہے ہیں۔“ سارہ پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی بڑھا لے گئے۔ اوجھل ہونے تک سارہ وہیں کھڑی دیکھتی رہی‘ پھر بھاگ کر اندر آئی تھی۔

”مما! ڈیڈی آئے تھے‘ کیا کہہ رہے تھے؟“

یاسمین سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں بن پڑا تو چیخ کر بولی تھیں۔

”اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”کیا ہوا ہے مما؟“ سارہ سہم گئی۔

”قیامت آ گئی ہے اور کچھ نہیں ہوا۔“ یاسمین نے اسی طرح چیخ کر کہا‘ پھر خود ہی جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ سارہ کی ہمت نہیں ہوئی ان کے دروازے پر دستک دینے کی تو وہیں بیٹھ کر اریبہ کا انتظار کرنے لگی۔ اور اریبہ ایک گھنٹے بعد آئی تھی۔ مگن انداز میں بیگ جھلاتی ہوئی سیدھی اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ سارہ کو صوفے کے کونے میں دبکے دیکھ کر کچھ ٹھٹکی‘ پھر اس کے قریب چلی آئی۔

”ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ کیا مما نے ڈانٹا ہے؟“

”نہیں اریبہ! پتا نہیں کیا ہوا ہے‘ جب میں کالج سے آئی تو ڈیڈی جا رہے تھے۔ شاید غصے میں تھے۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی‘ پھر اندر آئی تو مما بھی غصے میں تھیں۔ مجھے ڈانٹا اور اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔“ سارہ نے جلدی جلدی بتایا تو اریبہ اپنا بیگ ایک طرف اچھال کر بولی۔

”اچھا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں مما کو دیکھتی ہوں اور ہاں حماد کہاں ہے؟“

”پتا نہیں‘ شاید گھر پر نہیں ہے۔“ سارہ کا جواب سن کر اریبہ یاسمین کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ پہلے ہینڈل گھما کر دیکھا‘ پھر دستک دے کر بولی۔

”مما‘ مما دروازہ کھولیں۔“

اندر اریبہ کی آواز سن کر یاسمین نے فوراً سوٹ کیس کھینچ کر بیڈ پر رکھا۔ الماری کھولی پھر بال بکھرا کر خود کو نڈھال ظاہر کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"مما!" اریبہ، یاسمین کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"
"کچھ نہیں۔" یاسمین رندھی آواز میں کہہ کر الماری کے پاس آ گئیں اور کپڑے کھینچ کر سوٹ کیس میں رکھنے لگیں۔
"یہ کیا کر رہی ہیں آپ، کہیں جا رہی ہیں کیا؟" اریبہ کچھ سمجھ نہیں پائی تو بڑھ کر الماری بند کر دی۔ "بتائیں ناں کہاں جا رہی ہیں؟"
"کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ یہاں نہیں رہ سکتی۔ تمہارے ڈیڈی کا آرڈر ہے۔ میں نکل جاؤں یہاں سے۔" یاسمین دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر سسکنے لگی تو اریبہ مزید پریشان ہو گئی۔
"مما پلیز۔ آپ روئیں نہیں، کوئی آپ کو یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ مجھے بتائیں ڈیڈی نے کیا کہا ہے؟"
"بیٹا! وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بتاؤ میں اس عمر میں کہاں جاؤں۔" یاسمین ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے انتہائی مظلومیت سے بولی تھیں۔
"اوہو، کہیں نہیں جائیں گی آپ۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ ڈیڈی نے ایسا کہا کیوں؟" اریبہ جھنجلائی تھی۔
"تم نے ان سے بائیک کی فرمائش کی تھی؟" یاسمین نے یوں پوچھا جیسے اسی بات کی سزا انہیں مل رہی ہے۔
"او تو ڈیڈی نے اس بات کو ایشو بنایا ہے۔" اریبہ جیسے ساری بات سمجھ گئی۔
"بیٹا! تم یہ ضد چھوڑ دو۔ ورنہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی، میری خاطر بیٹا۔" یاسمین نے اریبہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر منت کی۔
"آپ کی خاطر میں جان دے سکتی ہوں مما! لیکن یہ اب میری ضد ہے کہ میں بائیک ضرور لوں گی اور آپ اس خوف سے نکل آئیں کہ آپ کہیں کی نہیں رہیں گی، کیونکہ آپ اکیلی نہیں ہیں۔ میں، سارہ اور حماد آپ کے ساتھ ہیں۔ ڈیڈی سے کہیے اگر گھر سے نکالنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنی اس موٹی بیوی کو نکالیں۔" اریبہ جذباتی ہو کر بولے جا رہی تھی۔
یاسمین اس کے اسی جذباتی پن سے فائدہ اٹھا کر اسی کے ذریعے توصیف احمد کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتی تھیں اور اکثر کامیاب بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ جسے وہ اپنی کامیابی سمجھتی ہیں، وہ ان کی ہار ہی نہیں، ان کے لیے عذاب بھی ہو سکتی تھی۔ ابھی بھی وہ اریبہ کو منہ سے باز رکھنے کے بجائے مزید اکسا کر اندر ہی اندر خوش ہو رہی تھیں۔
اریبہ نے ان کے کپڑے واپس الماری میں رکھے۔ بیڈ سے سوٹ کیس ہٹایا، پھر انہیں آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔
"کچھ پتا چلا کیا ہوا تھا؟" سارہ نے پوچھا تو وہ بیڈ پر گرتی ہوئی بولی۔
"ڈیڈی کو میرے بائیک چلانے پر غصہ ہے۔"
"ٹھیک تو ہے، تم کیوں ایسی حرکتیں کرتی ہو۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ یا تو لڑکیوں کا بائیک چلانا عام سی بات ہوتی، تب تم بھی اپنا شوق پورا کر لیتیں مگر یہاں تو سرے سے ایسا کوئی ماحول ہی نہیں ہے۔" سارہ نے اسے اچھی خاصی سنا ڈالیں۔
"ماحول، بنانا پڑتا ہے۔ میں چلاؤں گی تو دیکھنا سب میدان میں نکل آئیں گی۔" وہ خلاف توقع آرام سے بولی تھی۔
"ہاں، جیسے سب تمہارے انتظار میں بیٹھی ہیں۔" سارہ سلگ گئی۔
"میرے انتظار میں نہیں، اس انتظار میں کہ کوئی تو پہل کرے اور دیکھو یہ اعزاز میرے حصے میں آئے گا۔" وہ

سارہ کے سلگنے پر ہنس رہی تھی۔
"چھوڑو اس فضول بات کو۔ تمہیں پتا ہے رازی بھائی آ رہے ہیں۔" سارہ نے اچانک یاد آنے پر کہا تو اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔
"تمہیں کیسے پتا؟"
"آج ثنا نے بتایا ہے۔ بہت خوش تھی۔ ہے بھی خوشی کی بات۔ اسی ہفتے آ رہے ہیں رازی بھائی۔ صبح چار بجے کی فلائیٹ ہے۔ چلیں گے ایئرپورٹ مزا آئے گا۔ پتا نہیں، رازی بھائی ہمیں پہچانیں گے بھی کہ نہیں۔" سارہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔
وہ اپنے اندر اٹھتے ابال کو دبانے کی سعی میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سرمائی شام دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی تھی۔ ماحول پر عجیب سی خاموشی اور اداسی چھانے لگی تھی۔ وہ برآمدے میں بیٹھی اس خاموش اداس منظر کا ہی کوئی حصہ لگ رہی تھی۔ اس کا وجود ساکت تھا، بس نظریں بھٹک رہی تھیں۔ کبھی ناریل کے اونچے پیڑ پر، کبھی اس سے اوپر کھلا آسمان جو اس وقت مٹیالا سا ہو رہا تھا۔ پھر اس مٹیالے آسمان پر اس کی نظریں کوئی ستارہ تلاش کرنے لگیں اور اس تلاش میں اچانک اس کا ذہن بھٹک گیا تھا۔
"تمہیں پتا ہے نا میں امریکہ جا رہا ہوں۔"
"جی!" وہ اس وقت ٹین ایجر تھی۔
"دو سال بہت زیادہ نہیں ہوتے اور اب تو یوں بھی لگتا ہے جیسے وقت کو پر لگ گئے ہوں۔ اڑتا چلا جا رہا ہے۔ پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں واپس آ جاؤں گا۔ ہے ناں۔" رازی اسے تسلی دے رہا تھا۔ وہ خاموش تھی۔
"اچھا! یہ بتاؤ، مجھے یاد کرو گی؟" رازی کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کی ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں۔
"تم نروس ہو رہی ہو یا مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟" رازی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ وہ گھبرا کر ہاتھ چھڑانے لگی۔
"کیا کر رہے ہیں، کوئی آ جائے گا۔"
"آنے دو، اب ڈر کس بات کا ہے۔ تم میری ہو چکی ہو۔" رازی اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر مسکرایا تھا۔
"پلیز، میرا ہاتھ چھوڑیں۔" وہ سہمی جا رہی تھی۔
"پہلے بتاؤ تم خوش ہو؟" رازی کو وہ سہمی ہوئی، بہت اچھی لگ رہی تھی۔
"پہلے ہاتھ چھوڑیں، پھر بتاؤں گی۔"
"بے ایمانی تو نہیں کرو گی؟"
"نہیں۔"
رازی نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بھاگ کر دور جا کھڑی ہوئی تھی۔
"نہیں بتاؤ گی۔" رازی نے اپنے چہرے پر خفگی سجا لی تھی۔ اس کی جان پر بن آئی۔ زور زور سے اثبات میں سر ہلاتی چلی گئی تھی۔ وہ مکمل طور پر اس وقت کی گرفت میں تھی کہ سارہ نے لائٹ آن کر کے کہا تھا۔
"تمہیں اندھیرا محسوس نہیں ہو رہا تھا؟"
"اندھیرا!" اس نے چونک کر سارہ کو دیکھا۔ "روشنی ہے تو۔"

"یہ تو میں نے ابھی لائٹ آن کی ہے۔" سارہ اس کے برابر آن بیٹھی اور معنی خیز لہجے میں پوچھنے لگی۔ "کن سوچوں میں گم تھیں؟"

وہ فوری طور پر کوئی بات نہیں بنا سکی تو بات ہی بدل گئی۔

"تمہیں پتا ہے' مما مسز عبید کے ہاں گئی ہیں۔ ان کے ہاں کوئی تقریب ہے۔ میں نے زبردستی مما کو بھیجا تھا۔"

"کیا ضرورت تھی زبردستی بھیجنے کی۔ مجھے مسز عبید بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" سارہ نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"اچھا ہے ناں! مما کا دھیان بٹ جائے گا۔ دوپہر سے ڈیڈی کی باتوں پر کڑھ رہی تھیں۔ ویسے ڈیڈی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بائیک کی ضد میری ہے' مما پر کیوں ناراض ہونے آ گئے۔ میں کل جاؤں گی ڈیڈی کے پاس۔"

"کیوں جاؤ گی۔ انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا' جس پر اتنا شور مچایا جائے۔" سارہ ہمیشہ توصیف احمد کی طرف داری کرتی تھی۔

"میں بھی ڈیڈی سے ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ جل کر بولی اور اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سارہ نے صبح ہی یاسمین سے کہہ دیا تھا کہ وہ کالج کے بعد امینہ پھوپھو کے گھر چلی جائے گی' جس پر یاسمین نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا' کیونکہ سارہ پر ان کا زیادہ بس نہیں چلتا تھا۔ وہ کچھ کہتیں تو الٹا سارہ انہیں سمجھانے بیٹھ جاتی تھی۔ ڈانٹ بھی سنتی' پھر بھی باز نہیں آتی تھی۔ اس لیے یاسمین اسے رشتے داروں کے ہاں آنے جانے پر ٹوکنے سے خود کو باز رکھتی تھیں۔ البتہ اریبہ پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ ماں کے خلاف کوئی بات برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بس جو یاسمین کہہ دیتیں وہی اس کے لیے سچ ہو تا تھا' جس پر سارہ جھنجلاتی اور کڑھتی بھی تھی۔ بہرحال اس وقت وہ چپتی دوپہر میں امینہ پھوپھو کے گھر آئی تھی۔ امینہ اس کی آمد پر خوش تو ہوئیں' ساتھ ٹوکا بھی کہ دوپہر میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

"بس پھوپھو! گھر جا کر پھر کہیں نکلنا ہی نہیں ہوتا' اس لیے میں کالج سے یہیں آ گئی۔"

"اچھا اچھا بیٹھو! اریبہ کیسی ہے؟ حماد اور تمہاری امی۔" امینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔ آپ کیا گھر میں اکیلی ہیں؟" اس نے جواب کے ساتھ پوچھا کیونکہ کہیں بھی کسی کی موجودگی کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"نہیں سمیر ہے البتہ طیبہ اپنے چچا کے ہاں گئی ہے۔ آ جائے گی کچھ دیر میں۔ تم آرام سے بیٹھو۔" امینہ پھوپھو نے طیبہ کے آنے کا یوں کہا کہ کہیں وہ چلی نہ جائے۔

"میں آرام سے ہوں پھوپھو!" وہ ان کی اتنی محبت پر شرمندہ ہونے لگی تھی۔

"لو! میں بھی بیٹھ گئی۔ تم کالج سے آ رہی ہو' بھوک لگ رہی ہو گی۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" امینہ پھوپھو کو فوراً ہی احساس ہو گیا۔ اٹھنے لگی تھیں کہ اس نے روک دیا۔

"اوہو پھوپھو! اتنا تکلف کیوں کر رہی ہیں۔ مجھے جب کھانا ہو گا' میں خود گرم کر لوں گی۔ ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"اچھا.....!" امینہ پھوپھو اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ انہیں جب کوئی بات نہیں سوجھتی تھی تو وہ یونہی محبت سے دیکھا کرتیں۔ بہت مشفق خاتون تھیں۔ سارہ کو ان سے مل کر جہاں سکون ملتا' وہاں دل میں خلش محسوس ہوتی کہ اس کی مما ایسی کیوں نہیں ہیں۔

"سمیر کہاں ہے پھوپھو؟" وہ ان کے مسلسل دیکھنے سے اب کچھ گھبرا گئی تھی۔

"ابھی تو یہیں تھا۔ دیکھو اپنے کمرے میں ہو گا۔" انہوں نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی' پہلے ان کے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اس کے بعد سمیر کے کمرے میں آ گئی۔

"تم اس وقت؟" سمیر نے اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"غلط وقت پر آ گئی ہوں' کیا نہیں آنا چاہیے تھا؟" اس نے قصداً" برا مان کر کہا۔

"ارے کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں تو چاہتا ہوں تم روز روز آؤ۔"

"تم کیوں نہیں آتے؟ ویسے میں جانتی ہوں تمہیں مما کی باتیں بری لگتی ہیں ناں' مجھے بھی اچھا نہیں لگتا جب وہ تمہارے آنے پر ناگواری کا اظہار کرتی ہیں۔ یقین کرو۔ میں اپنے آپ میں گلٹی فیل کرتی ہوں۔" وہ شاید یہی بات خاص طور سے کہنے آئی تھی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں نے کبھی تم سے شکوہ کیا ہے۔ نہیں ناں' پھر تم کیوں ایسا سمجھ رہی ہو۔" سمیر نے ٹوک کر کہا تو وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"کھانا کھایا تم نے؟" سمیر کو خود بھوک کا احساس ہوا تو اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو' پہلے کھانا کھاتے ہیں۔"

"تم پھوپھو کے پاس جاؤ' میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" وہ کہہ کر پہلے کمرے سے نکلی اور کچن کی طرف چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

بالوں میں برش کرتے ہوئے اس کی نظر یونہی سارہ کی طرف اٹھی تھی' پھر وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ پتا نہیں وہ کون سی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تحریر کا عکس جھلک رہا تھا۔ یقیناً" کوئی دل کو چھو لینے والی بات تھی۔

"سنو اریبہ!" سارہ نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر اسے مخاطب کیا تو وہ جو اسے ہی دیکھ رہی تھی' چونک کر اپنا چہرہ آئینے کی طرف موڑ لیا۔

"یہ نظم پڑھی ہے تم نے؟" سارہ نے کتاب پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سنانا بھی مت۔" اس نے تیزی سے کہا اور اسی تیزی سے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

"سنو تو....." سارہ نے کہہ کر نظم پڑھنی شروع کر دی۔ اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ برش رکھ کر وارڈروب کھول لی اور صبح کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔ پھر ایک سوٹ نکال کر اس نے استری کا بٹن آن کیا تھا کہ جیسے سارے سوئچ آن ہو گئے۔

"محبت مشوروں' پند و نصیحت اور تاویلوں کے تابع جو نہیں ہوتی۔
اسے کیا' راستوں میں پھول کتنے' دھول کتنی ہے؟
کسی نازک سمے میں جو ہوئی تھی' بھول کتنی ہے؟
اسے کیا' پھول سے ہاتھوں میں اب تک خار کتنے ہیں؟
یا دشمن گھات میں بیٹھے پس دیوار کتنے ہیں؟
اسے کیا' جاگتی آنکھوں میں پنہاں خواب کیسا ہے؟
اور اس میں وصل کی خاطر کوئی بے تاب کیسا ہے؟

اسے کیا، شام کیسی تلخیِ ایام کیسی ہے؟
اسے کیا، زندگی کس کی کسی کے نام کیسی ہے؟
اسے کیا، چاہتوں میں صورتِ آلام کیسی ہے؟"

"کیسی ہے؟" سارہ اختتام کے بعد اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ گم صم کھڑی تھی۔

"انتہائی بدذوق ہو تم۔ بلکہ میں ہی پاگل ہوں جو تمہیں سنانے بیٹھ گئی۔" سارہ نے کتاب کارنر ٹیبل پر زور سے پٹخی تب وہ چونکی لیکن کہا کچھ نہیں شرٹ پر استری پھیرنے لگی۔ سارہ کچھ دیر اپنے آپ بڑبڑاتی رہی پھر اسے پکار لیا۔

"اریبہ! سنو۔"

"بولتی جاؤ، سن رہی ہوں۔" اس نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی۔

"کیا واقعی صبح ایئرپورٹ جانے کا پروگرام نہیں ہے۔" سارہ نے پوچھا تو وہ یکدم چیخ گئی۔

"نہیں نہیں۔ کتنی بار کہوں، نہیں۔"

"بس ایک بار کافی ہے۔" سارہ چڑ کر پھر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ "میں بھی اب ڈرائیونگ سیکھ لوں گی تاکہ تمہاری محتاجی نہ رہے۔ دیکھنا پھر کہیں آنے جانے کے لیے تم سے پوچھوں گی بھی نہیں۔ اللہ پتا نہیں کیا سوچیں گے رازی بھائی۔"

"میں بتاؤں، کیا سوچے گا۔" وہ استری کا پلگ کھینچ کر سارہ کی طرف گھومی تھی۔

"نہیں، خدا کے لیے تم کچھ مت بتانا۔ میں کل شام میں خود ہی رازی بھائی سے پوچھ لوں گی۔" سارہ نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا پھر اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

"کل شام میں تو چلو گی ناں؟"

"کہاں؟" وہ شاید بھول گئی تھی۔

"وہیں تائی امی کے گھر۔ انہوں نے رازی بھائی کے آنے کی خوشی میں تقریب رکھی ہے۔ آج ثنا کا فون آیا تھا۔ بہت اصرار سے بلایا ہے بلکہ وہ تو کہہ رہی تھی، ہم لوگ جلدی آجائیں۔" سارہ نے اس کے کڑے تیوروں کے باوجود ساری بات بتا ڈالی۔

"دیکھو سارہ! تم جانتی ہو کہ میں منگنی توڑ چکی ہوں۔" وہ بہت ضبط سے بولنا شروع ہوئی تھی کہ سارہ نے ٹوک دیا۔

"منگنی توڑی ہے۔ دوسرا رشتہ تو قائم ہے اور اسے تم تو کیا دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ رازی بھائی ہمارے چچازاد ہیں، رہیں گے۔"

"اسی لیے تو میں تمہیں منع نہیں کرتی۔ تم شوق سے نبھاؤ رشتہ داریاں لیکن مجھے مجبور مت کرو۔ میں صرف اپنی ماں کو مانتی ہوں، کسی دوسرے رشتے کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔"

"میں جانتی ہوں، تمہارا دل سنسان گلی ہے۔" سارہ نے جل کر کہا تھا۔

"ہاں اور اس سنسان گلی میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں حد درجہ کڑواہٹ تھی۔

سارہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

کتنے برسوں بعد حبیب ولا میں زندگی کی رونقیں اتری تھیں۔ ساجدہ بیگم کے بردبار چہرے پر خوشی کا رنگ الگ

سے چھلکتا نظر آرہا تھا۔ ثنا چہکتی پھر رہی تھی۔ بلال سارے انتظامات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کو بھی خوش آمدید کہہ رہا تھا اور وہ اجلال رازی جس کے اعزاز میں یہ خوب صورت ہنگامہ آرائی تھی، وہ اپنے کمرے میں تیاری کے مرحلے خلافِ عادت بہت سستی سے طے کر رہا تھا۔ اصل میں وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اریبہ آئے تو سب میں اسے نہ پا کر ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئے۔ اس لیے اس کا سارا دھیان دروازے کی طرف تھا۔ باہر کسی کا بھی گزر ہوتا، قدموں کی آواز پر وہ چوکنا ہو جاتا اور پھر مایوس۔

"کیا ہو گیا ہے اسے۔ صبح ایئرپورٹ بھی نہیں آئی۔ آخر کس بات پر ناراض ہے؟" وہ ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھلا اور طیبہ اور سارہ اندر آکر ایک ساتھ بولیں۔

"السلام علیکم رازی بھائی!"

"وعلیکم السلام۔" وہ پرسوچ انداز میں باری باری دونوں کو دیکھنے لگا۔

"دیکھا میں نے کہا تھا ناں۔ رازی بھائی ہمیں نہیں پہچانیں گے۔" سارہ نے طیبہ سے کہا تو وہ اس کی آواز اور انداز سے فوراً "سمجھ گیا۔

"کیوں نہیں پہچانوں گا۔ تم سارہ ہو اور یہ طیبہ۔ ویسے کچھ زیادہ بڑی تو نہیں ہوئیں تم دونوں۔ اتنی کی اتنی ہو، جتنی میں چھوڑ کر گیا تھا۔"

"ہائے نہیں۔ اس وقت تو ہم اسکول میں پڑھتی تھیں۔ فراک پہنتی تھیں۔" سارہ نے احتجاجاً" کہا۔

"ہاں بس فراک اور شرٹ کا فرق ہے۔" وہ شرارتاً" مسکرایا پھر طیبہ سے پوچھنے لگا۔ "پھوپھو نہیں آئی ہیں۔"

"جی، آپ چلیں ناں۔ امی بہت بے قرار ہو رہی ہیں آپ سے ملنے کو۔" طیبہ نے کہا تو وہ فوراً" ٹائی درست کر کے ان دونوں کے ساتھ باہر آگیا۔ اور پہلے امینہ پھوپھو سے ملا۔ کتنی دیر وہ اسے سینے سے لگائے دعائیں دیتی رہیں۔ اس کے بعد اس کے ننھیالی رشتہ داروں نے اسے گھیر لیا تھا۔

سارہ، طیبہ کے ساتھ ایک کونے میں آبیٹھی۔ اسے اریبہ پر غصہ آنے لگا تھا۔ اپنے آپ جانے کیسے اس نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ خود ہی جا کر ساجدہ بیگم کو انگوٹھی واپس کر آئی تھی۔

"کتنے اچھے ہو گئے ہیں ناں رازی بھائی!" طیبہ نے پراشتیاق لہجے میں کہا تو اس نے "ہاں" کہنے سے خود کو باز رکھا کیونکہ جانتی تھی کہ ہونٹ کھلنے کے ساتھ سینے میں دبی سانس کو باہر کا راستہ مل جائے گا۔ اس لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ارے ہاں اریبہ اور یاسمین آنٹی نہیں آئیں کیا.....؟" قدرے توقف سے طیبہ نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"خالدہ آنٹی جو آئی ہوئی ہیں۔" اس کی نظریں توصیف احمد کے ساتھ کھڑی خالدہ پر تھیں۔

"اچھا ہاں.....!" طیبہ کچھ سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

سارہ کی نظریں خالدہ سے ہٹ کر اجلال رازی کے ساتھ ساتھ بھٹکنے لگیں پھر اچانک وہ ٹھٹکی تھی کہ جہاں اجلال رازی ہوتا وہاں اس کی ماموں زاد سنبل بھی ضرور موجود ہوتی۔ اب پتا نہیں یہ اتفاق تھا یا سنبل زبردستی رازی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اسے، بہرحال، بہت برا لگا بلکہ عجیب سی جلن بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

"تم دونوں یہاں کونے میں کیوں چھپی بیٹھی ہو۔ طیبہ! جاؤ تمہیں امی بلا رہی ہیں۔" سمیر نے آکر طیبہ کو اٹھا دیا اور اس کی جگہ خود بیٹھ کر سارہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم بجھی بجھی لگ رہی ہو کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں....." وہ کوشش سے بھی نہیں مسکرا سکی۔

"کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے۔" سمیر اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولا تھا۔ وہ جز بز ہونے لگی۔

"اریبہ والی بات سے پریشان ہو ناں؟" سمیر نے قیاس نہیں کیا۔ یقین سے پوچھا تھا۔ اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

"رازی بھائی نے اس سلسلے میں تم سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں، لیکن وہ پوچھیں گے ضرور۔"

"تو اس میں تمہاری کیا غلطی ہے، جو تم پریشان ہو رہی ہو۔ چلو اٹھو، کھانا لگ چکا ہے۔" سمیر زبردستی اسے اٹھا کر کھانے کی ٹیبل کے پاس لے آیا اس کے بعد خود پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ وہ پلیٹ ہاتھوں میں لے کر توصیف احمد کی طرف بڑھنے لگی کہ اچانک اجلال رازی سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"اریبہ کیوں نہیں آئی؟"

"پتا نہیں۔" وہ اپنے آپ میں الجھنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا نہیں ہے۔ سچ بتاؤ، کیا ہوا ہے؟" اجلال رازی کی حد درجہ سنجیدگی سے وہ خائف ہو گئی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں پتا، آپ کو جو پوچھنا ہو، اسی سے پوچھیں۔"

"اس سے بھی پوچھ لوں گا۔ تمہیں بتانے میں کیا اعتراض ہے۔ کیا اس نے منع کیا ہے؟" اجلال رازی ہر صورت جاننا چاہتا تھا۔

"نہیں، اصل میں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" اجلال رازی مشکوک تھا لیکن یقین کرنے پر مجبور بھی۔

"بخار۔ کل سے بخار ہے۔" وہ جھوٹ بولتے ہوئے خود شرمندہ تھی۔

"سچ کہہ رہی ہو یا کوئی اور بات ہے؟" اجلال رازی کی کھوجتی نظروں سے وہ جھنجلا گئی۔

"آپ ایسے کیوں کر رہے ہیں۔ اریبہ اگر نہیں آئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے آپ کو جو کہنا سننا ہو اسی سے کہیے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے پلٹ کر دوسری سمت چلی گئی۔

اجلال رازی مزید الجھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا اس نے یاسمین کے ساتھ بہت خاموشی سے کھایا تھا۔ اس کے بعد چائے بنائی اور کپ لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب اس کا ارادہ روزانہ کی طرح پڑھائی کرنے کا تھا۔ چائے کا کپ بیڈ کارنر پر رکھ کر اس نے اپنی کتابیں اور رجسٹر اٹھایا پھر آرام سے بیٹھ گئی۔ پہلے چائے پی اس کے بعد کتابوں میں سر کھپانے لگی۔ لیکن بہت جلدی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا ذہن یکسو نہیں ہے۔ کہیں ادھر ادھر بھٹک رہا ہے۔ تب اس نے کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں اور موبائل لے کر اپنی دوستوں کو ایس ایم ایس کرنے لگی۔ کیونکہ وہ کچھ اور سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اسی شغل میں خود کو مصروف کر لیا گو کہ جلد ہی اس سے بھی اکتاہٹ ہونے لگی تھی پھر بھی سارہ کے آنے تک اس نے اس مصروفیت کو ترک نہیں کیا تھا۔

سارہ آتے ہی سیدھی واش روم میں چلی گئی تھی اور تقریباً پندرہ منٹ بعد نکلی تھی۔

"یہ اس وقت تم نہا رہی تھیں؟" اس نے سارہ کے گیلے بالوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"بہت تھکن ہو گئی تھی۔ شاور لے کر کچھ سکون ملا ہے۔ اب آرام سے سو سکوں گی۔ ٹائم کیا ہوا ہے۔ اوہ دو بج گئے۔ خیر صبح تو چھٹی ہے۔ دیر تک سو لیں گے۔" سارہ بولتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتی ہے۔ جس کے لیے اسے خود کو تیار کرنا پڑ رہا ہے۔

"ممّا تو سو گئی ہوں گی۔ اب مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ تمہارا اگر ابھی مزید پڑھنے کا ارادہ ہو تو میں دوسرے کمرے میں چلی جاؤں۔" سارہ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا شاید غلطی سے۔

"تمہاری مرضی، ویسے میں کچھ پڑھ نہیں رہی۔" اسے سارہ کی بے کار باتوں سے الجھن ہونے لگی۔

"چلو پھر یہیں سو جاؤں گی۔ تم ڈسٹرب تو نہیں ہو گی ناں۔"

"پہلے تو کبھی تم نے نہیں پوچھا جب دل چاہتا ہے یہاں سو جاتی ہو ابھی کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں کیوں فضول بک بک کر رہی ہو۔ جو کہنا ہے صاف کہو۔" وہ چڑ گئی تھی۔

"رازی بھائی تمہارا پوچھ رہے تھے بلکہ ناراض ہو رہے تھے کہ تم کیوں نہیں آئیں۔" سارہ روانی سے کہہ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تو تم نے کیا کہا...؟" اس کی پیشانی پر شکنیں واضح ہو گئیں۔

"غلط بیانی کرنا پڑی کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" سارہ کا لہجہ ناراضی لیے ہوئے تھا۔

"کیوں غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی۔ صاف کیوں نہیں بتایا کہ میں اس گھر سے کوئی واسطہ، تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" وہ سارہ پر بگڑنے لگی۔

"یہ تم خود ان سے کہہ دینا۔ میری تو ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے تم غلطی کر رہی ہو اریبہ! رازی بھائی ایسے نہیں ہیں جن سے منہ موڑا جائے گا۔ اتنے ہینڈسم اتنے اسمارٹ اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔" سارہ اب سہولت سے بول رہی تھی۔

"لیکن میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔" وہ ہنوز اکڑی ہوئی تھی۔

"میں نہیں مانتی۔ کچھ عرصہ پہلے تک تم ان ہی کے گیت گاتی تھیں۔ دو دن ان کا فون نہیں آتا تھا تو تم کتنی پریشان ہو جاتی تھیں۔ پھر ڈیڈی کی دوسری شادی کا کیا پتا چلا کہ تم رازی بھائی سے ہی اکھڑ گئیں۔ کیوں؟ اس میں رازی بھائی کا کیا قصور؟ انہوں نے تو ڈیڈی کو مشورہ نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس وقت وہ یہیں تھے اور ہماری طرح انہیں بھی ڈیڈی کی دوسری شادی کا پتا نہیں تھا۔" سارہ سلگ کر بولتی چلی جا رہی تھی۔

"کیسے پتا نہیں تھا۔ اسی کی خالہ سے ڈیڈی نے شادی کی اور خود اس کی اماں نے کروائی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رازی کو پتا نہ ہو۔ سب شریک تھے۔ ایک صرف ہم ہی لوگ انجان تھے۔ تم زیادہ ان لوگوں کی چمچہ گیری مت کرو۔ مجھے نفرت ہے رازی سے، اس کے گھر بھر سے۔"

اس کے غصے بھرے لہجے میں نفرت کے ساتھ حقارت بھی تھی۔ سارہ نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنا تکیہ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کی ٹیبل پر ثنا اور بلال ہی بولتے رہے۔ کہیں کہیں ساجدہ بیگم بھی لب کشائی کرتیں لیکن اجلال رازی بالکل خاموش تھا اور اس کی خاموشی ساجدہ بیگم نہ صرف محسوس کر رہی تھیں بلکہ سبب بھی جان رہی تھیں اور اس صورت حال کا تو انہیں پہلے سے اندازہ تھا اور وہ خود کو تیار بھی کرتی رہی تھیں۔ اس کے باوجود اب خود کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔ بار بار اجلال رازی کی طرف دیکھتیں۔ جس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی چھاپ تھی اور آنکھوں میں سوچ..... اس پر ثنا اور بلال کی نوک جھونک کا بھی کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آخر ساجدہ بیگم نے ثنا اور بلال کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا کیونکہ وہ دونوں ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ جبکہ رازی نے اپنے کپ میں مزید چائے انڈیل لی تھی۔ اس لیے ساجدہ بیگم نے بھی وہاں سے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور جب ثنا اور بلال اٹھ کر

چلے گئے، تب وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

"اجلال! کیا بات ہے بیٹا، نیند پوری نہیں ہوئی یا۔" انہوں نے قصداً" بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"یاسمین چچی اور اریبہ رات کیوں نہیں آئی تھیں۔" رازی نے بے معنی گفتگو سے اجتناب کیا اور اصل بات پوچھ لی۔

ساجدہ بیگم کو غالباً" اس کی توقع نہیں تھیں۔ اس لیے چند لمحے اسے دیکھتیں رہیں پھر کہنے لگیں۔

"یاسمین تو بیٹا جب سے اسے توصیف کی دوسری شادی کا پتا چلا ہے، اس نے سب سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"توصیف چچا کی دوسری شادی کوئی نئی بات تو نہیں امی! دس سال تو ہو ہی چکے ہوں گے۔ یاسمین چچی نے اب کیوں اسے ایشو بنایا ہے۔" رازی کے لیے یہ توجیح بے معنی تھی۔

"اسے تو اب ہی پتا چلا ناں۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، چھ آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ بہت واویلا مچایا تھا اس نے پھر اپنے طور پر سب سے قطع تعلق کرکے بیٹھ گئی۔ میرا تو خیر یوں بھی کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ البتہ تمہاری امینہ پھوپھو ایک دوبار گئی تھیں یاسمین کے پاس لیکن اس نے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ تب سے امینہ نے بھی قدم روک لیا۔" ساجدہ بیگم بہت سنبھل سنبھل کر بول رہی تھیں۔ کیونکہ وہ اسے وہ ساری باتیں نہیں بتانا چاہتی تھیں جو یاسمین نے آکر ان سے کہی تھیں اور توصیف احمد کی دوسری شادی کا ذمہ دار انہیں ٹھہراتے ہوئے خوب برا بھلا بھی کہا تھا۔

"اور اریبہ؟ اسے تو آنا چاہیے تھا۔" وہ ساری بات سن کر بولا تھا۔

"ہاں، وہ شاید ماں کی وجہ سے نہیں آئی ہوگی۔" ساجدہ بیگم نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

"نہیں، آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔" رازی ان کے نظریں چرانے پر ٹھٹکا تھا۔ ساجدہ بیگم جزبز ہونے لگیں۔

"بتائیں ناں امی! کیا بات ہے۔ کہیں اریبہ نے بھی تو آپ سے بدتمیزی نہیں کی؟" اس نے اصرار کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں، اس نے بدتمیزی نہیں کی بس وہ منگنی کی انگوٹھی واپس کر گئی تھی۔" ساجدہ بیگم چونکہ اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے اریبہ کی بدتمیزی چھپا گئیں۔

"کیا؟" وہ شاکڈ ہو کر انہیں دیکھے گیا۔

"تم پریشان مت ہو بیٹا! اریبہ نادان ہے، جذباتی ہے۔ وقتی جذبات میں اس نے یہ قدم اٹھا تو لیا لیکن۔" ساجدہ بیگم اسے ڈھنگ سے سمجھا بھی نہیں پا رہی تھیں۔

"آپ نے توصیف چچا سے بات کی؟" وہ بمشکل بولنے کے قابل ہوا تھا۔

"نہیں، میں اگر توصیف سے بات کرتی تو ہو سکتا تھا کہ بیٹی کی ضد سے مجبور ہو کر وہ بھی یہ رشتہ ختم کرنے کا اعلان کر دیتا۔ اس لیے میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب تم آگئے ہو تو تم ہی اس معاملے کو سلجھاؤ۔" ساجدہ بیگم کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی جس سے ظاہر تھا کہ وہ اندر سے کتنی پریشان ہیں۔

"میں ابھی جاتا ہوں اریبہ کے پاس۔ پوچھتا ہوں اس نے یہ حرکت کیوں کی۔" رازی کو اب غصہ آرہا تھا "اور آپ نے بھی حد کر دی، کم از کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔"

"بیٹا! تم پردیس میں پریشان ہوتے......"

"اب تو جیسے بہت خوش ہو رہا ہوں۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" وہ ایک دم کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تو ساجدہ بیگم

مزید پریشان ہو گئیں۔

"آرام سے بیٹا! وہاں بھی آرام سے بات کرنا۔ وہ نادان ہے تم نادانی مت کرنا۔"

"نہیں کروں گا۔ آپ نہ پریشان ہوں جائیں اپنے کمرے میں آرام کریں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ انہیں تسلی دے کر باہر نکل آیا۔

پانچ سالوں میں شہر کافی ترقی کر گیا تھا۔ وہ راستے جو اسے ازبر تھے وہ اب کہیں نہیں تھے۔ جب ہی اسے بہت مشکل پیش آئی۔ بیس منٹ کا فاصلہ تھا لیکن گھر ڈھونڈنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جس سے اس کا موڈ مزید خراب ہو چکا تھا۔ کال بیل کا بٹن چھونے سے پہلے اس نے خود کو تھوڑا ریلیکس کیا پھر بٹن دبایا تو کچھ دیر بعد حماد نے گیٹ کھولا تھا۔

"السلام علیکم رازی بھائی۔ آیئے، اندر آیئے۔" حماد اسے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو پارٹنر!" وہ مسکراتا ہوا اندر آگیا۔ حماد نے گیٹ بند کیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ برآمدے میں آکر وہ رک گیا۔ اسے پتا تھا، سامنے لابی میں دائیں ہاتھ پر اریبہ کا کمرہ ہے۔ لیکن وہ پہلے یاسمین سے ملنا چاہتا تھا۔

"تمہاری مما کہاں ہیں؟" اس نے حماد سے پوچھا۔

"میں بلاتا ہوں مما کو۔" حماد کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کی نظریں لابی میں بھٹکنے لگیں جبکہ دل فوراً" اس تک پہنچنے کی ترغیب دینے لگا تھا۔

"مما! آئیں دیکھیں تو کون آیا ہے۔" حماد کی آواز پر وہ فوراً" سنبھل کر ادھر متوجہ ہوا اور یاسمین کو دیکھ کر مودبانہ سلام کیا۔

"السلام علیکم!"

"تم؟" یاسمین اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگیں بلکہ ایکٹنگ، جس پر وہ جزبز ہو کر بولا۔

"میں اجلال ہوں آنٹی؟"

"اچھا ہاں، کیسے آئے؟" یاسمین نے عادتاً" کیسے آئے کہا تھا۔ لیکن پھر خود ہی گڑبڑا گئیں۔ کیونکہ سامنے اجلال رازی تھا۔ بے پناہ وجیہہ باوقار اور اعلا تعلیم یافتہ۔

"میرا مطلب ہے کب آئے؟" یاسمین نے اپنی بات سنبھالی تھی۔

"جی امریکہ سے تو کل صبح آیا ہوں۔ آپ کو کسی نے نہیں بتایا؟" اس نے بتانے کے ساتھ تعجب کا اظہار کیا۔

"نہیں۔ مجھے کون بتائے گا، خیر چھوڑو، تم آؤ بیٹھو۔ یہاں بیٹھو گے یا۔"

"جی میں پہلے اریبہ کی طبیعت پوچھ لوں۔ رات سارہ بتا رہی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ سہولت سے کہہ گیا تھا۔

"ہاں۔ کچھ حرارت تھی۔ دیکھو اپنے کمرے میں ہوگی۔ میں چائے بھجواتی ہوں۔" یاسمین کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

اس نے چند لمحے رک کر کچھ سوچا پھر مضبوطی سے ایک ایک قدم جماتا اریبہ کے کمرے تک آگیا۔ بس ایک بار ہلکے سے دروازہ پر دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہینڈل گھما کر پورا دروازہ کھول دیا۔

اریبہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر فوراً" پلٹی اور رازی کو دیکھ کر اس کا دل یکبارگی بڑی زور سے دھڑکا تھا لیکن اگلے پل پیشانی پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ جنہیں قصداً" نظر انداز کر کے وہ دلکشی سے مسکرایا اور قدم بڑھا کر اندر آگیا۔

"بڑی بے مروت ہو۔ میں تو سمجھا تھا۔ تم میری واپسی کے دن گن رہی ہوگی اور میرے استقبال کو سب سے پہلے موجود ہوگی۔"

"کیوں کیا تمہیں تمہارے گھر والوں نے نہیں بتایا کہ میں وہ ناتا توڑ چکی ہوں، جس میں دن گننے کا خبط ہوتا ہے۔" وہ فوراً" تنک کر بولی تھی۔

"ہاں ابھی امی نے بتایا کہ تم نے انگوٹھی واپس کر دی تھی۔ میرا تمہارا ناتا اس انگوٹھی کا مرہون منت تو نہیں تھا، جس کے اتار دینے سے ہمارا ناتا ٹوٹ گیا۔ نہیں اریبہ! ہم دل کے رشتے سے بندھے ہیں۔" رازی کا لہجہ جذبات میں بھیگ رہا تھا۔ "میرا تمہارا دل کا ناتا ہے یہ اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا۔"

"دل کا ناتا!" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "میرا دل میرے اپنے اختیار میں ہے۔ رازی اور میں نے اس میں سے ساری کثافتیں دھو ڈالی ہیں۔"

"کثافتیں!" رازی کو شدید دھچکا لگا تھا۔ "مجھے، میری محبت کو تم کثافتوں سے محمول کر رہی ہو۔"

"تم جو بھی سمجھو میں اس پر بحث نہیں کروں گی۔" وہ نروٹھے پن سے کہہ کر رخ موڑنے لگی تھی کہ رازی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ خاصا جارحانہ انداز تھا۔

"بحث نہیں حساب دینا پڑے گا تمہیں۔ میرے رت جگوں کا، میرے ہر اس پل کا جس پر تم قابض رہیں۔ اتنی آسانی سے میں تمہیں نہیں بخشوں گا۔ سمجھیں تم۔"

"رازی.....!" وہ چیخ پڑی۔ "تمہیں مجھ سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میرا بازو چھوڑو۔"

"پہلے میری بات کا جواب دو۔ تم نے کیا سوچ کر انگوٹھی واپس کی اور کیوں۔" وہ سفاکی پر اتر آیا تھا۔

"کیونکہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیوں؟ تم نے اپنے لیے آپ یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ کس بنا پر اگر تم توصیف چچا اور خالدہ آنٹی کی شادی کو ایشو بناؤ تو وہ میں نہیں مانوں گا۔ کیونکہ میرا اس بات سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ہماری منگنی تو توصیف چچا کی شادی کے بعد ہوئی تھی اس وقت تم نے کیوں منع نہیں کر دیا تھا۔" وہ جیسے ساری باتیں ابھی کلیئر کرنا چاہتا تھا۔

"میں تمہارے سامنے صفائیاں پیش کرنے کی پابند نہیں ہوں۔" وہ جھٹکے سے بازو چھڑا کر دور جا کھڑی ہوئی تھی۔

"مت دو صفائیاں لیکن میرا قصور تو بتاؤ۔" وہ زچ ہوا تھا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم ساجدہ بیگم کی اولاد ہو اور ساجدہ بیگم وہ عورت ہے جو....."

"شٹ اپ!" وہ یکدم چیخا تھا۔ "خبردار جو میری ماں کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو۔"

"مجھ سے بھی اپنی ماں پر زیادتی برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے زیادتی کرنے والوں سے سارے ناتے توڑ لیے۔" وہ دوبدو جواب دے رہی تھی۔

"زیادتی میری یا میرے گھر والوں کی طرف سے نہیں ہوئی اریبہ! تم غلط سوچ رہی ہو۔"

وہ اسے جھنجوڑنا چاہتا تھا لیکن وہ مزید کچھ سننے پر تیار ہی نہیں ہوئی تب اس وقت وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔



یاسمین نے اریبہ کا رازی پر چلانا سنا تھا اور اطمینان سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ جبکہ سارہ کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا کیونکہ وہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ رازی اریبہ کو سمجھا لے گا اور تھوڑے گلے شکووں کے بعد دونوں میں دوستی ہو جائے گی۔ لیکن یہاں تو معاملہ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا۔ رازی بھی غصے میں چلا گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے "رازی بھائی، رازی بھائی" پکارتی لپکی بھی تھی لیکن وہ نہیں رکا تھا اور اس وقت اریبہ سے کچھ کہنا فضول تھا۔ کتنی دیر لاؤنج میں ٹہل ٹہل کر وہ خود ہی ہلکان ہوتی رہی پھر یاسمین کے کمرے میں آ گئی۔

"تم اٹھ گئیں، ناشتا کر لیا؟" یاسمین یوں اطمینان سے تھیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"آپ کو پتا ہے مما! رازی بھائی آئے تھے۔" سارہ ان کی بات ان سنی کرتے بولی تھی۔ اس کے لہجے میں حد درجہ تشویش تھی۔

"ہاں مجھ سے ملا تھا۔ خوب نکھر کر آیا ہے امریکہ سے۔ ابھی بیٹھا ہے یا چلا گیا؟" یاسمین اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں پھر بھی اپنا اطمینان قائم رکھا۔

"چلے گئے رازی بھائی اور بہت غصے میں گئے ہیں۔" سارہ رو دینے کو ہو رہی تھی۔

"کیوں؟" یاسمین کی پیشانی پر اب ہلکی سی شکن آئی تھی۔

"اریبہ نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بہت جھگڑ رہی تھی ان سے۔ مما! آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔ وہ بہت غلط کرنے لگی ہے ہر ایک کے ساتھ۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کبھی تائی امی کو برا بھلا کہتی ہے، کبھی پھوپھو کو۔ اس کے برا کہنے سے کوئی برا نہیں ہوگا مما! الٹا ہم لوگ برے بنیں گے۔"

وہ رندھی آواز میں بولے جا رہی تھی۔ یاسمین نے اسے کھینچ کر اپنی بانہوں میں لے لیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کی بیٹی بہت حساس ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ وہ اس کی مرضی کے مطابق پوز کرتی تھیں۔ رنگ بدلنے میں وہ گرگٹ کو بھی مات دے گئی تھیں۔

"بیٹا! تم کیوں دل چھوٹا کر رہی ہو۔ میں سمجھاؤں گی اریبہ کو۔"

"اور مما! اسے یہ بھی اچھی طرح سمجھا دیجیے گا کہ اس کی شادی رازی بھائی سے ہی ہوگی۔" سارہ کو زیادہ دکھ اسی بات کا تھا کہ کہیں سچ مچ یہ رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا! تم پریشان مت ہو۔" یاسمین نے اپنے حساب سے کہا تھا۔ پھر اس کا گال تھپک کر بولیں۔

"جاؤ تم ناشتا واشتا کرو۔ اریبہ سے بھی پوچھ لینا، وہ بھی ابھی اٹھی تھی۔"

"اب تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے مما!" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں پتا نہیں بوا کھانے میں کیا بنا رہی ہیں۔ مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ یاسمین کے کمرے سے نکل آئی اور سیدھی کچن کی طرف جا رہی تھی کہ اریبہ کے تیز بولنے کی آواز سن کر رک گئی۔ اب پتا نہیں وہ کس سے جھگڑ رہی تھی۔

اس نے آواز کی سمت کا تعین کیا پھر بھاگ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ حماد کے ساتھ دو لڑکے، جو غالباً" اس کے دوست تھے سر جھکائے کھڑے تھے اور اریبہ باقاعدہ ان کی کلاس لے رہی تھی۔

"ابھی رزلٹ نہیں آیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم لوگ یہ وقت کھیلنے کودنے اور آوارہ گردی میں گزار دو۔ کتنے دنوں سے میں نوٹ کر رہی ہوں تم لوگوں کی سرگرمیاں۔ تپتی دوپہر میں آخر کہاں جاتے ہو۔ بتاؤ۔ حماد! میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔"

"کہیں نہیں۔" حماد کی آواز شاید اس کے اپنے کانوں نے بھی نہیں سنی ہوگی اور اریبہ کو شاید اسی جواب کی توقع تھی۔

"کہیں نہیں۔ یہ کہیں نہیں کون سی جگہ ہے؟ دیکھو حماد سدھر جاؤ ورنہ میں بہت بری طرح پیش آؤں گی۔ یہ مت سمجھو کہ ڈیڈی یہاں نہیں رہتے تو تم جو مرضی کرتے پھرو گے۔"

"اریبہ.....!" سارہ تیزی سے اریب کے سامنے آگئی کہ کہیں وہ اب ڈیڈی کے خلاف نہ بولنا شروع کر دے۔

"کیا ہے.....؟" اریبہ نے پھاڑ کھانے والے انداز میں اسے گھورا تھا۔

"کسی کا غصہ ان بچوں پر کیوں نکال رہی ہو۔ پتا ہے تمہارے چلانے سے مما کتنی پریشان ہو رہی ہیں۔ چلو اپنے کمرے میں۔" سارہ زبردستی اسے کھینچتی ہوئی اس کے کمرے میں لے آئی تھی۔

"تم خوامخواہ حماد کی طرف داری مت کرنا۔ یہی عمر اسے کنٹرول کرنے کی ہے۔ اگر کسی غلط راستے پر نکل گیا تو سب سے زیادہ تم ہی رووگی۔" اریبہ کا بقیہ نزلہ اس پر گرنے لگا اور اس نے فی الوقت خاموشی ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

☼ ☼ ☼

اجلال رازی آتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ اس کا دماغ بری طرح چیخ رہا تھا۔ اریبہ اس سے اتنی متنفر ہو جائے گی' یہ تو کبھی اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کیسی اجنبی لگ رہی تھی جیسے کبھی اس سے کوئی واسطہ کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ ادھر کچھ مہینوں سے گو کہ وہ ایسی ہی اکھڑی اکھڑی تھی کہ وہ جب فون کرتا تو وہ بہت اکھڑے لہجے میں مختصر بات کرکے سلسلہ منقطع کر دیا کرتی تھی اور کتنی بار یہ بھی کہہ چکی تھی کہ بس اب فون کا سلسلہ بند کرو' میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی اور ایک بار تو اس نے غصے میں ایک ہی بات کہہ کر فون بند کر دیا تھا کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں اور ان ساری باتوں کو وہ اس انداز سے سوچتا تھا کہ وہ اب اس سے دوری سہہ نہیں پا رہی اور یوں ناراضی ظاہر کرکے اسے واپس بلانا چاہتی ہے۔ یوں اس کی خفگی پر بجائے پریشان ہونے کے وہ محظوظ ہوتا رہا تھا۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی اس سے قطع تعلق کا سوچ لے گی۔ وہ بات جس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا' اسے بنیاد بنا کر کیسے اس نے اس کی محبت کو دل سے نکال پھینکا۔ یہ بات اسے ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ ان برسوں میں کوئی ایک دن ایسا نہیں تھا کہ اس نے اریبہ کے بارے میں سوچا نہ ہو۔ اسے خود سے قریب محسوس نہ کیا ہو۔ پھر ہر ہفتے فون پر لمبی گفتگو کرنا۔ تہواروں پر ایک دوسرے کو خوب صورت کارڈ بھیجنا۔ وہ سب ایسا تو نہیں کہ پل میں بھلا دیا جائے۔

"جھوٹی ہے اریبہ' کچھ بھی کرے میری محبت کو دل سے نہیں نکال سکتی۔" وہ بار بار خود کو صرف تسلی نہیں دے رہا تھا بلکہ یقین سے سوچ رہا تھا۔

اور ادھر ساجدہ بیگم کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ رازی جس طرح آتے ہی کمرے میں بند ہو گیا تھا اس سے وہ سمجھ گئی تھیں کہ اریبہ نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا ہو گا جو ان کے ساتھ کیا تھا اور خود انہوں نے تو صبر کر لیا تھا لیکن فی الوقت اسے تو ایسا کچھ نہیں سمجھایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ جانتی تھیں کہ اس کے دل پر کیا گزری ہو گی۔

بہرحال ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ پانچ سال بعد بیٹا گھر لوٹا تھا۔ وہ اس کے آنے پر جتنی خوش تھیں اب اس سے کہیں زیادہ پریشان۔ جبکہ بلال اور ثناء دونوں کو ہی غصہ آ رہا تھا کیونکہ ابھی تو انہوں نے بھائی کے ساتھ جی بھر کر باتیں کرنا تو دور کی بات ٹھیک سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں اپنے دل کی بھڑاس اریبہ کو برا بھلا کہہ کر نکال رہے تھے۔

"مجھے تو خیر وہ شروع ہی سے اچھی نہیں لگتی تھی' ابو نے پتا نہیں کیا سوچ کر رازی بھائی سے رشتہ طے کر دیا تھا۔" ثنا جل کر کہہ رہی تھی۔ بلال نے اس کی تائید کی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں تو اس بات کے حق میں ہی نہیں ہوں کہ یہ رشتہ دوبارہ جوڑا جائے۔"

"ہاں اللہ کرے۔ رازی بھائی بھی منع کر دیں۔ ان کے لیے لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔ میں نے تو جب اریبہ انگوٹھی واپس کر گئی تھی تب سے ہی لڑکیاں دیکھنے شروع کر دی تھیں۔" ثنا کی بات پر ساجدہ بیگم اپنے کسی خیال سے چونکی تھیں۔

"یہ تم دونوں کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ کیا تمہیں بھائی کی خوشی عزیز نہیں ہے۔"

"ہم بھائی کی خوشی ہی تو سوچ رہے ہیں۔ اریبہ سے شادی کرکے تو ان کا بھی وہی حال ہو گا جو توصیف چچا کا ہوا تھا۔" بلال نے ذرا خیال نہیں کیا۔ صاف گوئی سے کہہ دیا تھا۔

"بلال!" ساجدہ بیگم کا غصے سے صرف بلال کہہ دینا ہی کافی تھا۔ وہ اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ثنا جز بز ہونے لگی کیونکہ اس کی بات دل میں رہ گئی تھی۔

"جاؤ چائے بناؤ میں رازی کو اٹھاتی ہوں۔" ساجدہ بیگم نے ثنا پر یوں ظاہر کیا جیسے رازی انہیں بتا کر سویا تھا۔

"بھائی نے دوپہر سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔" ثناء اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں' پوچھتی ہوں۔ کھانا کھائے گا یا چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ۔" ساجدہ بیگم کہتی ہوئی رازی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ دوپہر کے کھانے پر انہوں نے خود ہی اسے نہیں بلوایا تھا۔ اصل میں وہ چاہتی تھیں کہ وہ خود سے باہر آئے لیکن اب سہ پہر ڈھلنے پر بھی وہ کمرے سے نہیں نکلا تھا تو انہیں تشویش ہونے لگی تھی۔ اس کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"رازی! دروازہ کھولو بیٹا۔" ان کی آواز بھی کمزور تھی۔ چند لمحوں بعد ہی رازی نے دروازہ کھول دیا۔ تو اسے دیکھ کر ساجدہ بیگم کا دل پھٹنے لگا۔ کیسا اجڑا اجڑا کھڑا تھا۔

"بیٹا! یہ تم نے کیا حالت بنائی ہے۔ میں مر تو نہیں گئی۔ زندہ کھڑی ہوں ابھی اور میرے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ' تم کیا چاہتے ہو۔"

"کچھ نہیں۔ آپ بیٹھیں۔" وہ کہہ کر واش روم میں چلا گیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر واپس آگیا۔ "سوری امی! میں نے آتے ہی آپ کو پریشان کر دیا۔"

"میں تو کب سے پریشان ہوں۔ یہ بتاؤ کیا کہا یا کمینی نے؟" ساجدہ بیگم کو اب جاننے کی جلدی ہو رہی تھی۔

"ان سے میری زیادہ بات نہیں ہوئی اور اریبہ وہی کہتی رہی کہ اس نے منگنی توڑ دی ہے۔" رازی نے مختصراً بتایا۔

"ایسے کیسے منگنی ٹوٹ جائے گی۔ میں ابھی جاتی ہوں توصیف کے پاس اور منگنی چھوڑ شادی ہی طے کر آتی ہوں۔ توصیف میری بات نہیں ٹالے گا۔ بیٹی کو بھی سنبھالے گا۔" ساجدہ بیگم تو اس وقت اس کی اجڑی صورت نے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ تحمل کا دامن کبھی نہیں چھوڑتی تھیں۔

"نہیں امی! مجھے اس طرح زور زبردستی سے شادی نہیں کرنی۔ یوں بھی ابھی اریبہ پڑھ رہی ہے۔ اس کا میڈیکل کمپلیٹ ہو جائے پھر دیکھیں گے۔" وہ اس وقت سے جانے کیا کچھ سوچ چکا تھا' اس لیے اس نے ساجدہ بیگم کو کسی بھی کارروائی سے روک دیا۔

"تو اتنا عرصہ تم یونہی پریشان رہو گے۔" ساجدہ بیگم نے اس کی ناگفتہ بہ حالت کو جتایا۔

"میں پریشان نہیں ہوں امی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں' دو چار دن آرام کروں گا پھر ان شاء اللہ ابو کا بزنس سنبھالوں گا۔" رازی کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے ماں کتنی پریشان ہے۔ بے اختیار ان کے گلے لگ گیا۔

"جیتے رہو۔ اللہ تمہیں بہت خوشیاں دکھائے۔" ساجدہ بیگم کی آواز بھرا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

توصیف احمد صبح کہہ گئے تھے کہ شام میں وہ جلدی آجائیں گے پھر بچوں کو کہیں گھمانے لے جائیں گے۔ اس لیے خالدہ نے ہما اور فہد کو جلدی ہوم ورک کرا دیا تھا۔ پھر انہیں تیار کرکے خود بھی تیار ہو گئی۔ پانچ بج رہے تھے۔ توصیف احمد آنے ہی والے تھے اور کیونکہ آفس سے آکر وہ ایک کپ چائے ضرور پیتے تھے اس لیے خالدہ ہما اور فہد کو آرام سے کھیلنے کی تاکید کرکے خود کچن میں چلی آئی اور ابھی چولہے پر چائے کا پانی رکھا ہی تھا کہ گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔ خالدہ نے کچن کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ ملازم بھاگ کر گیٹ کھول رہا تھا۔ خالدہ جلدی جلدی ٹرے میں ٹی پاٹ اور کپ رکھنے لگی۔ پھر چولہا تیز کرکے کھڑکی سے دیکھا اور توصیف احمد کے بجائے اریبہ کو آتے دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ کہیں وہ پھر تو بائیک پر نہیں آگئی۔ اس روز اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک توصیف احمد کا موڈ خراب رہا تھا۔

"اب پتا نہیں کیا ڈیمانڈ لے کر آئی ہے۔" خالدہ نے ناگواری سے سوچا اور چولہا دھیما کرکے کچن سے نکل آئی۔ اریبہ لاؤنج میں آچکی تھی۔ خالدہ کو دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

"ڈیڈی آفس سے نہیں آئے؟"

"نہیں....." خالدہ نا چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھنے لگی۔ بلیک جینز پر پنک ٹی شرٹ میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہی تھی۔

"کب تک آجائیں گے۔ آئی مین مجھے زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑے گا۔" اریبہ کا انداز اس کے لیے ذرا فکر والا تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" خالدہ نے جان بوجھ کر نہیں بتایا کہ توصیف احمد ابھی آنے والے ہیں۔

"اور وہ دونوں کہاں ہیں ہما اور فہد۔" اریبہ نے خود کو صوفے پر گراتے ہوئے پوچھا۔ خالدہ اسے جواب دینے کے بجائے بچوں کو پکارنے لگی تو وہ دونوں بھاگتے ہوئے آگئے۔

"ڈیڈی آگئے مما.....؟" فہد نے آتے ہی خالدہ سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! تمہاری آنٹی آئی ہیں۔" خالدہ کے منہ سے بلا ارادہ ہی اس کے لیے آنٹی نکل گیا تھا۔

"آنٹی....." اریبہ سلگ گئی۔ "میں کس حساب سے ان کی آنٹی ہو گئی۔"

"سوری بیٹا' یہ تمہاری باجی ہیں۔" خالدہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھیں۔

"مجھے پتا ہے مما یہ اریبہ باجی ہیں۔" فہد نے کہا تو ہما بھی فوراً بولی تھی۔

"مجھے بھی پتا ہے۔"

"پتا ہے تو آکر سلام کرو۔ تمہیں یہ سب نہیں سکھایا گیا۔" اریبہ نے درحقیقت خالدہ کو سنایا تھا۔

"جاؤ بیٹا.....!" خالدہ دونوں بچوں کو اس کے پاس جانے کا اشارہ کرکے واپس کچن میں آگئی۔ چولہے پر پانی کھول رہا تھا۔ وہ ٹی پاٹ میں چائے دم کرکے وہیں کھڑی رہی اور جب توصیف احمد آگئے تب ٹرے اٹھا کر لاؤنج میں آگئی۔ توصیف احمد اریبہ سے پوچھ رہے تھے۔

"سب ٹھیک ہیں بیٹا!"

"جی' سب ٹھیک ہیں' بس میں ٹھیک نہیں ہوں۔" اریبہ نے روٹھے انداز میں کہا تھا۔ توصیف احمد نے ایک نظر تیار کھڑی خالدہ کو دیکھا پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے۔ کوئی مسئلہ ہے؟"

"میں نے آپ کو اپنا مسئلہ بتایا تو تھا کہ میں کالج سے لیٹ ہو جاتی ہوں۔ ٹریفک کی وجہ سے۔ آپ پلیز مجھے بائیک دلا دیں۔" اریبہ نے بظاہر منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"بیٹا! یہ آپ کی فرمائش ہے یا ضد جو بھی ہے بالکل غلط ہے۔ آخر وہ اسٹوڈنٹس بھی تو وقت پر کالج پہنچ جاتے ہیں جو بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ پھر آپ کے پاس تو گاڑی ہے۔ آئی ایم سوری میں آپ کی یہ ضد پوری نہیں کر سکتا اور نہ ہی میں آپ کو اس کی اجازت دوں گا۔" توصیف احمد بہت ضبط سے ٹھہر ٹھہر کر بولے تھے۔

اریبہ چند لمحے اپنے ناخن دیکھتی رہی پھر ایک دم اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑی۔

"اریبہ واپس آؤ۔" توصیف احمد نے پکار کر کہا لیکن وہ ان سنی کرکے باہر نکل گئی تھی۔

"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" خالدہ نے محض اریبہ کی طرف سے ان کا دھیان ہٹانے کی خاطر چائے کا کپ اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ چائے واقعی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ توصیف احمد نے ایک گھونٹ لے کر کپ ٹرے میں رکھ دیا پھر صرف ہما اور فہد کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے ورنہ ان کا موڈ بدل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

زمین پر ہے مگر آسمان جیسی ہے
وہ نرم نرم سی لڑکی چٹان جیسی ہے

سمیر نے عقب سے سارہ کے گھٹنوں پر کھلی کتاب میں جھانک کر اونچی آواز میں شعر پڑھا تھا۔ سارہ نے مسکرانے کا جیسے تکلف کیا پھر کتاب بند کرکے دھیرے سے بولی تھی۔

"ایسے چپکے سے آجاتے ہو پتا ہی نہیں چلتا۔"

"اتنی گہری خاموشی جو چھائی ہے۔ مجھے اپنے قدموں کی آواز سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ کیا گھر میں کوئی نہیں ہے؟" سمیر بولتا ہوا اس کے سامنے آگیا۔

"میں ہوں اور بوا ہیں۔ چائے پیو گے؟" سارہ کو خالہ بوا کے ساتھ ہی چائے کا خیال بھی آگیا تھا۔

"کیا فوراً بھگانے کا ارادہ ہے۔" سمیر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں اتنی جلدی بھاگنے والا نہیں ہوں اور ابھی تو فراغت سے آیا ہوں۔"

"کیوں تمہارے امتحان ہو گئے کیا۔" سارہ نے فراغت کا مطلب یہی لیا تھا۔

"نہیں ابھی تو شروع بھی نہیں ہوئے۔ ایک مہینہ پڑا ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

"صرف ایک مہینہ سال نہیں جو تم اتنے اطمینان سے پھر رہے ہو۔ پتا ہے پھوپھو تم سے کتنی امیدیں لگائے بیٹھی ہیں۔" سارہ نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"پتا ہے اور میں نے کب انہیں مایوس کیا ہے۔ اپنی عمر سے دو سال آگے جا رہا ہوں۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ بلال میرے برابر ہے ناں لیکن مجھ سے دو سال پیچھے ہے۔" سمیر نے فوراً بلال سے موازنہ کرکے ثابت بھی کر دیا تو وہ جھنجلا گئی۔

"اوہو! تمہیں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔"

"یوں کھولا جواب ہو گئی ہو۔" وہ ہنسا پھر اچانک خیال آنے پر کہنے لگا۔ "اریبہ تو آج کل بہت خوش ہو گی' رازی بھائی جو آگئے ہیں۔ یار اب جلدی ان کی شادی ہونی چاہیے۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔"

"ہوں!" وہ اس موضوع سے بچنے کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں بوا سے چائے کا کہہ آؤں۔"

"میں کہتا ہوا آیا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔" سمیر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس بٹھا دیا اور اس کے چہرے پر نظریں جما کر

پوچھنے لگا۔ "سنو یہ اریبہ اور رازی بھائی کا کیا معاملہ ہے۔"

"کیسا معاملہ....." وہ اندر سے خائف ہو گئی تھی۔

"انجان مت بنو سارہ! مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔ میں نے اس روز رازی بھائی کو بہت پریشان دیکھا تھا اور ادھر کچھ عرصے سے اریبہ بھی عجیب و غریب حرکتیں کر رہی ہے۔ اس سے میں تو یہی سمجھ پایا ہوں کہ ان دونوں کا معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ہے ناں۔" سمیر نے ساری بات کہہ کر اس سے تصدیق چاہی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید تھک گئی تھی۔

"بتاؤ گی نہیں۔" سمیر کے لہجے میں دوستی کا مان تھا۔

"میں نہیں بتاؤں گی تب بھی سب کو پتا تو چل ہی جانا ہے۔ چھپنے والی بات تو نہیں ہے۔" وہ آزردگی میں گھر گئی تھی۔ "اصل میں اریبہ کو تائی امی پر غصہ ہے کہ انہوں نے ڈیڈی کی شادی اپنی بہن سے کرادی۔ جب تک یہ شادی راز رہی تب تک تو اریبہ خوش تھی۔ لیکن پھر جیسے ہی راز فاش ہوا اریبہ نے رازی بھائی سے ناتا توڑ لیا۔ ان کے آنے سے پہلے ہی وہ منگنی کی انگوٹھی تائی امی کو واپس کر آئی تھی۔"

"پاگل ہے کیا۔ اس میں رازی بھائی کا کیا قصور؟" سمیر ساری بات سن کر یکدم جذباتی ہو گیا تھا۔

"یہی میں اس سے کہتی ہوں اور رازی بھائی نے بھی یہی کہا لیکن وہ مان ہی نہیں رہی۔" وہ مایوسی سے بولی تھی۔

"اور رازی بھائی اب کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کا کیا ارادہ ہے۔" سمیر نے پوچھا۔ اسی لمحے بوا چائے لے کر آگئیں اور خاموشی سے دونوں کو مگ تھما کر ان ہی پیروں واپس پلٹ گئیں۔ سمیر نے فوراً" چائے کا گھونٹ لیا پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"ہاں میں کیا کہہ رہا تھا۔"

"تم رازی بھائی کا ارادہ پوچھ رہے تھے۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔ کیونکہ اس روز وہ اتنے غصے میں گئے تھے کہ پھر میری ہمت ہی نہیں ہوئی ان کے پاس جانے یا انہیں فون کرنے کی۔" وہ حد درجہ دل گرفتہ لگ رہی تھی۔ سمیر کچھ دیر پر سوچ انداز میں اسے دیکھتا رہا پھر پوچھنے لگا۔

"توصیف ماموں نے کچھ نہیں کہا اریبہ سے؟"

"ڈیڈی کو کچھ نہیں پتا، شاید تائی امی نے کسی کو نہیں بتایا۔ لیکن اب تو ظاہر ہے بات کھل ہی جائے گی۔ پھر دیکھو ڈیڈی کیا کرتے ہیں۔"

"اچھا تو تم کیوں اتنی ڈس ہارٹ ہو رہی ہو۔ ٹھیک ہو جائے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سمیر اسے تسلی دینے لگا تب ہی اریبہ آگئی۔ بس ایک لحظہ کو رکی' اگلے پل سمیر کے سر پر پہنچ کر کڑے تیوروں سے پوچھنے لگی۔

"تم کب آئے؟"

"کافی دیر ہوئی....." سمیر اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کافی دیر ہوئی۔ یعنی یہ جاننے کے باوجود کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ سارہ اکیلی ہے۔ تم بیٹھ گئے۔" اریبہ کی بات پر سارہ چکرا گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو اریبہ۔ میں اکیلی نہیں بوا بھی موجود ہیں۔"

"بوا اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ انہیں کیا پتا تم لوگ کیا کر رہے ہو۔" اریبہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ مارے توہین کے سمیر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک نظر سناٹے میں کھڑی سارہ کو دیکھا پھر تیز قدموں سے چلا گیا تھا۔

"تم اندر چلو۔" اریبہ نے سارہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ تب ایک دم سارہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چیخ پڑی۔

"تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم گھر آئے مہمان کی بے عزتی کرو اور تم نے اتنی گھٹیا بات کہی کیسے؟"

"بس زیادہ آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ جب دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے کیا۔" اریبہ کو جانے اسی بات کا غصہ تھا یا کہیں اور کا غصہ یہاں نکل رہا تھا۔

"اس کے ماموں کا گھر ہے۔ آئے گا وہ اور سب آئیں گے۔ تم اگر کسی سے نہیں ملنا چاہتیں مت ملو۔ مجھے تم نہیں روک سکتیں۔" سارہ نے اس وقت سارے لحاظ بھلا دیے تھے۔

اریبہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وارڈ روب کھول کر ایک سوٹ نکالا اور واش روم میں بند ہو گئی۔ سارہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ ایک طرف توہین کا احساس دوسری طرف ندامت کہ کیا سوچے گا سمیر۔



اجلال رازی نے بس تین دن آرام کیا تھا۔ اس کے بعد اپنے مرحوم والد حبیب احمد کا بزنس سنبھال لیا۔ اب تک یہ بزنس توصیف احمد کی نگرانی میں چل رہا تھا اور چونکہ وہ بھی اسے زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے اس لیے منیجر عنایت اللہ کے رحم و کرم پر تھا۔ بس یہ تھا کہ حبیب احمد کی بنائی ہوئی فرم قائم تھی۔ اگر نفع نہیں تو نقصان بھی نہیں۔ یوں اجلال رازی کو نئے سرے سے تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ گو کہ وہ بڑے پلان بنا کر آیا تھا۔ لیکن فوری طور پر عمل ممکن نہیں تھا۔ پہلے تو اسے گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنا تھا اس کے بعد وہ اپنے پلان پر عمل کر سکتا تھا۔ یوں اس نے اپنے مرحوم والد کی کرسی سنبھال لی اور یہ تو اسے کرنا ہی تھا۔ لیکن اتنی جلدی بزنس کے بکھیڑوں میں الجھنے کا اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ کچھ دن اپنی زندگی انجوائے کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ جانے کیا کچھ سوچ کر آیا تھا۔ لیکن یہاں آ کے اریبہ نے اس کے سارے خواب کن حالات کو اس بری طرح روندا تھا کہ وہ توانا مرد چکرا کر رہ گیا تھا۔ مگر اس کے اندر کیونکہ اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائی کا احساس تھا' اس لیے ان کی خاطر اس نے فوراً" خود کو سنبھال لیا تھا اور کام سے بھی لگ گیا۔ یہ اس کی مجبوری بھی تھی' کیونکہ جہاں وہ فارغ بیٹھتا اسے اریبہ اور اس کی زیادتی یاد آنے لگتی۔

پھر وہ اسی نہج پر سوچتا چلا جاتا کہ اریبہ کو کیسے سمجھائے۔ اسے کیسے یقین دلائے کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ اس کی خاطر دیار غیر کی رنگینیوں میں اس نے خود کو کتنا پابند رکھا' صرف اس لیے کہ کہیں اریبہ تک کوئی ایسی بات نہ پہنچ جائے جس سے اس کا دل ٹوٹے اور وہ کتنی سنگدلی سے اس کے دل کے ٹکڑے کر گئی تھی۔ وہ اس روز سے ان ٹکڑوں کو سمیٹنے میں لگا ہوا تھا' لیکن کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا' اس لیے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ صبح آفس کے لیے نکلتا تو واپسی میں رات ہو جاتی اور ساجدہ بیگم بجائے اطمینان سے ہونے کے مزید پریشان ہو گئی تھیں' کیونکہ وہ ماں تھیں۔ جانتی تھیں کہ رازی خود سے فرار کی خاطر مصروفیت میں پناہیں ڈھونڈ رہا ہے اور یہ پناہیں اسے مزید تھکا رہی تھیں۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتیں جس پر محبت کی بے حرمتی کا دکھ واضح نظر آتا تھا۔ تب ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ اس وقت وہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ ان کی نظریں وال کلاک پر تھیں۔ جب ثنا آ کر پوچھنے لگی۔

"امی کھانا لگا دوں؟"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)

وہ ایک شخص کہ جس سے شکایتیں تھیں بہت
وہی عزیز، اسی سے محبتیں تھیں بہت

وہ جب ملا تو دلوں میں کوئی طلب ہی نہ تھی
بچھڑ گیا تو ہماری ضرورتیں تھیں بہت

ہر اک موڑ پہ ہم ٹوٹتے بکھرتے رہے
ہماری روح میں پنہاں قیامتیں تھیں بہت

پہنچ گئے سرِ منزل تیری تمنا میں
اگرچہ راہ کٹھن تھی صعوبتیں تھیں بہت

وہ یوں ملا ہے کہ جیسے کبھی ملا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت

ہمیں خود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

ہمارے بعد ہوا اس گلی میں سناٹا
ہمارے دم سے ہی ناصر حکایتیں تھیں بہت

ناصر زیدی

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب
زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

ہم نگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
کم نگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے

کاش اے ابرِ بہاری اتیرے بہکے سے قدم
میری امید کے صحرا میں بھی گاہے جاتے

ہم بھی کیوں دہر کی رفتار سے ہوتے پامال
ہم بھی ہر لغزشِ مستی کو سراہے جاتے

دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غمِ ہستی سے نباہے جاتے

شان الحق حقی

کہیں سے کوئی روشنی، کہیں سے کوئی راگنی

ستم، الم کے زخم سب
فریب خوردہ شہر کے
نصیب میں لکھے گئے
ہر ایک رنگ خارزار جبر
میں اگا ہوا
لہو میں تر، عذاب جاں کی سند بنا ہوا
ہر ایک در ہے وحشتوں کی مہر سے ڈھکا ہوا
ہر ایک لب شگفتگی کی رونقوں سے ہے تہی
ہر ایک آنکھ سیلِ اشک کی خبر بنی ہوئی
یہ جنگلوں کا ماجرا، درندگی کی داستاں
یہ خون کی لو، یہ وحشتوں کی قہرناک داستاں
حیاتِ آدمی کی ہر روش رفت پر کمند ہے
کہاں ہے پیار کی دھنک، خوشی کی دل ربا کھنک
کہاں ہے وہ تمدنوں کے عطر کی جواں مہک
جو آدمی کے بے بہا سفر کی کائنات ہے
یہ کائنات حسن ہے، یہ کائنات عشق ہے
یہ چاہتوں کے سائباں کی نرم میٹھی چھاؤں ہے
یہ سائباں جلے نہ یوں، یہ چھاؤں تا ابد رہے
کہیں سے کوئی روشنی، کہیں سے کوئی راگنی
اُمڈ کے آئے اور
ملال کی رگوں سے کلفتیں نچوڑ لے
فریب خوردہ شہر کو صلیب سے اُتار لے

احفاظ الرحمن

تنہائی کی اذیت جھیلی
کوئی نہیں تھا پاس سہیلی

اُس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا
میں نے آگے کر دی ہتھیلی

اپنے چاند سے چھپ کر ملنے
رات چلی ہے سج کے اکیلی

تیرے لمس کو چھو کے جاناں
آج ہوئی میں نئی نویلی

شہرت خاطر چھوڑے اُس نے
پیارے رشتے سنگی بیلی

تیرے وعدے کا رنگ اُترا
ابھی پڑی ہے بارش پہلی

اے دل اُس سے مل آتے ہیں
سماں سہانا شام روپہلی

اُمِ ثمامہ

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت کب آئے گی؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو نے قیامت کے لیے کیا تیار کیا؟"

وہ بولا "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت رکھے۔"

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ "ہم اسلام لانے کے بعد کسی چیز سے اتنا خوش نہیں ہوئے جتنا اس حدیث کے سننے کے بعد ہوئے۔"

(مسلم)

سنہری باتیں

- کبھی کسی کو اپنی صفائی مت دو کیونکہ جو آپ سے پیار کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں اور جو نفرت کرتا ہے وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

- ہر شخص کو اتنی اہمیت دو جتنی وہ تم کو دیتا ہے اگر ضرورت سے کم اہمیت دو گے تو مغرور کہلاؤ گے۔ ضرورت سے زیادہ دو گے تو اپنی نظروں میں گر جاؤ گے۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

- ہماری خوشیاں ہی رخصت ہو کر ہمیں غم دے جاتی ہیں۔ جتنی بڑی خوشی اتنا بڑا غم۔ غم، خوشی چھن جانے کا نام ہے۔

(واصف علی واصف)

سدرہ وزیر۔ خوشاب (پیل)

خوشنودی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔

"اے مالک! جب تو خوش ہوتا ہے تو کیا کام کرتا ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جب میں خوش ہوتا ہوں تو بارش برساتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا۔ "جب تو دوبارہ خوش ہو تو؟"

فرمایا۔ "تو میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر عرض کی۔

"اے مالک دو جہاں! تو جب سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "پھر میں مہمان بھیجتا ہوں۔"

ناہید نور الٰہی۔ کراچی

قیمت

ایک مرتبہ ایک دیہاتی اپنے گدھے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اس کو ایک ہار ملا۔ دیہاتی نے ہار اٹھا لیا اور سوچا کہ کیوں نہ میں یہ ہار اپنے گدھے کو ہی پہنا دوں۔ چنانچہ اس نے ہار گدھے کو ہی پہنا دیا۔ اتفاق سے ایک جوہری کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے جو اتنے قیمتی الماس کا ہار گدھے کی گردن میں دیکھا تو فوراً دیہاتی سے بولا۔

"بھائی صاحب! کیا آپ اس ہار کو فروخت کریں گے؟"

دیہاتی یہ سن کر بہت خوش ہوا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

"مجھے تو مفت میں ہی ہار ملا ہے۔ چلو میں اپنے پیسے ہی کھرے کر لیتا ہوں۔"

دیہاتی نے جوہری کو جواب دیا۔ "جی ہاں میں یہ ہار فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی قیمت ایک ہزار اشرفی ہے۔"

جوہری بہت چالاک تھا۔ قیمت سن کر کہنے لگا۔

"ایک ہزار تو نہیں میں تمہیں پانچ سو اشرفیاں دوں گا۔"

جوہری کے یہ کہتے ہی ہار ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ جوہری بہت حیران ہوا۔ اس نے ان الماس کے ذرّوں سے سوال کیا۔

"تم کیوں بکھر گئے ہو؟"

الماس کے ذرّوں نے بہت دکھ سے کہا۔ "یہ تو ایک دیہاتی تھا، کم عقل جاہل۔ اس کو میری اوقات کا علم نہیں تھا۔ لیکن تم تو جوہری ہو جب تم نے سب جانتے ہوئے میری قیمت اتنی گرا دی تو کیا میں پھر بھی ثابت رہ سکتا تھا؟"

صبا افضل بٹ۔ رینالہ خورد

حفاظتی بیلٹ

موٹر وے پولیس نے کار چلاتے ایک شخص کو روک کر کہا۔

"آپ بیلٹ باندھ کر کار چلا رہے ہیں، اس لیے آپ کو ایک ہزار روپے انعام میں دیے جاتے ہیں۔ آپ اس انعام کا کیا کریں گے؟"

اس شخص نے خوشی اور اطمینان سے جواب دیا۔

"میں اس انعام سے اپنا ڈرائیونگ لائسنس بنواؤں گا۔"

ساتھ والی سیٹ سے اس کی ماں بولی "اس کی بات کا یقین مت کرنا۔ یہ شراب پی کر فضول بولنے لگتا ہے۔"

اس کا باپ نیند سے جاگا اور پولیس والے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"مجھے پتا تھا کہ چوری کی کار میں ہم زیادہ دور نہیں جا سکتے۔"

اچانک ڈگی سے آواز آئی "بھائی! ہم نے بارڈر پار کر لیا؟"

لائبہ، ایمن۔ آزاد کشمیر

آئینہ

باتیں کرتے ہوئے ہاتھ چلانا یا مافی الضمیر کو زبان کے بجائے ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے بیان کرنے کی زیادہ کوشش کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا شخص بڑا چال باز، جعل ساز، ابن الوقت، موقع شناس، مطلب پرست، حیلہ جو، خود پرست اور ریاکار ہے۔ ٹی وی نے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ اس آئینے میں آپ بہت سے سیاست دانوں کو پہچان سکتے ہیں۔

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

خوش فہمی

ایک مرتبہ کسی ملک کے بادشاہ نے ایک چھوٹے افسر کو امتیازی نشان عطا کیا تو اس نے نہایت انکساری سے بادشاہ سے کہا۔

"جہاں پناہ! میں خود کو اس کا حق دار نہیں سمجھتا۔ یہ تمغہ میں صرف میدان جنگ میں کارنامہ دکھا کر ہی وصول کر سکتا ہوں۔"

فوجی افسر کو توقع تھی کہ بادشاہ اس کا جواب سن کر خوش ہوگا اور اسے مزید انعام و اکرام سے نوازے گا۔ یا کم از کم تحسین کے کلمات تو کہے گا لیکن اس کی توقع کے برخلاف بادشاہ نے کہا۔

"عجیب احمق آدمی ہو۔ کیا تمہاری خواہش کی خاطر میں جنگ چھیڑ دوں؟"

صائمہ جیمی۔ کراچی

سردار جی

ایک سردار سے کسی نے پوچھا "سردار جی! عقل بڑی یا بھینس؟"

سردار جی نے پگڑی اتار کر ذرا سا سر کھجایا پھر بولے۔

"پہلے تاریخ پیدائش تو بتاؤ۔"
رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

جزا،

عشق قاتل سے بھی، مقتول سے ہمدرد بھی
یہ بتا، کس سے محبت کی جزا مانگے گا
سجدہ خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عقیدت کا صلہ مانگے گا

انیقہ اناب۔ چکوال

برسات،

ہم سے کیسے درد کے قصے
ہم سے کیسے رنج کی بات
ہم پر بیتے کیا کیا موسم
تنہا دل، لاکھوں آفات
آج ہی دل کچھ ٹھہرا تھا
اور آج ہی آنکھیں خشک سی تھیں
آج ہی ظالم ٹوٹ کے برسی
موسم کی پہلی برسات

پارس بلوچ۔ ڈہرکی

معقول وجہ،

ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا۔
"آپ نے اپنے بیٹے کو وکیل بنانے کا فیصلہ کیا سوچ کر کیا؟"
"بھئی وہ بچپن سے ہی بہت جھگڑالو تھا۔ بہت بحث کرتا تھا۔ اپنا کام نکلوانے کے لیے عجیب عجیب دلیلیں ڈھونڈ کر لے آتا تھا۔ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی کمزوریاں نکال لاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اسے ان کاموں کا معاوضہ بھی ملنے لگے۔" دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عائشہ۔ تحریم۔ گوجرہ

پہچان،

ایک قوم کبھی بھی اپنے اشخاص کی موت کی وجہ سے ختم نہیں ہوتی لیکن یہ ختم ہوتی ہے جب اس کے نوجوان اپنی پہچان بھول جاتے ہیں۔

(ہٹلر)

مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ

سوال،

ہر برس اے وطن تجھ سے عہدِ تجدیدِ وفا کرتے ہیں
یہ الگ بات کہ ان میں سے کتنے عہد نبھائے ہم نے

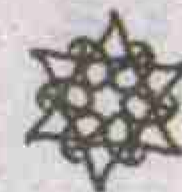
آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

ستم ظریفی،

دیہاتی نوجوان نے شہر آکر کچھ پیسے کما لیے تو باپ کو گھمانے پھرانے کے لیے شہر بلوایا۔ دن بھر خوب سیر کرانے کے بعد نوجوان نے باپ کو مزید مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے کرائے کے اپنے چھوٹے اور معمولی کمرے میں ٹھہرانے کے بجائے ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ ہوٹل کے ہر کمرے کے ساتھ ایک عمدہ اٹیچ باتھ بھی تھا۔

صبح بیٹا باپ سے ملنے ہوٹل پہنچا تو دادِ طلب لہجے میں بولا۔
"کمرا کیسا ہے ابا جی! رات تو آرام سے گزری نا؟"
"کمرا تو بہت اچھا ہے برخوردار۔ بستر بھی اچھا ہے۔" باپ نے جماہیاں لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بڑی مشکل تھی۔ غسل خانے کا رستہ میرے کمرے سے ہو کر گزرتا تھا۔ میں بس اسی خیال سے ساری رات جاگتا رہا کہ کسی دوسرے مسافر کو حاجت ہو یا اس کا نہانے کا ارادہ ہو تو وہ آکر میرے کمرے کا دروازہ بجا دے گا۔"

آسیہ جاویدہ۔ علی پور چٹھہ



امت الصبور

مشعال چوہدری کی ڈائری سے

اس دورِ پُر آشوب میں بے شمار لوگ نظر آتے ہیں زندگی سے تھکے ہوئے، مصائب و آلام کے مارے ہوئے۔ دل میں خواہش ابھرتی ہے کہ ان کے دکھوں کا مداوا کر سکیں لیکن کر نہیں پاتے۔ یہی بے بسی کو فرحت عباس شاہ نے بیان کیا ہے۔

کتنا بے بس کر دیتے ہو
مجھے کوئی رنگ دیا ہوتا
میں انہیں بے رنگ آنکھوں میں بھرتا
مجھے کوئی چہرہ دیا ہوتا
میں انہیں بے چہروں کو سونپ دیتا
مجھے کوئی مرہم دیا ہوتا
میں انہیں زخموں پر لگاتا نہ تھکتا
مجھے مسیحائی دی ہوتی
میں اپنے آپ کو وقف کر دیتا
مجھے بینائی دی ہوتی
میں شہر بھر میں تقسیم کر دیتا
مجھے حوصلہ دیا ہوتا
میں تسلی دینے کے قابل تو ہوتا
مجھے محبت دی ہے
اور
اور زیادہ کمزور کر دیا ہے

مدیحہ اصغر خان کی ڈائری سے

عشق جنوں کا راستہ، بے نشاں منزل اور جب یہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو ساغر صدیقی کی روداد محبت کچھ ان ہی کیفیات کا بیان ہے۔

روداد محبت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دن کی مسرت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنم رقصاں ہے
بیدادِ مشیت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے مے خانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب اپنی حقیقت بھی ساغر بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

سونیا رباني کی ڈائری سے

کسی کا ساتھ کس طرح سارے منظر بدل دیتا ہے گلزار کی یہ چھوٹی سی نظم پڑھ کر دیکھیے۔

تم سے جب بات نہیں ہوتی کسی دن جاناں
ایسے چپ چاپ گزرتا ہے یہ سنسان سا دن
ایک سیدھی سی بڑی لمبی سڑک پر جیسے
ساتھ چلتا ہوا روٹھا ہوا ساتھی کوئی
منہ پھلائے ہوئے ناراض سا، خاموش، اداس
اور جب ملتا ہوں، ہنس پڑتا ہے یہ روٹھا دن
گدگدا کر مجھے کہتا ہے "کہو کیسے ہو؟"

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

تحریم، عائشہ ________ گوجرہ

کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں
تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوجھتا نہیں
ہوتی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود
ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

پارس بلوچ ________ ڈہرکی

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو سنا نہ گیا

سیدہ نسبت زہرا ________ کہروڑ پکا

رسمِ سجدہ بھی اٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

سوریٹھ ساند ________ آر، وائی گاؤں

مل ہی جائے گا کبھی، دل کو یقین رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے
روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

فاطمہ علی حسن ________ کراچی

کتنا مختصر ہے یہ زندگی کا افسانہ
اک گامِ مردانہ، ایک رقصِ مستانہ

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

تمہارے ساتھ ہی موسم بھی رخ بدلنے لگے
ہوا تھمی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے
رہِ حیات میں یوں تم نے میرا ساتھ دیا
کہ جیسے چاند مسافر کے ساتھ چلنے لگے

گڑیا شاہ ________ کہروڑ پکا

کچھ دنوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
اس سے جو کچھ ہو سکیں باتیں بہت اچھی لگیں
بعد مدت اس کی دعوت پر جو اس کے گھر گیا
پھر اسی گھر میں مداراتیں بہت اچھی لگیں

یاسمین کنول ________ پسرور

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں، کون حسین رہتا ہے

حنا سلیم اعوان ________ آخون ہانڈی

تھا سفر میرا آغاز ہی سے راستہ اپنا غلط
اس کو اندازہ سفر کی رائیگانی سے ہوا

نسیم سحر ________ کراچی

میکدہ تھا، چاندنی تھی، میں نہ تھا
اک مجسم بے خودی تھی، میں نہ تھا
میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

رضوانہ شکیل راؤ ________ لودھراں

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے
سب کے سب اپنے کاندھوں سے غیروں کا سر جوڑنے میں لگے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کا خدا مختلف ہے

عظمیٰ غلام نبی ________ کراچی

لوٹ آتی ہے میری شب بھر کی عبادت خالی
جانے کس عرش پہ رہتا ہے خدا شام کے بعد

انیقہ انا ________ چکوال

اک ناتمام خواب مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

وہ جذبوں کی تجارت تھی، دل کچھ اور سمجھا تھا
اسے ہنسنے کی عادت تھی، دل کچھ اور سمجھا تھا
مجھے اس نے کہا آؤ نئی دنیا بساتے ہیں
اسے سوجھی شرارت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

آسیہ جاوید ________ علی پور چٹھہ

ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک
لڑکیوں کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
بات جیسی بے معنی بات اور کیا ہو گی
بات سے مکرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

عذرا ناصر ________ کراچی

زرد موسم کے اجالے لمحوں میں
ہم رو پڑتے یونہی ہنستے ہنستے
یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے
تھک گئیں آنکھیں خواب بنتے بنتے

نوشین اقبال نوشی ________ گاؤں بدرِ مرجان

ابھرتے ڈوبتے سورج سے توڑ لوں رشتہ
میں شام اوڑھ کے سو جاؤں اور سحر نہ کروں
اب اس سے بڑھ کے بھلا کیا ہو احتیاط وفا
میں تیرے شہر سے گزروں، تجھے خبر نہ کروں

نیلم شمشاد ________ بزمان

تمام رات نہایا تھا شہر بارش میں
وہ رنگ اتر ہی گئے جو اترنے والے تھے
اس ایک چھوٹے سے قصبے میں ریل ٹھہری نہیں
وہاں بھی چند مسافر اترنے والے تھے

رضیہ ________ میاں چنوں

دل اس قدر اداس بھی پہلے کبھی نہ تھا
غم میرا اک رفیق تو تھا زندگی نہ تھا
بکھری ہوئی تھی شہر میں چہروں کی بازگشت
جس شخص کی تلاش تھی بس اک وہی نہ تھا

نمرہ، اقراء ________ کراچی

فقیرِ عشق تھا جس کو سکندر کر دیا تو نے
تیرا حسنِ نظر، کنکر کو گوہر کر دیا تو نے
تیری گلیوں میں رہتے تھے تو اک احساس تھا گھر کا
کسی کا گھر بسا کر ہم کو بے گھر کر دیا تو نے

نسیم اسحٰق انجم ________ کنگن پور

ان کو گئے تو ایک زمانہ ہوا مگر
خوشبو ہے آج بھی میرے قرب و جوار میں

پارس بلوچ ________ ڈہرکی

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو بند کمروں کے اندر برسے

مہوش ڈوگر ________ گوجرانوالہ

وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن میں ناچتا پھرتا تھا
اب اس سے فرق نہیں پڑتا ناشاد ہوا یا شاد ہوا

شازیہ رانا ________ دیپال پور

ہر شخص ہی جیسے رخِ باطل سے ملا ہو
ایک بھی نہیں ایسا جو ہمیں دل سے ملا ہو
پھر راہ سے، راہبر سے، مسافت سے گلہ کیا
جب حکم پلٹ جانے کا منزل سے ملا ہو

انابیہ خان ________ پھلوال

ہر شام چراغوں کی طرح جلتی ہیں آنکھیں
کیا کوئی چلا جائے تو یوں ہوتا ہے محسن

سدرہ ________ عبدالحکیم

اتنا آساں بھی نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا
اترا جو سمندر میں تو دریا بہت رو دیا
جو شخص نہ رو یا تھا تپتی ہوئی راہوں میں
سایۂ دیوار میں بیٹھا تو بہت رو دیا

تحریم، عائشہ ________ گوجرہ

ملا تھا ہجر کے رستے میں صبح کی مانند
بچھڑ گیا تھا مسافر سے رات ہونے تک
میں اس کو بھولنا چاہوں تو کیا کروں آخر
وہ مجھ میں زندہ ہے میری ذات ہونے تک

مدیحہ یوسف ________ فیصل آباد

کیا خبر کون سی خوشی کے لیے
دل یونہی گنوائے جاتا ہے
رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصر
تجھے کیا رنج کھائے جاتا ہے

دُنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رہ جاتا ہے' اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو' اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کر پاتی جو فقط ایک شعر کہہ دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "ارے یہ ہی تو میرے دل میں تھا۔"

زندگی کی طویل دُھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں' بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر' کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجیے' مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے' نظم بھی اور غزل بھی۔ اس ماہ سے ہم آپ کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ "روشن حرف وہ سارے"

سوالات یہ ہیں۔

1 وہ شعر جو اکثر آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟
2 وہ شعر' نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟
3 کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟
4 وہ غزل جو آپ نے ٹی وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟
5 کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سارے

شفق چوہدری

شفق چوہدری۔۔۔ فیصل آباد

ایک شعر جو کالج لائف میں میری زبان پہ اتنا رہا کہ میری شناخت بن گیا۔ فرینڈز کی ڈائری میں جب کچھ لکھا تو اختتام یوں ہوتا تھا کہ "اور اپنے لیے (تعارف) بس اتنا ہی۔"

اے چشم فلک' اے چشم زمیں' ہم لوگ' تو پھر آنے کے نہیں
دو چار گھڑی کا سپنا ہیں' دو چار گھڑی کا خواب ہیں ہم

اور اب بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک شعر اچھا لگے تو بہت دیر تک لبوں پہ رہتا ہے' جیسا کہ آج کل

کوئی تعویذ ہو رد بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

اور ایک...

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے' کوئی ہم سا ہوگا

یوں تو پسندیدہ شعراء میں سرفہرست امجد اسلام امجد' ابن انشاء ہیں لیکن مجھ سے نئے لکھنے والوں کی نئی نظمیں ایسی ہوتی ہیں کہ ڈائری میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیتی ہیں۔ طاہر محمود کی یہ نظم ان سے تعارف کا وسیلہ بنی۔

کوئی وعدہ نہیں ہم میں
نہ آپس میں بہت باتیں

نہ ملنے میں بہت شوخی
نہ آخر شب منا جاتیں

مگر اک ان کہی سی ہے
جو ہم دونوں سمجھتے ہیں

عجب اک سرخوشی سی ہے
جو ہم دونوں سمجھتے ہیں

سارے دلربا منظر
طلسمی چاندنی راتیں

کبھی دھوپ کا موسم
یا ہلکے سکھ کی برساتیں

سب ہی اک ضد میں رہتے ہیں
مجھے پیہم یہ کہتے ہیں

محبت یوں نہیں اچھی
محبت یوں نہیں اچھی

ایسا تو کچھ نہیں تھا' ہاں! لیکن ایک دن یوں ہی ایک فرینڈ کے ساتھ چیٹنگ چل رہی تھی تو میرا ہر بات کا تفصیل سے جواب دینا تھا یا کچھ اور کہ اس کی طرف سے یہ شعر موصول ہوا۔

بہت جلدی سمجھ میں آنے لگتے ہو زمانے کی
بہت آسان ہو' دیکھو تو' تھوڑے سے دشوار ہو جاؤ

اور ایسے ہی ایک بار میری دوست نے میری ہی ڈائری سے ایک شعر پڑھتے ہوئے کہا تھا کہ جس طرح تم ہر ایک سے اپنائیت سے ملتی ہو تو ہم تمہارے ہی کیسے ہیں۔

یہ دل بہت اداس ہے جب سے خبر ہوئی
ملتے ہو تم خلوص سے' ہر آدمی کے ساتھ

اور پھر بہت عرصہ وہ اس شعر کو سنا کر میرا دل جلاتی رہی اور میں اسے سمجھاتی رہی کہ ہر کسی کی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے' کوئی بھی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اور اور... خیر چھوڑیں۔

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے' ذرا فاصلے سے ملا کرو

جی بہت سے لوگ اس بات کا احساس دلاتے ہیں' مگر ہم اکثر جانتے بھی انجان بن جاتے ہیں۔

"فیصل لطیف" کی آواز میں گائی گئی یہ غزل صرف اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی لگی۔ میں نے اسے اتنا سنا کہ بس! آپ سب بھی ایک بار ضرور سنیں' اگر ابھی تک نہیں سنی تو۔

سب محبت کا اک پہر ہے
ساحلوں پہ گھروندے بنائے تھے ہم نے
تمہیں یاد ہیں
رنگ بارش میں کیسے اڑائے تھے ہم نے
تمہیں یاد ہیں
جانے کس کے لیے گھر سجائے تھے ہم نے
تمہیں یاد ہیں
کوئی خوشبو کا جھونکا ادھر تھا نکلتا کہیں
دور ہے میلوں' صحرا میں خوابوں کا دریا کہیں
ہر خوشی آتے جاتے وقت کی لہر ہے
سب محبت کا اک پہر ہے
زندگی دھوپ چھاؤں کا ایک کھیل ہے' یہ چھٹتی نہیں
اور اسی کھیل میں دن گزرتا نہیں' رات کٹتی نہیں
پیار کرتے ہوئے آدمی کی کبھی عمر گھٹتی نہیں
دل کی دہلیز پہ لفظ روشن تیرے نام سے
رت جگے آئینوں میں کھلے ہیں کہیں شام سے
ایک دریا ہے چاروں طرف' درمیاں دوپہر ہے
سب محبت کا ایک پہر ہے

کلاسیکی شاعری میں "فیض احمد فیض" کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ "میرے درد کو جو زباں ملے" میری ڈائری میں تحریر "فیض احمد فیض" کی اعلیٰ شاعری کی ایک خوب صورت سی مثال۔

"میرے درد کو جو زباں ملے"

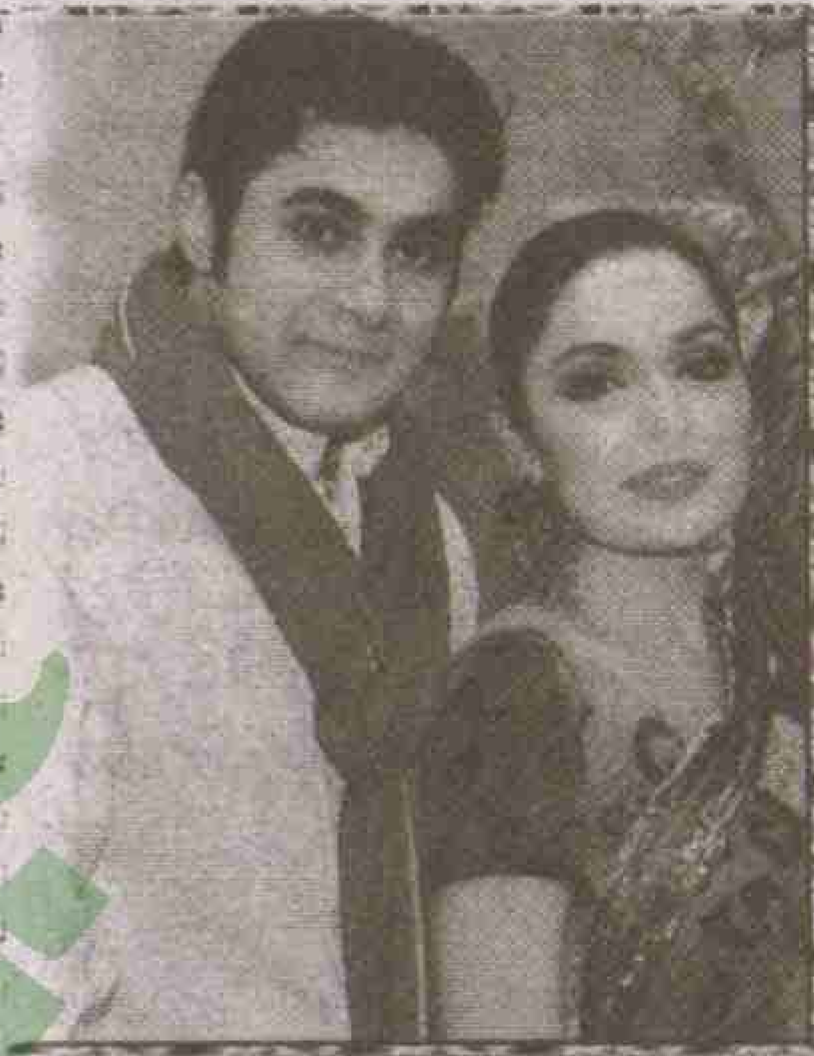
میرا درد نغمۂ بے صدا
میری ذات ذرۂ بے نشاں

میرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے

میری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے

جو مجھے یہ راز نہاں ملے
میری خامشی کو بیاں ملے

مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولت دو جہاں ملے



خبریں و بگریں

غزل توانا

میراسے شادی کے امیدوار

میرا ان دنوں نجی چینل کی مدد سے اپنے لیے "شوہر" کی تلاش میں ہیں۔ پروگرام میں جہاں میرا کے بے شمار امیدوار شرکت کر رہے ہیں، وہیں ایک امیدوار ایسا بھی ہے، جس نے پروگرام میں حصہ تو نہیں مگر وہ میرا سے شادی کا شدید خواہش مند ہے.... اور وہ ہے ذیشان سکندر۔

ذیشان سکندر خود بھی معروف اداکار ہیں۔ وہ میرا کے ساتھ فلم "تنہا" میں کام بھی کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسی فلم کے دوران میرا سے ان کا عشق عروج کو پہنچا، تب ہی تو وہ میرا سے شادی کے لیے لندن سے دوڑے چلے آئے ہیں، جہاں وہ گزشتہ پانچ سال سے حصول تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ میرا نے ابھی تک ذیشان کی پیش کش کا کوئی واضح جواب نہیں دیا ہے، لیکن انہوں نے ذیشان کے لیے پسندیدگی کا برملا اظہار ضرور کیا ہے۔

میرا ابھی ذیشان کا رشتہ قبول کر بھی کیسے سکتی ہیں.... کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو نجی چینل پر جاری ان کا پروگرام اپنے ناظرین گنوا بیٹھے گا.... اور کہیں میرا کو شادی کارڈ کے جواب میں اس چینل کی طرف سے مالی نقصان کے ہرجانے کا نوٹس وصول کرنا نہ پڑ جائے۔

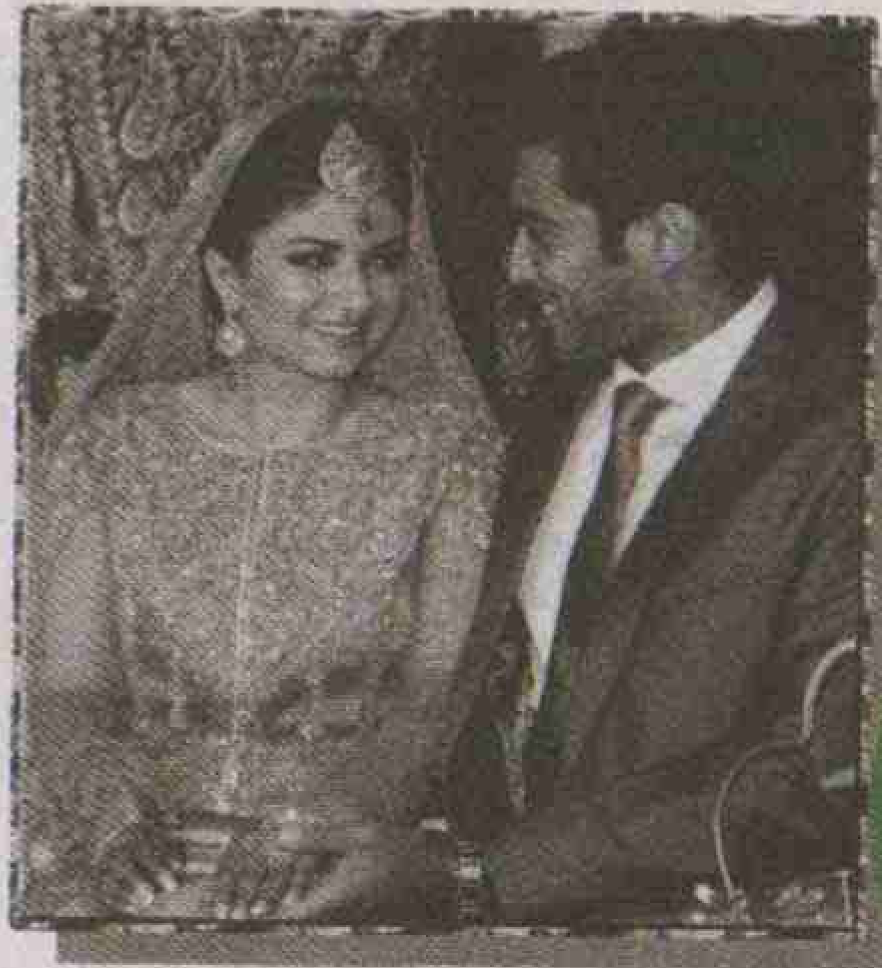
جوڑا زری کا لانا

"پشاور سے میری خاطر دنداسہ لانا" سے لازوال شہرت حاصل کرنے والے گلوکار جاوید اختر ایک طویل مدت سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ وہ آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں جاوید اختر نے خوش گوار یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ پشاور میں اسٹیج پرفارمنس دے رہے تھے۔ وہ اپنا اس وقت کا ایک مقبول عام گیت پیش کر رہے تھے، جس کے بول ہیں۔

تجھ کو قسم ہے میری، نہ آنا ہاتھ خالی
آنکھوں میں بسنے والے میرے چمن کے مالی
کہتا ہے پیار میرا، تازہ گلاب لانا
میرے واسطے صنم
تو واں کی سرزمیں سے، جوڑا زری کا لانا
لانا سجا کے ڈالی، میرے چمن کے مالی

ابھی جاوید نے گانا شروع ہی کیا تھا کہ اچانک ایک شخص اسٹیج پر چڑھ گیا۔ جاوید گھبرا گئے، مگر اس وقت جاوید کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، جب اس شخص نے "زری کے گیارہ جوڑے" جاوید اختر کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیے اور بتایا کہ وہ زری کے یہ جوڑے جاوید کے لیے بطور خاص دبئی سے لایا ہے۔ جاوید اختر اپنے پرستار کی محبت کے اس انوکھے انداز پر بے حد مسرور ہوئے۔

جاوید نے بتایا کہ وہ جوڑے انہوں نے اپنی بیٹی کو دے دیے۔ وہ جاوید اختر تھے، اس لیے سارے جوڑے بیٹی کو دے دیے، عارف لوہار ہوتے تو زری کے وہ سارے جوڑے خود ان ہی کے کام آتے۔



ٹینس اسٹار اعصام الحق کی منگنی

ٹینس کے معروف کھلاڑی اعصام الحق کی منگنی کی تقریب گزشتہ ماہ کے وسط میں انجام پائی۔ اعصام کی منگیتر فاہا اکمل صرف خوب صورت ہی نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے لندن سے اعلا تعلیم بھی حاصل کی ہوئی ہے۔ ان کے ملن کا قصہ بھی بے حد دلچسپ ہے۔ فاہا اکمل، اعصام الحق کی پرستار ہیں۔ وہ اعصام کا آٹو گراف لینے کے لیے آئیں اور آٹو گراف کے ساتھ اعصام انہیں اپنا دل بھی دے بیٹھے۔ اعصام کی پرستار فاہا اکمل کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اعصام خود ان کے پرستار ہو جائیں گے۔ وہ ٹینس کے میدان میں فتوحات کے جھنڈے گاڑنے والے اس عظیم کھلاڑی کو جیتنے پر بے حد خوش ہیں۔ چندے آفتاب اعصام الحق کو چندے ماہتاب فاہا اکمل کا ساتھ ملنے پر ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

لیڈیز پینٹ

نثار بٹ ملک کے معروف کامیڈین ہیں۔ منہ سے مختلف سازوں کی آوازیں نکالنے کا فن انہیں دنیائے کامیڈی میں ایک خاص انفرادیت عطا کرتا ہے۔ نثار بٹ بتاتے ہیں کہ کامیڈی کا فن انہوں نے اپنی والدہ سے سیکھا۔ جب نثار سے ملنے کوئی شخص گھر میں آتا تو ان کی والدہ اس شخص کا حلیہ اور وضع قطع نہایت پرلطف انداز میں بیان کرتی تھیں۔ والدہ کے اسی انداز نے نثار بٹ کو کامیڈی کی طرف مائل کیا۔

1977ء میں نثار کو "منور ظریف شو" میں پرفارم کرنے کا موقع ملا۔ نثار اس شو کے لیے بے حد پُرجوش تھے، کیونکہ یہ ان کا پہلا شو تھا۔ اس شو کے لیے انہوں نے لنڈا سے پینٹ (پتلون) خریدی اور شو میں پہن کر چلے گئے۔ شو میں ان کی پرفارمنس تو بے حد زبردست رہی، مگر اس پتلون نے انہیں بہت تنگ کیا۔ نثار نے زندگی میں پہلی مرتبہ پتلون پہنی تھی۔ لہٰذا وہ سمجھے شاید یہ اسی لیے پریشان کر رہی ہے، مگر لوگوں نے انہیں بتایا کہ یہ تو "لیڈیز پینٹ" ہے۔ نثار کو معلوم نہیں تھا کہ مردانہ اور زنانہ پتلونوں میں فرق ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے زنانہ پتلون خرید لی تھی۔ لوگوں کے توجہ دلانے پر بعد میں وہ دکان پر پینٹ واپس کرنے گئے، مگر دکان دار نے پینٹ واپس لینے سے انکار کر دیا۔ وہ پینٹ آج بھی نثار کے پاس محفوظ ہے۔

ایک اور چربہ

ریما کی فلم "لو میں گم" کی نمائش عید پر متوقع ہے۔ ٹی وی پر ان دنوں اس فلم کی تشہیری مہم کے لیے ایک گانا چلایا جا رہا ہے، جس میں آپ معروف فنکاروں کی ایک "کھیپ" کو پرفارم کرتا دیکھ رہے ہیں۔ اس گانے میں ندیم، جاوید شیخ، معمر رانا، ریشو، صاحبہ، میرا، ریما اور



...شم ماضی کے سارے اختلافات بھلا کر شیر و شکر نظر ...رہے ہیں۔

...وطن عزیز میں شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی ...نے کے خواب کو آج تک کوئی حکمراں شرمندہ تعبیر نہ ...کر سکا، مگر ریشم اور میرا کی ایک گھاٹ پر پرفارمنس کا ...سہرا بلاشبہ ریما کے سر ہے۔ ریما جی! جہاں اس ...پراجیکٹ پر اتنی محنت کی، وہیں تھوڑی سی توجہ گانے ...کی دھن بنوانے پر بھی دے لی ہوتی کہ لوگوں کا حافظہ ...اتنا بھی خراب نہیں ہو گیا کہ حد ہو چکا ہے۔ وہ پڑوسی ملک کے مشہور گانے "دھتنگ ...دھتنگ" کو ابھی بھولے نہیں ہیں۔

یہ بیان کا لمانہ

...پاکستان بطور خاص کراچی کے ایک دو نہیں، ...سینکڑوں سرمایہ کار اور صنعت کار اپنا سرمایہ سمیٹ کر ...بنگلہ دیش منتقل ہو گئے ہیں۔ کراچی سے سرمائے کی ...منتقلی کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ بنگلہ دیش ...میں نہ اغوا برائے تاوان کو کاروبار کا درجہ حاصل ہے، ...نہ بھتہ مافیا سرگرم ہے اور نہ دہشت گردی کی فصل ...لہلہاتی ہے۔

(زاہدہ حنا... نرم گرم)

...پرویز مشرف کو وردی اتارنے کے تیس لاکھ اور ...پنشن کی مد میں ہر ماہ 50 ہزار روپے ادا کیے جاتے ہیں۔ ریٹائر ہونے پر پاکستان میں پرویز مشرف کی جائیداد کا تخمینہ ایک ارب تک لگایا گیا ہے۔

(اسد مفتی... ایمسٹرڈیم، ہالینڈ)

دنیا کے 48 ممالک کی افواج، نہ کوئی مددگار، پڑوس کے مسلمان بھائی بھی بے غیرتوں کی طرح دشمن کے ساتھی۔ ایسے میں کون تھا جس نے بے یار و مددگار طالبان کو یہ نصرت بخشی کہ امریکہ وہاں سے آسانی کے ساتھ کم سے کم جانی نقصان کی ضمانت کے لیے بدنام دہشت گرد طالبان سے مذاکرات کر رہا ہے۔

(اوریا مقبول جان... حرف راز)

مضر صحت

بچے کی مسکراہٹ سخت سے سخت دل انسان کی توجہ حاصل کر لیتی ہے اور اگر وہ بیمار ہو جائیں تو سب کے دل اداس ہو جاتے ہیں۔ عموماً مائیں بخار میں بچوں کو پیراسیٹامول سیرپ پلاتی ہیں۔ حالیہ تحقیق نے اس کے استعمال کو خطرناک قرار دیتے ہوئے مضر صحت قرار دیا ہے۔ ماہرین کی رائے میں بچوں میں ابتدائی 15 ماہ میں کالپول یا پیراسیٹامول سیرپ کے غیر ضروری استعمال سے مختلف قسم کی الرجی اور دمے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ وہ مائیں جو معمولی بخار یا درد میں یہ ادویات بچوں کو پلاتی ہیں اس سے دمے اور الرجی کے امکانات 90 فیصد تک بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے سینے سے سیٹی جیسی آوازوں کے علاوہ دمہ کی دیگر علامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اگرچہ پیراسیٹامول کے فوائد اس کے نقصانات سے زائد ہیں اس لیے صرف ضرورت کے وقت ہی اس کا استعمال کیا جائے۔





رمضان کے پکوان

خالدہ جیلانی

ماہ رمضان کی بابرکت ساعتیں جاری و ساری ہیں۔ یہ ماہ تزکیہ نفس کے لیے بہترین ہے۔ روزہ کو جسم کی زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ تاہم مشاہدہ ہے کہ اسی ماہ ہم اپنے جسم میں "خوراک کی ذخیرہ اندوزی" دیگر مہینوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی کر لیتے ہیں۔ یوں ہم اس ماہ کے اجر و فیوض سے خود کو کسی حد تک دور بھی کر لیتے ہیں۔ اور روزوں کے طبی و روحانی فوائد سے محروم بھی رہتے ہیں، تو پیاری بہنو! کھائیں سب کچھ مگر اعتدال کے ساتھ۔

مونگ کی دال کے سموسے

اجزا :

تلی ہوئی مونگ	1 پاؤ
سموسے کی پٹیاں	2 درجن
پودینہ	1/2 گڈی
ہرا دھنیا	1/2 گڈی
پیاز (بڑی)	1 عدد
سویا	1 گڈی
لیموں	2 عدد
انڈے (سفیدی)	2 عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

ایک بڑے پیالے میں تلی ہوئی مونگ کی دال کے ساتھ تمام اشیاء ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تقریباً 15 منٹ بعد آمیزے کو سموسے کی پٹیوں میں بھریں اور کناروں کو انڈے کی سفیدی لگا کر اچھی طرح بند کریں۔

کڑاہی یا فرائی پان میں سنہرا ہونے تک تلیں۔
انار دانے اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

لیموں کا شربت

اجزا :

لیموں	1/2 کلو
چینی	4 کپ

ترکیب :

لیموں کا رس نکال لیں۔ بیج نکال کر پھینک دیں۔ ایک پتیلی میں چینی ڈال کر ایک کپ پانی ملائیں اور پکا کر شیرہ تیار کرلیں۔ چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ لیموں کا رس شامل کریں۔ مکمل طور پر ٹھنڈا ہوجائے تو ایک صاف بوتل میں بھر کر فریج میں رکھ لیں۔ پیش کرتے وقت ایک گلاس میں برف اور دو یا تین چمچے تیار کیے ہوئے شربت کے ڈالیں اور ٹھنڈا پانی شامل کرلیں۔ افطار کے وقت فوری تیار کیا جانے والا فرحت بخش مشروب ہے۔

آلو دہی

اجزا :

آلو	1 کلو
پیاز بڑی	2 عدد
ادرک لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
ثابت دھنیا	1 چائے کا چمچہ
پسا ہوا زیرہ	1 چائے کا چمچہ
سرخ پسی مرچ	1 چائے کا چمچہ
ہلدی	1/2 چائے کا چمچہ
رائی	1/2 چائے کا چمچہ
کڑی پتہ	چند عدد
ہرا دھنیا	1/4 گڈی
دہی	1/2 پیالی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1/2 پیالی

ترکیب :

آلو چھیل کر موٹے موٹے گول قتلے کاٹ لیں۔ پیاز، زیرہ، لہسن ادرک کا پیسٹ، ہلدی، پسی مرچ کو 1/3 کپ پانی میں باریک پیس لیں۔ دہی کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ آلو ابال لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں رائی کڑکڑائیں۔ اب اس میں کڑی پتہ ڈال کر 2 منٹ فرائی کریں پھر اس میں باریک پسا ہوا آمیزہ ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بعد دہی ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ نمک اور آلو ڈال کر 10 منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ پھر گرم گرم پیش کریں۔

توری کے چھلکوں کے کباب

اجزا :

توری کے چھلکے	1 پاؤ
ابلی ہوئی چنے کی دال	1 کپ
لہسن ادرک کا پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
پیاز (چوپ کی ہوئی)	2 عدد
گرم مسالہ	1/2 چائے کا چمچہ
ڈبل روٹی کا چورا	1/2 کپ
ہری مرچ	4 عدد
دھنیا، پودینہ	1 کپ
کٹی سرخ مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
انڈا	1 عدد
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

توری کے چھلکے اور ابلی ہوئی چنے کی دال، لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر بغیر پانی کے اتنا پکائیں کہ چھلکے نرم ہوجائیں اور پانی خشک ہوجائے۔ پھر چوپر میں یا سل پر پیس لیں۔ پیاز، گرم مسالا، ڈبل روٹی کا چورا اور باقی تمام اجزا ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور 1/2 گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔



شامی کباب کی طرح ان کو بھی شیپ دیں۔ فرائی پان میں تیل گرم کرکے درمیانی آنچ پر تل لیں۔
افطار کے وقت چٹنی کے ساتھ پیش کریں یا سحری میں چپاتی کے ساتھ تناول فرمائیں۔

مال پورہ

اجزا:

میدہ	1 کپ
چینی	2 کھانے کے چمچے
انڈا	1 عدد
دودھ	3/4 کپ
مکھن	2 کھانے کے چمچے
شہد	حسب پسند

ترکیب:

ایک بڑے پیالے میں میدہ اور چینی ڈالیں۔ چھوٹے پیالے میں انڈا اور دودھ ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں پھر میدے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔

ایک فرائی پان میں تھوڑا سا مکھن ڈال کر گرم کریں۔ تھوڑا سا آمیزہ ڈال کر پکائیں (آملیٹ کی طرح) 2 منٹ بعد پلٹ دیں اور دوسری طرف بھی 2 منٹ کے لیے پکائیں پھر اتار لیں۔ اسی طرح تمام آمیزے کے پین کیک بنالیں۔ ایک کے اوپر ایک پین کیک رکھ کر اس پر شہد ڈال دیں۔
افطار پر منفرد ڈش بنا کر سب کا دل جیت لیں۔

چکن، پنیر اور آلو کا آملیٹ

اجزا:

آلو (اُبلا ہوا)	1 عدد
چکن (اُبلا ہوا)	2 چھٹانک
انڈے	4 عدد
پسی سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
مکھن	2 کھانے کے چمچے

آلو کو 1/2 انچ کیوبز کی شکل میں (چوکور) کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں انڈے ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں اور نمک اور پسی ہوئی سیاہ مرچ بھی ڈال دیں۔

فرائی پان میں مکھن ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم کریں۔ ابلا ہوا چکن ریشے کر کے اس میں ڈال کر 5 منٹ تک پکائیں۔ آلو شامل کر کے مزید 5 منٹ تک پکائیں۔ اب اس فرائی پان میں انڈے کا آمیزہ ڈال دیں۔ دھیمی آنچ پر 10 منٹ تک پکائیں۔ جم جائے تو پنیر چھڑک کر 2 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پنیر پگھل جائے تو سمجھیں پنیر آلو آملیٹ کھانے کے لیے تیار ہے۔

جودھ پوری کچوری

اجزا:

میدہ	2 کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے
چنے کی دال	1 کپ
پیاز	2 عدد
ثابت دھنیا	1 چائے کا چمچہ
ادرک	1 کھانے کا چمچہ
سونف	1 چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	1 چائے کا چمچہ

میدے میں ایک کھانے کا چمچہ تیل اور نمک ملا کر سخت آٹا گوندھ لیں۔ چنے کی دال کو 5 سے 6 گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر پیس کر ایک گاڑھا سا پیسٹ بنالیں۔ پیاز، کوٹا ہوا ثابت دھنیا، باریک کٹی ہوئی ادرک اور دیگر اجزا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ نمک نہ ڈالیں۔

گندھے ہوئے آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنالیں۔ انہیں کھوکھلا کر کے اس میں چنے کی دال کا آمیزہ بھر دیں۔ پوری کی شکل میں بیل لیں اور ہلکی آنچ پر گہرے تیل میں تل لیں۔ براؤن ہونے پر اتار لیں۔ دہی کی چٹنی کے ساتھ افطار پر پیش کریں۔

نفسیاتی الجھنیں

عدنانہ

مطالعے کے دوران مجھے گلیمن کی بات بہت اچھی لگی۔ میں نے اس پر غور کیا اور کرتا ہی چلا گیا۔
"نرم اور صلح کن الفاظ نہایت طاقت ور ہوتے ہیں۔"
آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے ڈیل کارنیگی کی کتاب ہاؤ ٹو ون فرینڈز اینڈ انفلوئنس پیپلز کا ترجمہ نظر سے گزرا۔ کتاب کا نام بہت خوب صورت تھا۔
"میٹھے بول میں جادو ہے۔"
میں سمجھتا ہوں اور آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے کہ بری، کڑوی اور سخت بات کو بھی نرم لہجے میں کہا جائے اور صلح کن رویہ اختیار کیا جائے تو آپ اعصابی کھچاؤ کے علاوہ ذہنی اذیت، کوفت سے بچ سکتے ہیں۔ آپ کا بلڈ پریشر نہیں بڑھے گا۔ آپ کے غصے کے اثرات سے آپ کا دل محفوظ رہے گا۔ آپ کی زندگی آرام سے گزرنے کے ساتھ ساتھ لمبی بھی ہو جائے گی۔
یہی مشورہ میں نے اپنے ایک جاننے والے کو دیا جو ایک ادارے کے سربراہ ہیں۔ وہ اکثر ٹینشن اور اعصابی کھچاؤ کا شکار رہتے تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں پر بری طرح ناراض ہوتے تھے، گرجتے، برستے تھے اور نتیجہ یہ کہ ان کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا تھا اور دل پر ایک بوجھ سا آپڑتا تھا۔ بھوک مر جاتی تھی پھر خود کو نارمل کرنے کے لیے سکون آور گولیاں استعمال کرتے تھے۔
خوش اخلاقی، ضبط و تحمل، ایثار، بے لوث خدمت، مقصد کی سچی لگن، یہ ایسے اوصاف ہیں۔ جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں اور ذہنی سکون، قلبی اطمینان کا باعث بنتے ہیں اور کامیابی کا راستہ ہیں۔



کم ہمتی، تنک مزاجی، غصہ، خوف اور شکستہ دلی بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہے۔ ان میں غصہ اور تنک مزاجی زیادہ ڈپریشن کے زمرے میں نہیں آتے۔ لیکن پھر بھی بعض دوسری باتیں مل کر یعنی اپنی کم ہمتی کی وجہ سے زبردستی کا غصہ، بات بات پر تلخی اور تنک مزاجی کو بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہی سمجھنا چاہیے۔ اس سے نجات حاصل کرنا قطعی طور پر آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ارادے باندھنا، ہمت کرنا اور اس پر عمل کرنا ڈپریشن کو شکست دینا ہے اور ایک واضح شکست دینے کا مطلب ہے کہ آپ نے ڈپریشن پر فتح حاصل کر لی اور اپنی زندگی کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کر لیا۔
ڈپریشن سے نجات کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خود کو مصروف رکھیں۔ دوسروں میں دلچسپی لیں۔ ان سے محبت کریں، محبت کرنے والے لوگوں کو اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ دوسروں کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں تلاش کرتے ہیں۔ اور ان کے دل ہمیشہ سچی خوشی سے سرشار رہتے ہیں۔

ص۔ ا..... لاہور

ان بہن نے لکھا ہے، میں اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی کسی سے شیئر نہیں کرتی چاہے وہ خوشی کی ہو یا غم کی آپ واحد ہیں جن سے اتنی بڑی بات شیئر کی ہے۔ آپ نے جواب دے دیا تو تسلی ہو گئی۔ اب دل کرتا ہے اپنی ہر الجھن آپ سے شیئر کرلوں اگر میں خط لکھوں تو آپ تنگ تو نہیں ہوں گے؟

اچھی بہن! بھائی کبھی بہنوں سے تنگ نہیں ہوتے۔ آپ پورے اطمینان سے خط لکھ سکتی ہیں۔ جس افسانے کا آپ نے ذکر کیا، وہ میں نے پڑھا ہے۔ لیکن آپ شاید سمجھ نہیں سکیں۔ وہ یکسر مختلف بات تھی۔ آپ کا مسئلہ اس سے مختلف ہے اس کالم میں وضاحت ممکن نہیں ہے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے مسئلے میں غالب یہی ہے کہ خرابی واقع نہیں ہوگی۔

آپ بے فکر ہو جائیں اور اچھی اچھی باتیں سوچیں۔ سارے خوف دل سے نکال دیں۔ اللہ پر بھروسا کیا ہے تو کس بات کا خوف؟ ان شاء اللہ آپ کے ساتھ اچھا ہی ہوگا۔

ر

اچھی بہن آپ نے جو حالات لکھے ہیں۔ میں تو آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ ایک نیک، مخلص شوہر پانا خوش نصیبی ہی تو ہے۔ حالات ایسے ہو گئے کہ آپ کے شوہر کو دوسری شادی کرنا پڑی تب بھی یہ بڑی بات ہے کہ اس نے آپ کو نظرانداز نہیں کیا۔ جو آپ کے دل میں احساسات اور خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ قدرتی ہیں۔ کسی بھی عورت کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن یہ بھی سوچیں کہ آپ کے شوہر نے جو بھی کیا گھر اور بچوں کے لیے کیا۔ بہت سی خواتین کے شوہر بلا کسی وجہ کے دوسری شادی کر لیتے ہیں اور ان پر بالکل توجہ نہیں دیتے، پھر بھی وہ اولاد کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی ہیں۔ دل میں جب بھی اس طرح کے جذبات پیدا ہوں آپ تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں، آپ کے بچوں کی صحیح دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ آپ کے میاں آپ کا خیال رکھتے ہیں اور نئی آنے والی بھی بہت اچھی ہے۔ آپ نے لکھا آپ اس کے ساتھ اچھی ہیں تو اس وجہ سے وہ بھی اچھی ہے۔

ایک بات یاد رکھیں اگر آپ کسی کے ساتھ اچھی ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ بھی آپ کے ساتھ اچھا ہو، بد فطرت لوگ اچھائی کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں اس لیے اس کی اچھائی کی قدر کریں۔

ت

س: میرا تعلق گاؤں سے ہے میں شہر میں پڑھتی ہوں شروع سے محتاط رہی اور کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے والدین کا سر جھکے لیکن ایک کلاس فیلو سے اکثر بات چیت ہوتی تھی۔ اس نے پرپوز کیا۔ میں نے انکار کر دیا لیکن آہستہ آہستہ میں متاثر ہو گئی۔ ہماری اکثر فون پر بات ہوتی ہے لیکن میں ذہنی کشمکش کا شکار ہو گئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی والدین کا سر جھکے دوسری طرف اس لڑکے کو نہیں بھول پا رہی اب پڑھائی میں بھی دل نہیں لگتا۔

ج: صنف مخالف میں اللہ تعالیٰ نے کشش رکھی ہے دوستی یا بات چیت ہوتی ہے تو لازماً ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے مذہب میں نامحرم سے فاصلہ رکھنے کو کہا گیا ہے اور بلا ضرورت بات چیت سے منع کیا گیا ہے۔

فی الحال اس بارے میں سوچنا۔ قبل از وقت اور بے وقوفی ہے۔ اس لڑکے کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزگار کے مسائل ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں پتا کہ اس کے گھر والے راضی ہوں گے یا نہیں۔ آپ نے اپنے گھر والوں اور اپنی خاندانی روایات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا پتا نہیں آپ کے گھر والوں کا فیصلہ کیا ہوگا۔

آپ اپنی تعلیم یکسوئی سے مکمل کریں، وقت آنے پر ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی کچی عمر کے فیصلے کچے ہوتے ہیں۔ خیالات میں تبدیلی بھی آ سکتی ہے۔

سعیدہ عبدالغنی..... احمد پور شرقیہ

س: میرے اوپر والے لب پر بال ہیں۔ میں انہیں موچنے سے نکالتی ہوں لیکن پوری طرح نکل نہیں پاتے ہیں۔ کیا ان بالوں سے ہمیشہ کے لیے نجات ممکن ہے۔ میں نے سنا ہے کہ لیزر سے بال ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں اور دوبارہ نہیں نکلتے ہیں۔ کیا میں یہ علاج کرالوں اس سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔

ج: اگر آپ کے بالوں کی رنگت گہری سیاہ ہے اور وہ آپ کے چہرے پر نمایاں نظر آتے ہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ انہیں بلیچ کر لیں اس طرح وہ آپ کی جلد کے ہم رنگ ہو جائیں اور نمایاں نہیں ہوں گے۔

دوسرا طریقہ تھریڈنگ کا ہے۔ اس سے بال کچھ دنوں کے لیے غائب ہو سکتے ہیں لیکن مستقل نہیں۔ آپ کو پندرہ دن میں ایک بار تھریڈنگ کا عمل لازمی کرنا ہوگا۔

لیزر ٹریٹمنٹ کی سہولت چھوٹے شہروں میں مہیا نہیں ہے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے بال کافی نمایاں اور موٹے ہوں۔ اس میں کوئی قباحت تو نہیں؟ یہ آپ کو لیزر ٹریٹمنٹ کا ماہر ہی بتا سکتا ہے۔

شائستہ جبیں..... لاہور

س: ہمیشہ برسات کے موسم میں میرے چہرے اور بالوں پر بہت خراب اثرات ہوتے ہیں۔ چہرے پر کیل مہاسے نکلنے لگتے ہیں اور بال بھی خشک اور بے رونق نظر آتے ہیں۔ چہرے پر تیل نمایاں ہو جاتا ہے۔ بال چپکنے بھی لگتے ہیں۔

ج۔ بالوں کو بے رونقی سے بچانے کے لیے آپ مہندی سے تیار شدہ ماسک استعمال کریں۔

مہندی	آدھا کپ
لیموں کا رس	چار چائے کے چمچے
انڈے	دو عدد
چائے کا چھنا ہوا پانی	دو چمچ

رمشا مسعود

بیوٹی بکس

چائے کا چھنا ہوا پانی لے کر آدھا کپ مہندی کے پاؤڈر میں ملائیں اور اس میں لیموں کا رس اور انڈے بھی اچھی طرح پھینٹ کر ملالیں۔ اب اس ماسک کو سر پر اس طرح لگائیں کہ پورا سر اس سے ڈھک جائے خشک ہونے پر سادہ صاف پانی سے سر دھولیں۔ بالوں میں شیمپو سر پانی سے دھونے کے دو گھنٹے بعد لگائیں۔ اس سے رنگ زیادہ اچھا آئے گا۔

بالوں کی خوب صورتی اور چمک دیکھ کر آپ خود حیران رہ جائیں گی۔

کیل مہاسوں سے بچنے اور چہرے کو دلکش بنانے کے لیے آپ روزانہ صبح اپنا منہ دھونے سے پہلے ایک چائے کا چمچہ لیموں کے رس میں ایک چائے کا چمچہ عرق گلاب ملائیں پھر روئی کے پھوہے کی مدد سے اس مرکب کو اپنے چہرے اور گردن پر لگائیں۔ 20 منٹ تک لگا رہنے دیں۔

پھر ٹھنڈے صاف پانی سے چہرہ اچھی طرح دھولیں جلد اچھی طرح صاف ہو جائے گی اور کیل مہاسوں سے محفوظ رہے گی۔

لیکن ایک بات ضرور ذہن میں رکھیں جلد کی اصل خوب صورتی تو اندرونی طور پر ہوتی ہے جو صحت بخش غذاؤں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی غذا کا خاص خیال رکھیں اور ایسی غذائیں استعمال کریں جن میں وٹامن پائے جاتے ہوں۔ مرغن اور دیر ہضم غذاؤں سے پرہیز کریں۔





Chicken Cubes

Recipe Card

رِدا آفتاب کی ڈبل تڑکا دال

اجزاء:

ماش کی دال .... ½ پاؤ

چنے کی دال .... ½ پاؤ

پیاز .... 1 عدد

ٹماٹر .... 6 عدد

نمک .... 1 چائے کا چمچہ

ہلدی .... 1 چائے کا چمچہ

پسی لال مرچ .... 2 چائے کے چمچے

ادرک لہسن کا پیسٹ .... 2 چائے کے چمچے

تیل .... 4 کھانے کے چمچے

کنور چکن کیوب .... 1 عدد

تڑکا بنانے کے اجزاء:

لہسن کے جوے .... 6 عدد

کڑی پتے .... 6 عدد

ثابت گول مرچ .... 6 عدد

ہری مرچ .... 6 عدد

باریک کٹی ادرک .... 1 ٹکڑا

ہرا دھنیا .... ½ گٹھی

مکھن .... 100 گرام

زیرہ .... 1 چائے کا چمچہ

ترکیب:

پہلے ½ پاؤ ماش کی دال اور ½ پاؤ چنے کی دال کو ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ اب پتیلی میں 4 کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے 1 عدد پیاز براؤن کریں۔ پھر اس میں 6 عدد ٹماٹر، 1 عدد کنور چکن کیوب، 2 چائے کے چمچے پسی لال مرچ، 1 چائے کا چمچہ نمک، 1 چائے کا چمچہ ہلدی اور 2 چائے کے چمچے ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے مصالحہ بھون لیں۔

اب اس میں بھیگی ہوئی دالیں اور تین گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر آدھے گھنٹے پکنے دیں۔ دالیں گلنے کے بعد انہیں اچھی طرح گھوٹیں اور چولہا بند کر دیں۔ اب ایک پین میں 100 گرام مکھن کو گرم کر کے 1 چائے کا چمچہ زیرہ، 6 عدد لہسن کے جوے، 6 عدد کڑی پتے اور 6 عدد ثابت گول مرچ ڈال کر فرائی کریں اور تیار دال پر تڑکا لگائیں۔ آخر میں اوپر سے ½ گٹھی ہرا دھنیا، 6 عدد ہری مرچ اور 1 ٹکڑا باریک کٹی ادرک ڈال کر سرو کریں۔



(Rida Aftab)

